بھارت کے
فرعون
را کی سازش
اے حمید
50

میں نے یہ سوچا ہی نہیں تھا کہ ایٹمی مرکز کے جنریٹرز کنوئیں والا ڈھکنا اوپر سے بند ہو سکتا ہے۔ میرا خیال تھا کہ کنوئیں کا منہ کھلا ہو گا جس طرح کہ میں نے ایک روز پہلے دیکھا تھا اور میں آسانی سے باہر نکل جاؤں گا۔ لیکن کنوئیں کا منہ لوہے کے ڈھکن سے بند تھا۔ میں کنوئیں کی دیوار کے ساتھ لگی لوہے کی سیڑھی پر کھڑا سوچنے لگا کہ اگر ڈھکن نہ کھلا تو میرا بچنا ناممکن ہے۔ میں نے ایٹمی بھٹی میں جو چاروں ٹائم بم لگائے تھے انہیں ایک گھنٹے بعد پھٹنا تھا۔ اور اس سارے ایٹمی سنٹر اور ریت کے ٹیلوں کے ساتھ مجھے بھی اڑ جانا تھا۔ مجھے اپنی موت کا کوئی خوف نہیں تھا۔ لیکن میں اس طرح اپنی زندگی کو ضائع ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

میں نے پاؤں لوہے کی سیڑھی پر جمائے اور دونوں ہاتھوں سے پوری طاقت سے زور لگا کر ڈھکن کو اٹھانے کی کوشش کی۔ دو تین بار کوشش کرنے سے ڈھکن ذرا سا اپنی جگہ سے ہلا۔ جس طرف سے میں زور لگا رہا تھا اسی طرف سے ڈھکن اوپر اٹھ گیا۔ مجھ پر ریت گری۔ ان لوگوں نے کنوئیں کے اوپر ڈھکن دے کر اوپر سے ریت ڈال دی تھی تاکہ کسی کو پتہ نہ چلے کہ اس کے نیچے ایٹمی سنٹر کے جنریٹر چل رہے ہیں۔ جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں بھارت کا یہ خفیہ ایٹمی سنٹر راجستھان میں رام گڑھ قصبے سے تھوڑی دور ویران ٹیلوں کے درمیان زیر زمین بنایا گیا تھا۔ اوپر دو تین کمرے بنا دیئے گئے تھے جس کے باہر

منرل ریسرچ سنٹر یعنی معدنیات کی تحقیق کا مرکز کے نام کا بورڈ لگایا ہوا تھا۔ حقیقت میں اس عمارت کے نیچے ایٹمی ریسرچ سنٹر تھا جہاں بھارتی حکومت نے ایٹمی صلاحیت حاصل کرنے اور ایٹمی میزائل کی تیاریوں کے سلسلے میں پلوٹونیم کو صاف کرنے کا پلانٹ لگایا ہوا تھا۔ یہ ساری تیاریاں پاکستان کے خلاف اور پاکستان کے شہروں پر جنگ کے وقت ایٹمی حملہ کرنے کے سلسلے میں ہو رہی تھیں ۔ میں نے سکھ کا بہروپ دھار کر جسونت سنگھ سوڈھی کے نام سے ریواڑی کی ایک طوائف کی سفارش سے ایٹمی سنٹر میں نوکری حاصل کر لی تھی اور اب ایٹمی بھٹی میں چار ٹائم بم لگا کر اس میں لگی ہوئی ٹائم ڈیوائس کا بٹن دبا کر آدھی رات کے وقت ایٹمی جنریٹرز روم کے کنوئیں میں سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے یہ بم آدھی رات کے وقت ایٹمی سنٹر کے اندر ہی رہ کر لگائے تھے اور اس کے صدر گیٹ سے باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ ایسا کرنے سے میں گرفتار کیا جا سکتا تھا۔

پانچ سات منٹ کی زبردست کوشش سے میں نے کنوئیں کے اوپر پڑے ہوئے ڈھکن کو اتنا اوپر اٹھا دیا کہ میں اس میں سے باہر نکل سکتا تھا۔ میں رینگ کر کنوئیں سے باہر آ گیا۔ یہ کنواں ایسا ہی تھا جیسا کہ ٹیوب ویل کا کنواں ہوتا ہے۔ ٹیوب ویل کے کنواں کے اوپر تو گول کمرہ سا بنا ہوتا ہے جب کہ اس ایٹمی سنٹر کے جنریٹر روم کے کنوئیں کو اوپر سے ڈھک دیا گیا تھا۔ کیونکہ بھارتی حکومت اسے لوگوں سے خفیہ رکھنا چاہتی تھی۔ باہر نکلتے ہی میں ایک طرف چل پڑا۔ یہ صحرا کا علاقہ تھا۔ آسمان پر تارے نکلے ہوئے تھے۔ جن کی مدھم اور دھندلی روشنی میں مجھے دور دور تک پھیلے ہوئے راجستھان کے صحرائی ٹیلے نظر آ رہے تھے۔ ایٹمی سنٹر کی زیر زمین عمارت ریت کے دو ٹیلوں کے درمیان تھی۔ ان ٹیلوں کی ریت کافی سخت ہو چکی تھی۔ میں جس ریت پر چل رہا تھا وہ بھی زیادہ بھربھری نہیں تھی۔ مجھے سمت کا کوئی اندازہ نہیں تھا میں نے آسمان کے ستاروں کو غور سے دیکھا۔ میں سمت کا تعین نہ کر سکا۔ ایک تو رات کا وقت تھا۔ دوسرے اردگرد ریت ہی ریت تھی۔ چھوٹے بڑے ٹیلے تھے میں ان ٹیلوں میں داخل ہو کر ان کی بھول بھلیوں سے پھنسنے سے بچنا چاہتا تھا۔

میں جتنا اندازہ لگا سکتا تھا اتنا اندازہ لگا کر ریت کے ٹیلوں میں جانے کی بجائے ان سے بچ کر دائیں جانب ہو گیا۔ مجھے یقین تھا کہ اس طرح میرا رخ مشرق کی طرف ہو گیا ہے اور کچھ دیر تک چلنے کے بعد راج گڑھ کا قصبہ آ جائے گا جہاں ایٹمی سنٹر میں کام کرنے والے سائنس دانوں اور عملے کے دوسرے آدمیوں اور خود میرا بھی کوارٹر تھا۔ میں بالکل سکھ بنا ہوا تھا۔ سر پر پگڑی تھی۔ قمیض پتلون پہنی ہوئی تھی۔ کمر میں کرپان لٹک رہی تھی اور سکھوں والی مونچھیں اور ڈاڑھی تھی۔ ایک بازو کی کلائی میں لوہے کا کڑا بھی تھا۔

میں نے رک کر کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پر وقت دیکھا چاروں بموں کے پھٹنے میں پینتالیس منٹ رہ گئے تھے۔ میں اس علاقے سے جتنی دور ہو سکے نکل جانا چاہتا تھا۔ میں نے جوگنگ کرنے والوں کی طرح دوڑنا شروع کر دیا۔ زمین سخت تھی اور اس کے اوپر ریت کی پتلی سی تہہ بکھری ہوئی تھی جس کی وجہ سے مجھے دوڑنے میں آسانی ہو رہی تھی۔ پروفیسر جمشید نے کہا تھا کہ اگر ایٹمی فرنس میں ایک .ٹہ دس گرام بھی افزودہ پلوٹونیم ہوا تو اس کے پھٹنے سے اردگرد کم از کم تین میل تک کسی چیز کا نام و نشان باقی نہیں رہے گا اور ریت کے جن ٹیلوں کے نیچے ایٹمی سنٹر قائم ہے اس کی ریت پگھل کر بھاپ بن کر اڑ جائے گی۔ اس لئے میں اس علاقے سے کم از کم چار پانچ کلومیٹر دور نکل جانا چاہتا تھا۔ دوڑنے کی مجھے ٹریننگ کے دوران کافی مشق ہو چکی تھی میں پندرہ پندرہ میل کا چکر لگاتا رہا تھا۔ ایک جگہ میں نے مڑ کر دیکھا۔ ایٹمی سنٹر کے ریت کے ٹیلے کافی پیچھے رہ گئے تھے اور رات کی تاریکی میں ان کے دھندلے خاکے نظر آ رہے تھے۔ میں نے اپنی رفتار ذرا تیز کر دی۔

میں جب کافی دور نکل گیا تو مجھے خیال آیا کہ اس وقت تک تو مجھے راج گڑھ کے کوارٹروں میں پہنچ جانا چاہئے تھا۔ راج گڑھ ایٹمی سنٹر سے تین چار میل کے فاصلے پر تھا اور یہاں ہمارے کوارٹرز تھے جہاں ہمیں روزانہ ایٹمی سنٹر کی گاڑیاں لے کر جاتی تھیں ۔ مجھے تشویش ہونے لگی کہ کہیں میں غلط راستے پر تو نہیں پڑ گیا تھا۔ صحراؤں میں راستہ بھول جانے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ سمجھو آدمی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ میں نے رک کر

گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ گھڑی کی سوئیاں چمک رہی تھیں ۔ بموں کے دھماکے میں تیس منٹ باقی رہ گئے تھے۔ میں صرف پانچ منٹ تک سانس لینے کی غرض سے قدم قدم چلتا گیا۔ اس کے بعد مشرق کی جانب دیکھا۔ ستارہ صبح مشرقی افق کے کنارے پر نمودار ہو گیا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ میں مشرق کی طرف ہی جا رہا تھا مگر دوڑتے دوڑتے صحرائی ٹیلوں میں راج گڑھ سے کچھ فاصلے پر بائیں جانب ہو گیا تھا۔ میں نے اپنا رخ درست کیا اور دوبارہ دوڑنے لگا۔

مجھے دور سے کچھ روشنیاں جھلملاتی نظر آئیں ۔ میں خوش ہو گیا کہ راج گڑھ آ رہا ہے۔ راج گڑھ میں مجھے رکنا نہیں تھا بلکہ آگے نکل جانا تھا۔ کوئی دس منٹ کے بعد وہ روشنیاں ریت کے ٹیلوں میں گم ہو گئیں ۔ میں چھوٹے چھوٹے ٹیلوں کے درمیان آ گیا تھا۔ ڈر تھا کہ میں کہیں بھٹک نہ جاؤں ۔ میں ایک ٹیلے پر چڑھ گیا اور مشرق کی جانب نظر دوڑائی۔ خدا جانے وہ روشنیاں جو مجھے دور سے جھلملاتی نظر آئی تھیں اب کہاں غائب ہو گئیں تھیں ۔ ایٹمی سنٹر والے ٹیلوں کے نظر آنے کا اب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ میں ان سے کافی دور نکل آیا تھا۔ ایک خیال آیا کہ انہی ٹیلوں میں کسی جگہ بیٹھ کر دن کی روشنی کے نکلنے کا انتظار کروں ۔ دن کی روشنی میں مجھے راستہ معلوم ہو جائے گا۔ دھماکے کے بارے میں مجھے اطمینان تھا کہ میں اس کی شدید زد سے بھی دور ہو چکا ہوں ۔ پھر خیال آیا کہ مجھے رکنا نہیں چاہئے۔ چلتے رہنا چاہئے۔ میں نے صبح کے ستارے کو اپنا راہ نما بنایا اور اس کی سمت ٹیلوں میں چلنے لگا۔ میں نے ایک بار پھر اپنی گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ دھماکہ ہونے میں صرف پانچ منٹ باقی رہ گئے تھے۔ میں نے چلنا بند کر دیا اور ایک ایسے ٹیلے کی اوٹ میں ہو کر بیٹھ گیا جہاں سے مجھے دور تک صحرا بالکل صاف نظر آ رہا تھا۔ میرا رخ ایٹمی سنٹر کی جانب ہی تھا۔

میری نظر رات کے اندھیرے میں دور سیاہ دھبوں پر لگی ہوئی تھیں جو کسی وقت اندھیرے میں غائب ہو جاتے تھے اور کسی وقت نظر آنے لگتے تھے۔ میں نے گھڑی پر نظریں جما دیں ۔ اب اس علاقے میں تباہی مچنے میں صرف ایک منٹ باقی رہ گیا تھا۔ خیال

آیا کہ کہیں بم کسی نے ناکارہ نہ کر دیئے ہوں ۔ یا کسی فنی خرابی کی وجہ سے بلاسٹ ہی نہ ہوں ۔ جب دس سیکنڈ باقی رہ گئے تو میں صحرا کے اندھیرے میں دور ٹکٹکی لگا کر دیکھنے لگا۔ میں منہ میں الٹی گنتی کر رہا تھا۔ جب دس سیکنڈ بھی پورے ہو گئے تو میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ میں نے ایک لمحے کے لئے اپنا سانس روک لیا۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ دھماکہ نہ ہو۔ ہمارے ماسٹر سپائی گل خان نے بڑے اعتماد سے کہا تھا کہ اگر ان بموں کے فیوز کسی نے ناکارہ نہ کر دیئے تو یہ ٹھیک وقت پر قیامت خیز دھماکے سے پھٹ جائیں گے۔ اور گل خان ہائی ایکسپلوسیوز کا ماہر تھا۔ اس سے پہلے اس کے اس قسم کے بموں سے میں دوارکا فورٹ میں بھارتی فوج کا گولہ بارود اور فوجی ساز وسامان کا ذخیرہ تباہ کر چکا تھا۔ اور ایک بھارتی فوجی اسلحہ کی ٹرین بھی اڑائی تھی۔ جو جموں جا رہی تھی اور جس میں لدا ہوا اسلحہ کشمیری مجاہدین کے خلاف استعمال کیا جانا تھا۔ بم ضرور بلاسٹ ہوں گے۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ جنوب کی جانب آسمان ایک دم روشن ہو گیا۔ یہ روشنی ایسی تھی جیسے بغیر آواز کے بجلی چمکی ہو۔ اس کے ساتھ ہی زمین ہلنے لگی جیسے زلزلہ آ گیا ہو۔ اس کے بعد مجھے ایسا دھماکہ سنائی دیا جیسے کوئی مال گاڑی انجن سمیت فل سپیڈ سے کڑکڑاتی ہوئی میرے اوپر سے گزر گئی ہو۔ زمین ہل رہی تھی۔ دور صحرا میں روشنی بار بار چمک رہی تھی اور دھماکوں کی آوازیں دو دو سیکنڈوں کے وقفے سے آ رہی تھیں ۔ میرا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ میرے لگائے ہوئے بموں نے اپنا کام کر دیا تھا پہلے روشنی چمکی تھی اب دور آسمان پر سرخ روشنی پھیل گئی۔ مجھے شعلے آسمان کی طرف بلند ہوتے نظر آنے لگے۔ مجھے یہ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ ایٹمی سنٹر کے دھماکوں کی شدت کتنی ہے۔ آسمان کا کنارا اس قدر سرخ ہو رہا تھا جیسے اس کے نیچے بہت بڑا جوالا مکھی پھٹ پڑا ہو۔ اب میرا وہاں رکنا مناسب نہیں تھا۔

میں اٹھا اور مشرق کی سمت تیز تیز چلنے لگا۔ صبح کا ستارہ پچھلے پہر کے نیلے نور میں بھڑک رہا تھا۔ میں حیران تھا کہ جو روشنیاں مجھے پہلے دکھائی دی تھیں وہ کہاں چلی گئی ہیں میرے چلتے چلتے آسمان پر صبح کا اجالا پھیلنے لگا۔ پھر مشرق کی جانب سے سورج کا سرخ تھال

نمودار ہوا۔ میں چلتا گیا۔ سورج جب طلوع ہوتا ہے تو اوپر آتا ہوا صاف معلوم ہوتا ہے۔ جیسے جیسے اوپر آتا جاتا ہے ہمیں اس کی حرکت نظر آنی بند ہو جاتی ہے پھر ہم دھوپ کو دیکھ کر ہی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ سورج آہستہ آہستہ مشرق سے مغرب کی طرف جا رہا ہے۔ اور اگر حقیقت کے اصولوں کی روشنی میں دیکھا جائے تو سورج اپنی جگہ پر ہی موجود رہتا ہے۔ ہماری زمین اس کی جانب رخ کر کے مغرب سے مشرق کی طرف گھوم رہی ہوتی ہے۔ زمین کی دو حرکتیں ہیں۔ ایک وہ جو سورج کے گرد گھومنے سے ماہ و سال اور موسم بدلتے ہیں اور اپنے محور کے گرد گھومنے سے دن رات پیدا ہوتے ہیں۔

یہ فزیکل سائنس کی باتیں ہیں جتنی مجھے معلوم تھیں میں نے آپ کو بتا دی ہیں۔ اس کے آگے اگر آپ کو جاننے کی خواہش ہو تو آپ کتابیں پڑھیں۔ یہ میں اپنی داستان بیان کرتے ہوئے آپ کو بتا رہا ہوں اس وقت جب میں صحرا میں چلا جا رہا تھا اور سورج طلوع ہو رہا تھا تو اس وقت میں یہ بالکل نہیں سوچ رہا تھا کہ سورج طلوع ہو رہا ہے یا ہماری زمین اس کے آگے گھوم رہی ہے۔ اس وقت تو میں صرف یہ سوچ رہا تھا کہ میں ٹھیک رخ پر بھی جا رہا ہوں یا نہیں۔ کیونکہ یہ حقیقت بھی میرے سامنے تھی کہ دھماکے کے بعد اس سارے صوبے کی پولیس اور خفیہ سروس ہنگامی حالت کے تحت الرٹ ہو گئی ہو گی سارے علاقے کو پولیس نے اور بہت ممکن ہے بھارتی فوج نے اپنے گھیرے میں لے لیا ہو اور جگہ جگہ ناکہ بندی کر کے چیکنگ شروع ہو گئی ہو۔

میں اگرچہ بھارتی سکھ کے بھیس میں تھا اور میں نے ایٹمی سنٹر کی تمام نشانیاں ضائع کر دی تھیں لیکن اس کے باوجود اگر میں پولیس یا فوج کے نرغے میں آگیا تو مجھ سے پوری پوچھ گچھ کی جائے گی کہ میں کون ہوں اور اس وقت اکیلا اس طرف کیا کر رہا تھا۔ بہرحال میں کوئی عام قسم کا آدمی نہیں تھا اعلیٰ ترین تربیت یافتہ کمانڈو تھا۔ ہر قسم کے حالات سے نمٹنا میری ٹریننگ میں شامل تھا۔ اب مجھے چلتے چلتے تھکن محسوس ہونے لگی تھی۔ ریت بھی گہری ہو گئی تھی۔ میرے جوتے ریت میں گھسنے لگے تھے۔ دوسری مصیبت یہ تھی کہ سورج کی روشنی میں بھی مجھے دور دور تک کسی آبادی یا بجلی کے کھمبوں کا نام و نشان تک

دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ایک ہی خطرہ تھا کہ میں کہیں صحرا میں بھٹک تو نہیں گیا؟

ریت کے چھوٹے ٹیلوں کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا۔ اب ریت کے بڑے بڑے ٹبے آ رہے تھے۔ میں نے ایک ٹبے کے اوپر چڑھ کر دور نگاہ ڈالی۔ کچھ فاصلے پر مجھے ایک انسان دکھائی دیا جو اونٹ کی مہار تھامے آہستہ آہستہ چلا جا رہا تھا۔ مجھے کچھ حوصلہ ہوا کہ میں آبادی سے دور نہیں ہوں۔ میں نے اس آدمی کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ میں آگے سے ہو کر جا رہا تھا۔ دو تین ٹبے عبور کرنے کے بعد میں اس جگہ آ کر کھڑا ہو گیا جہاں سے شتر سوار نے گزرنا تھا۔

اونٹ والا قریب ہو رہا تھا۔ اس نے راجستھانی دیہاتی آدمیوں کی طرح سر پر بڑا سا پگڑ باندھ رکھا تھا۔ ہاتھ میں لمبی چھڑی تھی۔ وہ اونٹ کی مہار تھامے آہستہ آہستہ چلا آ رہا تھا۔ جب میرے قریب آیا تو خود ہی رک گیا اور میری طرف دیکھ کر اس نے راجستھانی ہندوستانی میں مجھ سے پوچھا کہ مجھے کس گاؤں میں جانا ہے۔ میں اس کی زبان یہاں نہیں لکھوں گا۔ بلکہ جو کچھ اس نے کہا تھا اسے سادہ اردو میں لکھوں گا۔ میں نے کہا۔

"مہاراج مجھے ریواڑی جانا ہے۔ ادھر تھل میں ایک سنگی ساتھی سے ملنے آیا تھا۔ راستہ بھول گیا ہوں"

اونٹ والا مجھے اپنی چمکیلی اور اندر کو دھنسی ہوئی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"ریواڑی تو اس جانب ہے ماراج۔ چل میں تمہیں لئے چلتا ہوں۔ میں بھی ریواڑی ہی جا رہا ہوں۔ جانور کے اوپر بیٹھ جاؤ۔"

اونٹ پر درختوں کی سوکھی ٹہنیاں لدی ہوئی تھیں۔ شتر سوار نے مجھے بڑی مشکل سے اونٹ کے اوپر چڑھا کر بٹھا دیا۔ اونٹ اوپر نیچے ہوتا' مجھے جھکولے دیتا چل پڑا۔ مجھے خیال آیا کہ ریواڑی تو کافی دور ہے۔ راج گڑھ سے میں ٹرین میں وہاں جایا کرتا تھا اور دو گھنٹے لگ جاتے تھے۔ یہ اونٹ والا کیسے وہاں پہنچے گا اور کب پہنچے گا۔ کہیں اس نے مجھے کسی اور جگہ کا نام تو نہیں بتا دیا۔ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔

"ماراج جی! ریواڑی ہم کب پہنچیں گے؟"

اونٹ والا دیہاتی اپنی بولی میں بولا۔

"آج سارا دن چلیں گے۔ رات جھونجھانی میں گزاریں گے۔ دوسرے دن چلیں گے دوسری رات ڈیرو گڑھ میں آئے گی۔ تیسرے دن پہنچیں گے ریواڑی رات کو۔"

میں پریشان ہو گیا۔ میں اتنا لمبا سفر اونٹ پر طے نہیں کر سکتا تھا۔ ویسے بھی جن جگہوں کے اس نے نام لئے تھے۔ وہاں پولیس کی ناکہ بندی ضرور ہو گی۔ میں کسی مصیبت میں پھنس سکتا تھا۔ میں نے اسے کہا۔

"ماراج! تم مجھے جھونجھانی پہنچا دو۔ وہاں سے میں کسی لاری میں بیٹھ کر ریواڑی چلا جاؤں گا"

"جیسے تمہاری مرضی ماراج!"

اونٹ والا خاموش ہو گیا۔ اونٹ اپنی سست رفتار کے ساتھ صحرا میں چلتا گیا۔ سورج نکل آنے کی وجہ سے گرمی ہو گئی تھی۔ میری سکھوں والی پگڑی اور ڈاڑھی کی وجہ سے مجھے زیادہ گرمی لگنے لگی تھی۔ مگر مجھے یہ تکلیف برداشت کرنی ہی تھی۔ کیونکہ اصل میں میں صحرا میں بھٹک گیا تھا اور اب میرا جھونجھانی پہنچنا ضروری تھا۔ اتنا مجھے معلوم تھا کہ ڈیرو سے ریواڑی تک ریل گاڑی جاتی ہے اور جھونجھانی سے مجھے ڈیرو تک کے لئے کوئی نہ کوئی لاری مل سکتی تھی۔ راستے میں ایک جگہ درختوں کا ایک جھنڈ آیا۔ یہ کیکر کی قسم کے درخت تھے۔ یہاں اونٹ والے نے اونٹ کو بٹھا دیا۔ میں اتر پڑا۔ یقین کریں میں کمانڈو ٹریننگ کے بعد بڑا سخت جان ہو گیا ہوا تھا مگر اونٹ کی سواری نے میرے جسم کے سارے پیچ ہلا کر رکھ دیئے تھے۔ یہاں ریت میں ایک چھوٹا سا چشمہ بھی بہہ رہا تھا۔ اونٹ والے نے پوٹلی کھولی۔ اس میں گڑ اور مکئی کی روٹیاں تھیں۔ اس نے ایک روٹی اور گڑ مجھے بھی دیا۔ اس روٹی کا بہت مزا آیا۔

یہاں ایک گھنٹہ آرام کرنے کے بعد پھر ہمارا سفر شروع ہو گیا۔ کسی نہ کسی طرح شام ہونے کے کچھ دیر بعد جھونجھانی پہنچ گئے۔ میں نے اونٹ والے کا شکریہ ادا کیا۔ میرے پاس پیسے موجود تھے۔ میں نے اسے دس روپے دینے چاہے مگر اس نیک دل انسان نے نہ

لئے۔ جھونجھانی ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ بجلی موجود تھی۔ معلوم ہوا کہ رات کو وہاں سے کوئی لاری ڈیرو گڑھ نہیں جاتی۔ صبح ملے گی۔ میں نے سوچا کہ لاری اڈے پر ہی رات بسر کرنی چاہئے۔ وہاں آیا تو کئی دوسرے مسافر بھی وہاں پڑے تھے۔ میں نے اچھی طرح سے ماحول کا جائزہ لیا۔ یہاں مجھے پولیس کا کوئی آدمی نظر نہ آیا۔ لوگوں کو رام گڑھ کے ایٹمی سنٹر کے دھماکے کے بارے میں کچھ پتہ نہیں تھا۔ رات کسی نہ کسی طرح گزر گئی۔ صبح کے وقت ایک لاری پیچھے کسی شہر سے آئی۔ اس کے ڈرائیور اور سواریوں نے بتایا کہ رام گڑھ میں بم پھٹا ہے۔ ایک سرکاری دفتر اڑ گیا ہے۔ یہ خبر سن کر مجھے اطمینان ہو گیا کہ میری محنت رائیگاں نہیں گئی۔ لوگ آپس میں باتیں کرنے لگے۔ کوئی کہتا یہ کشمیری مجاہدین کا کام ہے۔ کوئی کہتا کہ یہ دھماکہ کانگریس کی مخالف جماعت نے کرایا ہے۔ ایک مسافر بولا۔

"ماراج اب تو ہر جگہ دھماکے ہوتے ہیں۔ کچھ پتہ نہیں چلتا کون دھماکہ کراتا ہے۔ کون نہیں کراتا۔"

ڈرائیور کرسی پر بیٹھا ناشتہ کر رہا تھا۔ میں بھی اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ میں نے پوچھا۔

"ماراج جی! یہ کون سا سرکاری دفتر تھا جہاں بم پھٹا ہے؟"

وہ کہنے لگا۔

"معلوم نہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ کوئی سرکاری دفتر تھا۔ بھگوان جانے کیسا بم تھا۔ کہتے ہیں دو پہاڑیاں بھی ساتھ ہی اڑ گئی ہیں۔"

میں نے ہاتھ باندھ کر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اے سچے بادشاہ! تو اپنی کرپا کرنا۔"

پھر میں نے مزید سراغ رسانی کرتے ہوئے ڈرائیور سے کہا۔

"ماراج ہماری پولیس کا وہاں کوئی آدمی نہیں تھا؟ پولیس کو ہماری سرکار نے کس لئے بھرتی کیا ہوا ہے؟"

ڈرائیور سگریٹ لگاتے ہوئے کہنے لگا۔

"سردار جی! پولیس تو اب خبردار ہوئی ہے۔ راستے میں جگہ جگہ ناکہ بندی کی ہوئی تھی۔ اب کیا ہوتا ہے۔ جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا۔ پر میں تو کہتا ہوں کہ یہ ضرور کشمیر کے کمانڈو کا کام ہے۔"

اس کا مطلب تھا کہ جھونجھانی سے آگے ڈیرو گڑھ تک بھی راستے میں پولیس کی چیک پوسٹیں ضرور ہوں گی۔ مگر میرا جانا ضروری تھا۔ اس خطرے سے تو مجھے ہر حالت میں گزرنا ہی تھا۔ کوئی ایک گھنٹے بعد لاری ڈیرو گڑھ کی طرف جا رہی تھی۔ وہاں سے کسی دوسرے شہر کی طرف جانا بھی اتنا ہی خطرناک تھا۔ یہ سارا راستہ ریتلا تھا۔ کہیں کہیں کوئی درخت نظر آ جاتا تھا۔ گرمی بھی کافی تھی۔ لاری کوئی دو گھنٹے کے سفر کے بعد ڈیرو گڑھ پہنچی۔ راستے میں پولیس کی کوئی چیک پوسٹ نہیں تھی۔ ڈیرو گڑھ بھی کافی بڑا قصبہ تھا اور ریلوے سٹیشن بھی تھا۔ یہاں سٹیشن کے باہر اکثر لوگوں کو رام گڑھ کے دھماکے کے بارے میں باتیں کرتے پایا۔ لوگ خوف زدہ تھے۔ اس سے پہلے فوجی اسلحہ کی ٹرین اور دوارکا کا فوجی اسلحے کا قلعہ دھماکوں کی نذر ہو چکا تھا۔ لوگ اس قسم کے خدشے کا اظہار کر رہے تھے کہ صوبہ گجرات سے اب کشمیری کمانڈوز نے راجستھان کا رخ کر لیا ہے یہاں بھی اب کسی جگہ دھماکے ہو سکتے ہیں۔

"ڈیرو گڑھ سے ٹرین سیدھی ریواڑی جاتی تھی جہاں سے مجھے دلی کی ٹرین پکڑنی تھی۔ میں ٹکٹ لے کر پلیٹ فارم کے گیٹ کے پاس آیا تو دیکھا کہ وہاں باوردی پولیس کے کچھ سپاہی کھڑے تھے۔ وہ ایک آدمی سے اٹیچی کیس کو کھلوا کر چیک کر رہے تھے۔ میں ٹی ٹی کو ٹکٹ دے کر اندر جانے لگا تو پولیس نے مجھے روک لیا۔ ان میں ایک تھانیدار بھی تھا۔ اس نے مجھ سے میرا نام پوچھا۔ میں نے اپنا نام بتایا۔

"جسونت سنگھ سوڈھی"

میں نے اپنا نام بدلنے کی اس لئے ضرورت محسوس نہ کی تھی کہ مجھے معلوم تھا کہ ایٹمی مرکز کی ساری ایڈمنسٹریشن اس کے سارے دفاتر اور دفاتر کا ریکارڈ خوفناک دھماکوں کی

آگ میں جل کر راکھ ہو چکا ہو گا۔ میرا نام ایٹمی سنٹر کی انتظامیہ کے رجسٹروں میں ہی درج تھا۔ تھانیدار راجستھان کا معلوم ہوتا تھا۔ اس نے مجھے گھور کر دیکھا اور دوسرا سوال کیا۔

"کہاں سے آ رہے ہو سردار جی؟"

میں نے اس قسم کے سوالوں کے جواب پہلے ہی سے ذہن میں تیار کر رکھے تھے۔ میں نے کہا۔

"جھونجھانی سے دو میل دور ایک گوردواستھان ہے۔ اس کی یاترا کو گیا تھا۔ اب واپس دلی جا رہا ہوں۔ دلی میں گردوارہ گرو تیغ بہادر میں گرنتھی بھائی کے پاس ٹھہرا ہوا ہوں۔ وہاں سے واپس اپنے شہر امرتسر چلا جاؤں گا۔"

میں نے ایک ہی بار ان تمام سوالوں کے جواب اسے دے دیئے تھے جو میرے خیال میں وہ مجھ سے اس کے بعد پوچھنے والا تھا۔ تھانیدار نے ایک سوال کر ہی دیا۔

"امرتسر میں کیا کرتے ہو؟"

"کوتوالی کے پاس رام گڑھیا ہائی سکول ہے وہاں حساب کا ٹیچر ہوں۔ میرے ماتا پتا بھی کوتوالی کے پاس ہی رہتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ جاؤ"

یہاں سے مجھے رات کے وقت دلی کی گاڑی ملی۔ اس گاڑی میں کچھ مسافر راج گڑھ کے بھی تھے۔ انہوں نے بتایا کہ رام گڑھ کا پورا قصبہ اور اردگرد کا سارا علاقہ دھماکے کے بعد اڑ گیا ہے۔

"سنا ہے وہاں ایٹم بم بن رہا تھا۔ ہم وہاں سے کافی دور راج گڑھ میں تھے۔ ہمارے مکان کی چھت اڑ گئی۔ آدھا راج گڑھ تباہ ہو گیا ہے۔ ہم بڑی مشکل سے جان بچا کر وہاں سے بھاگے ہیں۔"

ایک مسافر نے کہا۔

"ایٹم بم چل گیا ہو گا۔"

"ہاں جی۔ آدھی رات کے وقت شعلے آسمان کی طرف بلند ہوتے دیکھے تھے۔ اتنی گرمی ہو

گئی تھی کہ ہم نے تالاب میں چھلانگیں لگادیں ۔ راج گڑھ کے لوگ گرمی میں جھلس کر
بھی مرگئے۔ کوئلہ ہو گئے۔"

اس میں کچھ نہ کچھ مبالغہ ضرور تھا۔ گرمی سے مجھے خیال آیا کہ ہو سکتا ہے ایٹمی
مرکز میں معمولی سی مقدار میں افزودہ پلوٹونیم موجود ہو جس نے پھٹ کر گرمی کی شدت
میں اضافہ کر دیا ہو۔ ایسی بات ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو لیکن ایسا ضرور ہوا تھا کہ اس ایٹمی
مرکز کا ایٹمی پلانٹ' ریسرچ لیبارٹری اور سارا کچا یورنیم اور پلوٹونیم شعلے بن کر اڑ گیا تھا۔
اس واقعے سے بھارتی حکومت جو ایٹمی میزائل اور پلوٹونیم وار ہیڈ اسلحہ کی ابتدائی تیاریاں
کر رہی تھی وہ پانچ سے دس سال تک پیچھے جا پڑی تھیں اور ہم یہی چاہتے تھے۔

رات کے پچھلے پہر ٹرین نے مجھے ریواڑی پہنچایا۔ یہاں ہر کسی کی زبان پر ایٹمی
دھماکے کا ذکر تھا اور لوگوں میں کافی خوف و ہراس پایا جاتا تھا۔ کچھ لوگوں کو میں نے یہ کہتے
بھی سنا کہ بھارت نے جو ایٹم بم بنایا ہوا تھا وہ پھٹ گیا ہے اور سارا راجستھان تباہ ہو گیا
ہے۔ ریواڑی کے ریلوے سٹیشن پر پولیس کی بھاری تعداد موجود تھی اور مسافروں کے
سامان کی چیکنگ ہو رہی تھی۔ میرے پاس کوئی سامان نہیں تھا۔ دلی والی ٹرین کوئی ایک
گھنٹے بعد روانہ ہونے والی تھی۔ میں پلیٹ فارم پر کھڑے ایک خالی ڈبے میں جا کر لیٹ
گیا۔ ظاہر یہ کیا کہ مسافر ہوں اور ڈبہ خالی دیکھ کر وہاں سونے آگیا ہوں ۔ تھوڑی دیر ہی
گزری ہو گی کہ ڈبے کو دھچکا لگا۔ میں نے اٹھ کر کھڑکی میں سے باہر دیکھا۔ ڈبے کے
ساتھ ایک شنٹ کرتا انجن آکر لگ گیا تھا اور اب اسے کھینچ کر پلیٹ فارم سے لے جانے
والا تھا۔ میں جلدی سے اتر کر سامنے پلیٹ فارم کے لوہے کے ستون کے پاس آکر کھڑا ہو
گیا۔ قریب ہی چھوٹا سا کھوکھا تھا جہاں دلی اور جے پور میں چھپنے والے ہندی اردو کے
اخبار پڑے تھے۔ میں اردو کا اخبار اٹھا کر پڑھنے لگا۔ اس پر رام گڑھ کے دھماکے کی خبر جلی
حروف سے چھپی ہوئی تھی۔ میں نے اخبار خرید لیا اور ایک طرف بیٹھ کر ساری خبر پڑھ
ڈالی۔ اس خبر سے صاف لگتا تھا کہ گورنمنٹ نے اصلی نقصان ظاہر نہیں ہونے دیا۔ خبر
میں صرف یہی بتایا گیا تھا کہ رام گڑھ کے معدنیات کے ریسرچ سنٹر میں کسی کشمیری کمانڈو

نے بم رکھ دیا تھا جو پھٹ گیا جس سے عمارت کو شدید نقصان پہنچا اور آگ لگ گئی۔ دو
آدمی ہلاک ہو گئے اور چار زخمی ہوئے ہیں۔

یہ سراسر جھوٹی خبر تھی۔ بھارتی حکومت نے اصل خبر کو چھپا لیا تھا۔ حکومت اصلی خبر
شائع ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ لیکن لوگوں کی زبانی مجھے معلوم ہو گئی تھی اور خود میں نے
صحرا میں رات کو ایٹمی سنٹر کے شعلے آسمان کی طرف بلند ہوتے دیکھے تھے۔ میں دوسرے
روز دلی پہنچ گیا۔ یہاں بھی اخباروں میں ایٹمی سنٹر کی تباہی کی خبریں چھپی ہوئی تھیں ۔ میں
سٹیشن سے سیدھا بستی نظام الدین" پہنچا۔ وہاں درگا شریف کے گیٹ کے قریب پبلک ٹیلی
فون بوتھ سے گل خان کو فون کیا۔ اسے بتایا کہ میں آگیا ہوں ۔ گل خان نے کوڈ الفاظ میں
کہا۔

"تم دسترخوان بچھاؤ۔ میں کھانا لے کر آرہا ہوں"

اس کا مطلب تھا تم پرانے گھر پہنچو میں آرہا ہوں۔ میں مغل شہزادے کی خانقاہ کی
دیوار کے قریب سے ہوتا ہوا پرانے مکان پر آگیا۔ مغل شہزادے کی قبر کے قریب سے
گزرتے ہوئے مجھے پھر خیال آیا کہ مغل شہزادے کی روح نے مجھے کہہ رکھا ہے کہ مجھ پر
عنقریب کوئی آفت نازل ہونے والی ہے مجھے ہوشیار رہنا چاہئے۔ میں ایک بار پھر سوچنے لگا
کہ یہ آفت کس قسم کی ہو سکتی ہے۔ ایک آفت سے تو میں کامیاب و کامران نکل کر آرہا
تھا۔ میرا کمانڈو مشن بڑی کامیابی سے مکمل ہو گیا تھا۔ مجھے مکان میں بیٹھے تھوڑی دیر
گزری ہو گی کہ گل خان اپنے ساتھ پروفیسر جمشید کو لے کر آگیا۔ آپ لوگوں کو میں بتا چکا
ہوں کہ یہ دونوں انڈین نیشنل تھے۔ یعنی بھارت کے شہری تھے۔ مسلمان تھے۔ اور اسلام
اور پاکستان کے لئے دل میں محبت کا بے پناہ جذبہ رکھتے تھے اور انہوں نے اپنے آپ کو
کشمیر اور اسلام کی خدمت کے لئے وقف کر رکھا تھا۔ یہ نہ تو پاکستان کے جاسوس تھے اور
نہ انہیں کسی اور ملک نے انڈیا میں جاسوسی کرنے پر مجبور کیا تھا۔ یہ صرف پاکستان اور
اسلام کی سربلندی اور استحکام اور کشمیر کی آزادی کی خاطر اپنے طریقے سے جہاد کر رہے
تھے۔ یہ دلی میں میرے ماسٹر سپائی تھے اور ان کی نگرانی اور ہدایات کے تحت ہی میرے

کمانڈو مشن ترتیب پاتے تھے۔

پروفیسر جمشید حسب عادت جیب سے رومال نکال کر عینک کے شیشے صاف کرتے ہوئے کہنے لگا۔

"کمانڈو مشن کی کامیابی پر ہماری طرف سے مبارک باد قبول کرو۔"

گل خان نے بھی مجھے مبارک باد دی اور کہا۔

"بھارت سرکار نے حقیقت کو چھپانے کی ناکام کوشش کی ہے۔ مگر سب لوگوں کو پتہ چل گیا ہے کہ راجستھان میں رام گڑھ کے مقام پر جو زیر زمین ایٹمی ریسرچ سنٹر قائم تھا وہ بالکل تباہ ہو گیا ہے۔"

میں نے کہا۔

"اصل تباہی کتنی ہوئی ہے؟ کیا وہاں تابکاری بھی پھیلی ہے؟"

یہ سوال میں نے پروفیسر جمشید سے کیا تھا جو نیوکلر فزکس میں بی اے کر چکا تھا۔ وہ کہنے لگا۔

"نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں ابھی پلوٹونیم اور یورنیم کچی حالت میں تھی۔ اس کی پروسیسنگ ہی ہو رہی تھی۔ اگر پلوٹونیم کی معمولی سی مقدار بھی افزودہ ہو چکی ہوتی تو جیسا کہ میں نے تمہیں پہلے بتایا تھا آس پاس کا تین میل کا علاقہ جل کر بھسم ہو گیا ہوتا اور ایٹمی تابکاری کا اثر ریواڑی اور جے پور تک پھیل سکتا تھا۔"

گل خان نے کہا۔

"لیکن ایٹمی ریسرچ سنٹر کا نام ونشان تک باقی نہیں رہا۔ بھارت سرکار کا پاکستان کے خلاف ایٹمی جارحیت کا پروگرام کم سے کم پانچ سال پیچھے پڑ گیا ہے۔"

پروفیسر جمشید آنکھوں پر چشمہ لگاتے ہوئے بولا۔

"میرے اندازے کے مطابق کم از کم سات سال کے لئے یہ پروگرام ضرور پیچھے پڑ گیا ہے۔"

لیکن بھارت اس پروگرام سے دستبردار نہیں ہو گا۔ اس کے پاس اور کئی ایٹمی ریسرچ سنٹروں کے پروگرام ہیں۔ اب اس کی ساری توجہ میری اطلاع کے مطابق حیدر آباد دکن کے دفاعی تحقیقاتی ادارے یعنی ڈیفنس ریسرچ اینڈ ڈویلپمنٹ لیبارٹری ڈی آر ڈی ایل پر مرکوز ہو جائے گی اس سنٹر نے پہلے ہی ایٹمی ریسرچ میں بڑے کامیاب نتائج دکھائے ہیں۔ میری اطلاع کے مطابق اس ادارے کو بھارت کے حساس ترین دفاعی ادارے کی حیثیت حاصل ہے۔ اور ستم ظریفی کی بات یہ ہے کہ بھارتی دور مار میزائل کے اس ادارے کا بانی ایک مسلمان سائنس دان ہے جس کا نام عبدالکلام ہے۔"

گل خان نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ہمارا اگلا ٹارگٹ حیدر آباد دکن کا یہ دور مار میزائلوں کا دفاعی ریسرچ سنٹر ہو گا۔ مگر اس سے پہلے ہمیں ایک اور مرحلہ درپیش ہے۔"

"وہ کیا ہے؟ مجھے بتائیں" میں نے پوچھا۔

گل خان کہنے لگا۔

"جیسا کہ تم جانتے ہو پرائم منسٹر نے خاص اپنی نگرانی میں ایک خفیہ ادارہ بنایا ہے جس کا پورا نام بظاہر ریسرچ اینڈ انیلسنگ ونگ رکھا گیا ہے۔ اس کا مختصر نام را RAW ہے۔ یہ ادارہ بیرونی ممالک کے بارے میں سرکار کو خفیہ رپورٹیں مہیا کرتا ہے۔ اب اس ادارے نے پاکستان میں انتشار اور افراتفری پھیلانے کے لئے تخریب کاروں کو پاکستان بھیجنے کا پروگرام وضع کیا ہے۔ پہلے یہ بھارتی تخریب کار انڈین فوج کے ریٹائرڈ کمانڈوز میں سے لئے جاتے تھے۔ لیکن اب باقاعدہ دہشت گرد بھرتی کر کے ان کو تربیت دینے کے لئے دلی سے کچھ فاصلے پر ایک خفیہ تربیتی کیمپ قائم کیا گیا ہے۔ تمہیں اس تربیتی سنٹر میں بطور ایک دہشت گرد کے بھرتی ہو کر وہاں سے ساری معلومات حاصل کرنی ہیں کہ یہ بھارتی دہشت گرد ٹریننگ پوری کرنے کے بعد پاکستان میں کہاں جا کر قیام کرتے ہیں اور وہاں ان کے کون کون سے بھارتی جاسوس ہیں تا کہ حکومت پاکستان کو ان تخریب کاروں کی پوری رپورٹیں مہیا کر کے ان کا خاتمہ کیا جا سکے۔"

یہ مشن مجاہدانہ تھا۔ مجھے اس لئے بھی پسند آیا کہ اس کا براہ راست تعلق میرے وطن پاکستان کی سلامتی اور استحکام سے تھا جس کی خاطر میں ہر قربانی دے سکتا تھا۔ میں نے گل خان سے پوچھا۔

"تخریب کاری کے اس سنٹر میں بھرتی ہونے کی شرائط کیا ہیں اور میں کس طریقے سے اس سنٹر میں داخلہ لے سکوں گا۔"

گل خان نے کہا۔

"یہ ساری باتیں تمہیں سمجھا دی جائیں گی۔ سب سے پہلے تمہیں را کے ماتحت چلنے والے تخریب کاری کے اس ٹریننگ سنٹر کی نشان دہی کرائی جائے گی۔"

پروفیسر جمشید بولا۔

"تمہیں جتنی جلدی ہو سکے سکھوں والا حلیہ اب بدل دینا ہو گا۔ یہ ڈاڑھی مونچھیں اور سر کے بال منڈوا دو۔ کیونکہ راج گڑھ کے جن کوارٹروں میں تم رہتے تھے ان کوارٹروں کو زیادہ نقصان نہیں پہنچا۔ ایٹمی سنٹر کے دھماکے نے بعض کوٹھیوں اور کوارٹروں کی چھتیں اڑا دی تھیں اور کچھ مکان زمین بوس بھی ہو گئے تھے۔ لیکن سب سے زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ ایٹمی سنٹر کا چیف ارجن سنگھ سوڈھی جس نے درگا وتی کی سفارش پر تمہیں ایٹمی سنٹر میں ملازم رکھا تھا وہ زندہ ہے اور اس وقت دلی میں موجود ہے۔ وہ تمہیں اس حلیے میں پہچان لے گا۔ چونکہ دھماکے کے بعد تم کالونی سے غائب ہو گئے ہو اس لئے تم پر شک کیا جا سکتا ہے۔ کہ یہ کام تم نے ہی کیا ہو گا۔"

میں نے کہا۔

"میں کل شہر جا کر یہ ڈاڑھی اور سر کے بال منڈوا دوں گا سر کے آدھے بال اور ڈاڑھی میں یہیں سے قینچی سے کاٹ کر جاؤں گا تاکہ کسی کو یہ شک نہ پڑے کہ میں سکھ ہو کر سر کے بال کیوں منڈوا رہا ہوں۔"

گل خان کہنے لگا۔

"میں چاہتا ہوں کہ یہ کام تم ہمارے جانے کے بعد ابھی کر ڈالو۔ تمہیں شہر جانے کی

ضرورت نہیں۔ اسی بستی کے باہر نائی مل جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں آج ہی بالوں کا صفایا کراتا ہوں۔"

گل خان اور پروفیسر دوسرے دن صبح کے وقت آنے کا وعدہ کر کے چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے پگڑی وغیرہ اتار کر پلاسٹک کے لفافے میں کرپان کڑے کے ساتھ ہی بند کر دی اور قینچی سے اپنے سر کے لمبے بال آدھے سے زیادہ کاٹ ڈالے۔ اس کے بعد ڈاڑھی مونچھیں بھی جتنی تراش سکتا تھا تراش ڈالیں۔ اب میرا حلیہ سکھوں والا نہیں تھا۔ میں اپنے گردن تک آئے ہوئے بالوں اور خشخشی ڈاڑھی کے ساتھ کوئی شاعر یا قوال لگتا تھا۔ میں نے چیزوں کو ایک طرف سنبھال کر رکھا اور مکان کے دروازے کو تالا لگا کر بستی کی طرف چلا۔ بستی نظام الدین" اولیا کے آس پاس ابھی اتنی زیادہ آبادی نہیں ہوئی تھی اور نئی کالونیاں بھی اتنی نہیں بنی تھیں۔ سن 60ء تک یہاں کافی سکون تھا۔ میں بستی کے شمال کی جانب نکل گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہاں کوئی نہ کوئی دیہاتی حجام مجھے مل جائے گا جو عام طور پر کسی درخت کے نیچے تخت پوش یا کرسی ڈال کر لوگوں کی حجامتیں کرتے ہیں۔ مجھے ایک ایسا حجام نظر آ گیا۔

بوڑھا آدمی تھا۔ پیپل کے درخت تلے شکستہ سی کرسی ڈال کر بیٹھا بیڑی پی رہا تھا۔ درخت کے ساتھ اس نے چھوٹا سا آئینہ کیل ٹھونک کر رکھا تھا۔ میں نے کہا۔

"بڑے میاں میری شیو بنا دو اور بال بھی چھوٹے کر دو۔"

میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنا کام شروع کر دیا۔ جب میں بوڑھے حجام کو اس کی اجرت دے کر واپس اپنے مکان کی طرف چلا تو میں کلین شیو تھا۔ ڈاڑھی مونچھیں غائب تھیں۔ سر کے بال ایئر فورس کے کیڈٹوں کی طرح بہت چھوٹے چھوٹے ہو گئے تھے۔ میرا پورا حلیہ بدل گیا تھا۔ اب میں اپنی اصل شکل میں واپس آ چکا تھا۔ دوپہر کا کھانا میں نے ایک چھوٹے سے ریستوران میں کھایا اور مکان میں آ کر لیٹ گیا۔ میں شام تک مکان میں ہی رہا اور اپنے نئے مشن کے بارے میں غور کرتا رہا۔ مجھے اس اطلاع سے کافی تشویش ہو رہی تھی کہ را نے پاکستان میں اپنے تخریب کاروں کی ٹریننگ کے لئے باقاعدہ ٹریننگ سنٹر

بنا لیا ہے اور یہ لوگ پاکستان میں تخریب کاری کی باقاعدہ مہم شروع کرنے والے ہیں۔ میں چاہتا تھا کہ اس سے پہلے کہ یہ تخریب کار تربیت حاصل کرنے کے بعد پاکستان میں داخل ہوں انہیں ایک ایک کر کے جہنم میں پہنچا دوں اور میں نے یہ عہد کر لیا ان تخریب کاروں میں سے کسی ایک کو بھی زندہ نہ چھوڑوں گا۔

سب سے دشوار مرحلہ اس ٹریننگ سنٹر میں داخل ہونے کا تھا۔ ظاہر ہے وہاں داخل ہونے والے کا پورا ریکارڈ چیک کیا جاتا ہو گا۔ یہ بات خاص طور پر دیکھی جاتی ہو گی کہ یہ امیدوار انڈین نیشنل ہو اور اس کا جھکاؤ پاکستان کی طرف نہ ہو۔ بلکہ کٹر قسم کا متعصب ہندو ہو۔ گل خان اور پروفیسر جمشید نے مجھے امید دلائی تھی کہ وہ یہاں میرے داخلے کا انتظام کر دیں گے۔ مجھے پوری توقع تھی کہ چونکہ ان لوگوں کا اثر و رسوخ ہر طبقے میں ہے اس لئے مجھے تخریب کاری کے سنٹر میں داخلہ مل جائے گا۔ میں نے گل خان اور پروفیسر میں سے کسی کو مغل شہزادے کی روح کی اس پیش گوئی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا کہ مجھ پر عنقریب ایک آفت نازل ہونے والی ہے اور چندریکا کی بدروح کا بھی ان سے ذکر نہیں کیا تھا جو اب میری دشمن بن چکی تھی اور کسی بھی مرحلے پر مجھ پر حملہ آور ہو سکتی تھی۔ یہ باتیں انہیں بتانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

دوسرے دن گل خان اور پروفیسر جمشید اپنے وقت پر مکان پر پہنچ گئے۔ وہ ناشتہ اور چائے کی تھرمس اپنے ساتھ لائے تھے۔ ناشتے کے بعد اصل موضوع پر گفتگو شروع ہو گئی۔ پروفیسر جمشید جیب سے رومال نکال کر عینک کے شیشے صاف کرتے ہوئے بولا۔

"تخریب کاری کا یہ ٹریننگ سنٹر یہاں سے شمال کی جانب پندرہ میل کے فاصلے پر ایک پرانے قلعے میں قائم کیا گیا ہے۔ اس کو خفیہ رکھنے کی خاطر باہر ایک چھوٹا سا بورڈ لگا دیا گیا ہے جس پر راشٹریہ سیوک سنگ لکھا ہوا ہے ظاہر یہ کیا گیا ہے کہ یہاں ہنگامی حالات میں شہر میں امن بحال رکھنے اور پبلک کی خدمت کے واسطے رضاکاروں کو ٹریننگ دی جاتی ہے۔"

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"لیکن پروفیسر اس تربیتی سنٹر میں بھرتی ہونے کی تو بڑی کڑی شرائط ہوں گی۔ میں وہاں کیسے بھرتی ہو سکوں گا"

اس پر گل خان مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

"یہ کام تم ہم پر چھوڑ دو۔ ہم جانتے ہیں کہ تمہیں اس سنٹر میں کیسے بھرتی کرایا جائے گا تمہیں صرف ایک کہانی گھڑنی ہو گی اور اسے اچھی طرح سے یاد کرنا ہو گا۔ کہانی یہ ہو گی کہ تم برہمن ہندو ہو۔ تمہارے ماتا پتا فسادات کے وقت پاکستان میں مارے گئے تھے۔ تم پاکستان سے اپنے ماتا پتا کا بدلہ لینا چاہتے ہو جس کی تم نے بچپن میں ہی قسم کھائی تھی۔ دلی میں ایک کانگریسی مسلمان ہے جو بدبخت مسلمان ہو کر بھی پاکستان کے خلاف ہے اور راشٹریہ سیوک سنگ کا بڑا چہیتا ہے ہم نے اس پر یہ ظاہر کیا ہوا ہے کہ ہم بھی نیشنلسٹ مسلمان ہیں اور کانگریس کو پسند کرتے ہیں اور پاکستان کے خلاف ہیں اس قسم کے آدمی سے دوستی کئے بغیر ہم پاکستان کے خلاف ان کے ناپاک عزائم سے باخبر نہیں ہو سکتے۔ اسی لئے ہم نے اس کٹر کانگریسی مسلمان کو اپنا ہمدرد بنا لیا ہوا ہے اس آدمی کا نام رحیم بخش ہے۔ تمہیں تخریب کاری کے تربیتی سنٹر میں بھرتی کروانے کے لئے ہم اس کانگریسی کی مدد لیں گے۔ پہلے ہم تمہیں اس سے ملائیں گے۔ تم اس کے آگے جو باتیں کرو گے وہ ہم تمہیں بتا دیں گے۔ ہمیں یہ بھی خبر مل چکی ہے کہ اس آدمی رحیم بخش کے کانگریسی تخریب کاری ٹریننگ سنٹر کے ڈائریکٹر لکشمی دیال سے گہرے تعلقات ہیں۔ ہمیں اس سلسلے میں مزید کچھ معلومات حاصل کر لینے دو۔ جیسے ہی ہماری معلومات مکمل ہو گئیں ہم تمہیں کانگریسی مسلمان کے پاس لے چلیں گے۔"

اس دن سے میرے نئے کمانڈو مشن پر کام شروع ہو گیا۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ اس دوران میں گل خان کی ہدایت کے مطابق مکان میں ہی بند رہا۔ اس کی ہدایت کے مطابق میں نے ہندی میں لکھی ہوئی گیتا کا مطالعہ بھی شروع کر دیا۔ ہندی زبان میں روانی سے پڑھ بھی لیتا تھا اور لکھ بھی لیتا تھا۔ گجرات میں میناکشی کے ہاں رہ کر میں نے گجراتی زبان بھی بولنی سیکھ لی تھی۔ ہندو دیومالا اور سنسکرت کا تفصیل

سے مطالعہ میں کشمیر کے بزرگ صوفی کی مدد سے کر چکا تھا۔ یہ باتیں میرے کمانڈو کیریئر کے لئے بہت ضروری تھیں۔ کیونکہ میں دشمن ملک میں تھا اور دشمن ملک میں رہتے ہوئے اور وہاں ان کے پاکستان دشمن عزائم کو تباہ کرنے کے لئے دشمن کی زبان اور اس کے کلچر کا جاننا بہت ضروری تھا۔ گل خان نے مجھے گیتا کی ایک چھوٹی سی کتاب بھجوا دی تھی۔ میں رات کے وقت موم بتی کی روشنی میں اسے کہیں کہیں سے پڑھ لیا کرتا تھا۔ اس مکان میں بتی نہیں تھی اور رات کے وقت میں موم بتی اس طرح روشن رکھ سکتا تھا کہ اس کی روشنی کھڑکیوں پر نہ پڑے۔

اس دوران گل خان اور پروفیسر جمشید کانگریسی مسلمان کے ساتھ اپنے مشن میں مصروف رہے۔ ایک ہفتے کے بعد گل خان اکیلا شام کے وقت میرے پاس آیا اور اس نے بتایا کہ پرانے قلعے والے ٹریننگ سنٹر میں میرے داخلے کے لئے راہ ہموار کر دی گئی ہے۔

"کل دوپہر کے بعد تم میرے ساتھ کانگریسی مسلمان رحیم بخش کے ہاں چلو گے۔ تمہارے بارے میں میں نے انہیں یہی بتایا ہے کہ تمہارا نام مرلی پرشاد ہے۔ تمہارے ماتا پتا لاہور میں فسادات میں مارے گئے تھے۔ تم آزادی ملنے کے بعد اب تک بھارت کے مختلف شہروں میں دربدر پھرتے رہے ہو۔ دلی میں تمہاری مجھ سے ملاقات ہو گئی۔ تم نے میرے آگے اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں پاکستان سے اپنے ماتا پتا کی موت کا بدلہ لینا چاہتا ہوں اور آگے میں بات کر لوں گا۔"

کچھ دیر تک مجھ سے باتیں کرتے رہنے کے بعد گل خان اگلے روز دوپہر کے بعد آنے کا کہہ کر چلا گیا۔ دوسرے روز وہ ٹھیک وقت پر میرے پاس پہنچ گیا۔ وہ میرے لئے تنگ موہری کا ہندوؤں والا پاجامہ اور کھدر کا کرتہ، نہرو کٹ جیکٹ اور کھدر کی کانگریسی ٹائپ کی صدری بھی لایا تھا۔ یہ کپڑے پرانے ہو رہے تھے۔ نئے نہیں تھے۔ میں نے اسی وقت انہیں پہن لیا۔ اس مشن کی راہ میں جو سب سے بڑا خطرہ در پیش تھا میں نے اس کے بارے میں گل خان سے کہا۔

"وہاں میری میڈیکل چیک اپ تو ضرور ہو گی۔ اس صورت میں میں اپنے مسلمان

ہونے کو نہ چھپا سکوں گا۔ بہتر ہوتا کہ مجھے کٹر کانگریسی مسلمان کی حیثیت سے متعارف کرایا جاتا۔"

گل خان نے کہا۔

"پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ لوگ کسی مسلمان کو خواہ وہ کتنا ہی کٹر کانگریسی کیوں نہ ہو بھرتی نہیں کرتے۔ یہ ان کا پہلا اصول ہے کہ تخریب کار ہندو ہی لیا جائے گا۔ وہ سکھ پر بھی بھروسہ نہیں کرتے۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ حقیقت میرے پیش نظر تھی۔ جس شخص کی سفارش پر تمہیں تخریب کاری کے تربیتی سنٹر میں بھرتی کرایا جا رہا ہے اس کا اس قدر اثر ورسوخ ہے کہ تمہارے میڈیکل چیک اپ کا مرحلہ ہی نہیں آئے گا۔ اس بارے میں میں نے پورا اطمینان کر لیا ہے۔"

"پھر میں تیار ہوں۔"

میں نے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ کچھ دیر کے بعد میں اور گل خان موٹر رکشا میں بیٹھے تھے اور رکشا دلی کے بازاروں میں دوڑتا چلا جا رہا تھا۔ کانگریسی مسلمان رحیم بخش کا مکان ہندوؤں کے محلے میں ایک مندر کے پہلو میں تھا۔ اس کے مکان کے باہر کانگریس کا جھنڈا لگا ہوا تھا۔ اس محلے میں داخل ہوتے وقت گل خان نے بھی جیب سے گاندھی کیپ نکال کر پہن لی تھی۔ اس نے دروازے پر دستک دی۔ ایک لڑکے نے دروازہ کھولا۔ گل خان نے اپنا نام بتایا اور کہا۔

"رحیم صاحب سے کہو کہ ہم ملنے آئے ہیں"

یہ تو میں آپ کو پہلے ہی بیان کر چکا ہوں کہ گل خان کا اصلی نام گل خان نہیں تھا اور پروفیسر جمشید کا بھی یہ نام نہیں تھا۔ میں نے ان کے فرضی نام لکھے ہیں۔ لڑکا اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد آیا اور ہمیں ایک کمرے میں بٹھا دیا۔ چھوٹا سا کمرہ تھا۔ کرسیاں اور صوفہ سیٹ پڑا تھا۔ دیواروں پر تمام کانگریسی لیڈروں کی تصویریں لگی تھیں۔ اتنے میں ایک پختہ عمر کا اکہرے بدن کا آدمی اندر داخل ہوا۔ اس کے سر پر گاندھی کیپ تھی۔ کھدر کا کانگریسی کرتہ پاجامہ پہن رکھا تھا۔ شکل ہی سے یہ شخص بد دماغ اور متعصب قسم کا

ہندو لگتا تھا حالانکہ وہ مسلمان کے گھر پیدا ہوا تھا۔ میں نے گل خان کی ہدایت کے مطابق اٹھ کر ہاتھ باندھ کر پرنام کیا۔ اس آدمی نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا اور ہاتھ سے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ گل خان نے بات شروع کر دی۔

"یہ ہے وہ نوجوان مرلی پرشاد جس کا میں نے تم سے ذکر کیا تھا۔ اس وقت بھارت ورش کو ایسے ہی نوجوانوں کی ضرورت ہے جو پاکستان کے دل سے دشمن ہوں۔ اس کے ماتا پتا کو مسلمانوں نے مار دیا تھا۔ یہ ان کا بدلہ پاکستان سے لینا چاہتا ہے۔"

ایک لمحے کے لئے میں حیران ضرور ہوا کہ گل خان جو پاکستان کا شیدائی بلکہ فدائی ہے پاکستان کے خلاف کس قسم کی زہریلی باتیں کر رہا ہے۔ مگر یہ ایک خاص حکمت عملی کے ماتحت سب کچھ ہو رہا تھا۔ میں نے فوراً کہا۔

"مہاراج! میرے دل میں تو مسلمانوں کے خلاف آگ لگی ہوئی ہے۔ میرے ماتا پتا لاہور میں مسلمانوں کی لگائی ہوئی گوالمنڈی کی آگ میں جل مرے تھے میں جب تک اس کا بدلہ نہیں لے لوں گا میری آتما کو چین نہیں ملے گا۔ میری آتما اگلے جنم میں بھی بھٹکتی رہے گی۔"

کانگریسی مسلمان نے ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"شانت رہو شانت رہو۔ تمہیں مسلمانوں سے بدلہ لینے کا پورا پورا موقع ملے گا۔ یہ بتاؤ تم بارہ برس تک کیا کرتے رہے کہاں کہاں رہے؟"

میں نے گھڑی ہوئی کہانی اس کے آگے بیان کر دی کہ میں آزادی کے وقت چھ سات برس کا تھا۔ بھارت میں آ کر کان پور اپنے چچا کے پاس چلا گیا۔ اس نے کچھ دنوں کے بعد گھر سے نکال دیا۔ پھر میں بھارت کے شہروں میں دربدر پھرتا رہا۔ اجین میں ایک سادھو نے مجھے اپنا بیٹا بنا لیا اور مجھے ہندی اور سنسکرت کی تعلیم دی۔ بس اسی طرح دربدری کرتا یہاں دلی آ گیا۔ یہاں آ کر معلوم ہوا کہ بھارت ماتا کو ایسے جوانوں کی ضرورت ہے جو پاکستان میں جا کر اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر مسلمانوں کے شہروں کے پل اڑائیں اور وہاں اگرواد یوں والا کام کریں تو میں نے خان سے بات کی اور یہ مجھے آپ کے پاس لے

آئے۔

میرے بڑے سوبھاگ ہوں گے کہ آپ کی مدد سے مجھے بھارت ماتا کی سیوا کرنے اور مسلمانوں سے بدلہ لینے کا موقع مل جائے گا۔"

کانگریسی مسلمان نے گل خان سے کہا۔

"لڑکا نوجوان ہے اور اس کے دل میں مسلمانوں کے خلاف آگ بھی بھڑک رہی ہے۔ ہمیں اس وقت ایسے ہی جوانوں کی ضرورت ہے اسے کل دن کے دس گیارہ بجے میرے پاس بھیج دینا۔ میں اسے سیوک سنگ کے ڈائریکٹر لکشمی دیال کے پاس لے چلوں گا۔ وہ بڑا دیکھ بھال کر جوان بھرتی کرتے ہیں۔ ان کا ریکارڈ بھی دیکھا جاتا ہے۔ مگر چونکہ یہ تمہارا آدمی ہے اور میں اس کے دل میں مسلمانوں کے خلاف بھڑکتی آگ کو دیکھ رہا ہوں اس لئے میں آج شام لکشمی دیال سے مل کر ساری بات طے کر لوں گا۔ تم سمجھو کہ مرلی پرشاد بھرتی ہو گیا ہے۔"

گل خان نے بھی خوشی کا اظہار کیا۔ میں نے اٹھ کر کانگریسی مسلمان کے پاؤں چھوئے۔ وہ بولا۔

"بس اب پاکستان کے مسلمانوں سے ایسا بدلہ لینا کہ لکشمی دیال خود تمہاری تعریف کرتا نظر آئے۔"

میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"بھگوان کی کرپا سے ایسا ہی ہو گا آپ نشچنت رہیں۔"

گل خان نے مجھے کہا۔

"مرلی پرشاد! تمہیں رحیم بھائی کے ذریعے مسلمانوں سے بدلہ چکانے کا سنہری موقع مل گیا ہے۔ اب تم جانو تمہارا کام۔"

کانگریسی مسلمان رحیم بخش نے کہا۔

"ٹھیک ہے کل اسی وقت آ جانا۔ اب جاؤ۔"

گل خان نے مجھے جانے کا اشارہ کیا۔ میں اٹھا۔ کانگریسی مسلمان کے پاؤں چھو کر

نمسکار کہا اور باہر نکل گیا۔ ہمارا پروگرام وہاں سے اکٹھے نکلنے کا تھا۔ مگر حالات ایسے بن گئے کہ مجھے اکیلے ہی وہاں سے نکلنا پڑا۔ میں بازار میں آکر مکان سے کچھ فاصلے پر ایک جگہ کھڑا ہو کر گل خان کا انتظار کرنے لگا۔ دس پندرہ منٹ کے بعد وہ بھی آگیا۔ میرے قریب آکر کہنے لگا۔

"کل تم اکیلے ہی یہاں آؤ گے۔ میں کل رات کو آؤں گا۔ اب تم مجھ سے الگ ہو جاؤ گے۔"

یہ کہہ کر وہ ایک طرف کو چل دیا۔ میں دوسری طرف چل دیا۔ ایک جگہ سے موٹر رکشہ لیا اور واپس بستی نظام الدین اولیا والے خالی مکان میں آگیا۔ مجھے صرف بدروح چندریکا کا دھڑکا لگا تھا۔ وہ میری کھلی دشمن بن چکی تھی۔ وہ نہ صرف یہ کہ میرا مشن تباہ کر سکتی تھی بلکہ مجھے بھی پکڑوا سکتی تھی۔ مجھے اگر کوئی چیز اس کے خلاف طاقت دیتی تھی تو وہ اپنے خدا پر میرا یقین ایمان تھا۔ میرا ایمان تھا کہ خدا کی مرضی کے بغیر وہ کچھ نہیں کر سکتی۔ اگر خدا کو منظور نہ ہوا تو اس کا وار مجھ پر چلے گا اگر خدا کو منظور ہوا تو چندریکا ایسی ایک ہزار بدروحیں بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔

اگلے روز میں ساڑھے دس بجے دن کانگریسی مسلمان کے گھر کے باہر موجود تھا۔ میں نے دستک دی۔ اسی لڑکے نے آکر دروازہ کھولا۔ مجھے دیکھ کر بولا۔

"اندر آجاؤ۔"

اس نے مجھے اسی کمرے میں بٹھا دیا اور بولا۔

"ابا ابھی آتے ہیں"

چند لمحوں کے بعد کانگریسی مسلمان رحیم بخش آگیا۔ میں نے ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ تیار تھا۔ کہنے لگا۔

"چلو آؤ۔ میرے ساتھ آؤ"

اس کے پاس ایک چھوٹی سی گاڑی تھی جو محلے سے باہر بازار میں ایک طرف کھڑی تھی۔ اس نے مجھے ساتھ بٹھایا اور گاڑی چل پڑی۔ وہ خود گاڑی چلا رہا تھا۔ سارا راستہ وہ

پاکستان کے لیڈروں کے خلاف اور کانگریسی لیڈروں کی حمایت میں باتیں کرتا رہا۔ میں حیران تھا کہ یہ شخص مسلمان کس طرف سے ہے۔ اگر یہ اس قسم کی باتیں کرتا ہے تو یہ ہندو کیوں نہیں ہو جاتا۔ اسے مسلمان کہلانے کا کوئی حق نہیں ہے۔ انڈیا میں اس قسم کے ہندو نما مسلمان سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔

ہماری گاڑی دلی شہر کے باہر شمال مغرب کی طرف نکل آئی۔

آزادی ملنے کے تیرہ سال بعد تک بھی ابھی اس علاقے میں نئی کالونیاں نہیں بنی تھیں۔ شہر کے قریب کا علاقہ ضرور پھیل رہا تھا۔ ہماری دونوں جانب کبھی کھیت آجاتے۔ کبھی ویران خشک میدان آجاتے۔ آخر پرانے قلعے کا وہ کھنڈر آگیا جس کے باہر راشٹریہ سیوک سنگ کا ہندی میں لکھا ہوا بورڈ لگا تھا۔ گاڑی قلعے کے احاطے میں جا کر ایک جانب رک گئی۔

احاطے میں کوئی آدمی نہیں تھا۔ قلعے کے بہت بڑے برآمدے میں سے ہوتے ہوئے کانگریسی مسلمان ایک کمرے کے باہر رک گیا۔ کمرے کا دروازہ بوسیدہ تھا اور اس پر چک پڑی ہوئی تھی۔ کانگریسی مسلمان نے چپڑاسی سے کہا۔

"صاحب سے کہو رحیم بخش آیا ہے"

وہ چک اٹھا کر اندر چلا گیا۔ اندر سے کسی مرد کی بھاری آواز آئی۔

"مہاشے رحیم بخش آجاؤ۔ اندر آجاؤ"

کمرے میں ایک چوڑی میز کے پیچھے کرسی پر ایک بھاری بدن والا سانولے رنگ کا آدمی بیٹھا تھا جس نے زعفرانی رنگ کی ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ دلی میں موسم بہار شروع ہو چکا تھا۔ دیوار کے ساتھ لوہے کی دو الماریاں کھڑی تھیں۔ وہ اٹھ کر رحیم بخش سے ملا۔ رحیم بخش نے اسے ہندوؤں کی طرح ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا تھا۔ میں نے بھی ہاتھ جوڑ کر نمسکار کہا اور ادب سے کھڑا رہا۔ رحیم بخش نے میری طرف اشارہ کیا اور کہا۔

"لکشمی دیال! تمہاری فوج کے لئے ایک اور مسلمانوں کا دشمن لایا ہوں۔ لو اسے سنبھالو۔ کل میں نے اس کے بارے میں تم سے بات کی تھی۔ یہ مرلی پرشاد ہے"

لکشمی دیال اس ٹریننگ سنٹر کا ڈائریکٹر تھا۔ اس نے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ میں بھرپور جوان تھا اور کمانڈو ٹریننگ نے میرے جسم کو طاقتور اور سڈول بنا دیا تھا۔ اس نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ رحیم بخش نے اس سے کہا۔

"میں نے تو اپنی پوری تسلی لی ہے۔ اب تم اپنی تسلی کر بھی کر لو۔ اس کے ماتا پتا فسادات میں لاہور کی گوالمنڈی کی آگ میں جل گئے تھے۔ یہ پاکستان کے مسلمانوں سے اپنا ماتا پتا کے خون کا بدلہ لینا چاہتا ہے۔ اس کو بتاؤ کہ بدلہ کس طرح لینا ہے۔"

لکشمی دیال کہنے لگا۔

"مہاشے رحیم بخش جی! تم اسے لائے ہو تم نے اگر اپنی تسلی کر لی ہے تو سمجھو کہ میری بھی تسلی ہو گئی۔"

مجھ سے مخاطب ہو کر اس نے پوچھا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"جی مرلی پرشاد"

"گوت کیا ہے؟"

میری جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو اس سوال پر تھوڑا ضرور گھبرا جاتا لیکن میں نے ہندو دھرم شاستروں کو پڑھا تھا میں نے فوراً جواب دیا۔

"جی کائستھ برہمن"

"ہوں۔ برہمن ہو۔"

"ہاں جی"

"دلی میں کہاں رہتے ہو؟"

اس کے جواب میں کانگریسی مسلمان نے کہا۔

ہمارے ایک بڑے اعتماد والے کانگریسی مسلمان دوست ہیں یہ ان کے پاس رہتا

تھا۔ کچھ دنوں سے یہ کسی ہوٹل میں رہ رہا ہے۔"

لکشمی دیال ڈائریکٹر نے کانگریسی مسلمان سے کہا۔

"رحیم بھائی ہمیں ایسے ہی زہریلے اور پاکستان کے دشمن جوانوں کی ضرورت ہے تم اسے ہمارے پاس چھوڑ جاؤ۔ اس کے بارے میں ہمیں کسی قسم کی چیکنگ وغیرہ کی ضرورت نہیں"

میں بے حد خوش ہوا۔ کانگریسی مسلمان نے میری طرف انگلی اٹھا کر کہا۔

"میاں میں تمہیں لکشمی دیال جی کے حوالے کر رہا ہوں۔ اب ان پر ثابت کر دو کہ تم پاکستان اور پاکستان کے مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن ہو۔"

میں نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"بھگوان کی دیا سے ایسا ہی کر کے دکھاؤں گا۔"

مگر دل میں کہا کہ ان لوگوں کو تو ایسا سبق سکھاؤں گا کہ یاد رکھیں گے۔ کانگریسی مسلمان مجھے اس ٹریننگ سنٹر میں چھوڑ کر چلا گیا۔ لکشمی دیال نے مجھے ایک انسٹرکٹر کے حوالے کر دیا جس نے میرے بازوؤں کے پٹھوں کو ٹٹول کر کہا۔

"تم باڈی بلڈر لگتے ہو"

میں نے ہندوؤں والی مکارانہ عاجزی سے کہا۔

"جی مجھے کثرت کرنے کا بڑا شوق ہے"

"ٹھیک ہے ہمیں ایسے نوجوان ہی چاہئیں مگر تمہارے دماغ میں چالاکی بھی ہونی چاہئے۔ ٹھیک ہے۔ اگر چالاکی نہیں ہو گی تو میں اس میں ڈال دوں گا۔ چلو"

وہ مجھے قلعے کی ایک بیرک میں لے گیا جہاں پہلے سے چار جوان فزیکل ٹریننگ کر رہے تھے۔ انہوں نے نیکریں اور ٹی شرٹیں پہنی ہوئی تھیں۔ میرے ہندو انسٹرکٹر کا نام کالی داس تھا۔ وہ کالے رنگ کا تھا۔ آنکھیں پیلی تھیں۔ شکل ہی سے عیار اور مکار لگتا تھا۔

اس نے ان چار جوانوں سے میرا تعارف کرایا۔ ان کی عمریں تیس اور چالیس کے

درمیان تھیں۔ میری طرح ان کے جسم سڈول نہیں تھے۔ یہ چاروں ہندو تھے اور راشٹریہ سیوک سنگ کے آدمی تھے۔ انہیں پاکستان میں جا کر تخریب کاری کی تربیت دی جا رہی تھی۔ دوسرے دن سے میری بھی ٹریننگ شروع ہو گئی۔ میرا خیال تھا کہ یہ کمانڈو ٹائپ کی ٹریننگ ہو گی۔ دوڑیں لگوائی جائیں گی دشمن پر پیچھے سے ایک دم حملہ کرنے اور چاقو چلانے کی تربیت دی جائے گی مگر ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ صرف جسمانی ورزش دن میں ایک گھنٹہ ضرور کرائی جاتی تھی۔ زیادہ زور بم لگانے اور بم لگانے کے بعد وہاں سے کس طرح فرار ہونا ہے اس پر دیا جاتا تھا۔ میرے لئے یہ معمولی بات تھی۔ ایک گھنٹہ خود اسلحہ چلانے اور نشانہ بازی سکھائی جاتی۔ میں پہلے ہی ان تمام چیزوں میں ماہر تھا۔ تین دن میں ہی انسٹرکٹر کالی داس کو معلوم ہو گیا کہ میں بڑا ہونہار تخریب کار ہوں۔ میرا نشانہ ٹارگٹ پر بالکل ٹھیک لگتا تھا۔ میں نہ صرف طے شدہ وقت میں پٹاخہ بم' نقلی پل اور نقلی عمارت کے اندر لگا آتا بلکہ اس طریقے سے بم لگا کر وہاں سے فرار ہوتا کہ خود کالی داس کو بھی ایک آدھ منٹ تک پتہ نہ چلتا کہ میں کس طرف چلا گیا ہوں۔

وہ مجھ سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے ٹریننگ کے پندرہ دن بعد ہی لکشمی دیال سے میری سفارش کرتے ہوئے مشورہ دیا کہ مجھے تخریب کاروں کی ٹیم کا ہیڈ بنا دیا جائے۔ ان لوگوں کو کیا خبر تھی کہ میں ایک اعلیٰ تربیت یافتہ کمانڈو ہوں۔ میں نے دست بدست فائیٹ میں بھی وہ کمال دکھایا کہ کالی داس حیران رہ گیا۔ کہنے لگا

"مرلی پرشاد! اگر مجھے تم ایسے دس بارہ جوان مل جائیں تو میں پاکستان میں تباہی مچا سکتا ہوں"

میں نے دل میں کہا "تباہی تو میں تمہارے ہندوستان میں مچاؤں گا۔ پاکستان کا تو تم بال بھی بیکا نہ کر سکو گے۔" اوپر سے کہا۔

"سر! آپ کا دھنواد!"

رات کو کھانے کے بعد کالی داس ہمیں پاکستان اور مسلمانوں کے خلاف آدھے گھنٹے کا ایک زہریلا لیکچر دیتا۔ مسلمانوں اسلام اور پاکستان کے خلاف وہ ایسی ایسی زہریلی باتیں کرتا

کہ میرا اس بات پر یقین مزید پختہ ہو گیا کہ پاکستان کا قیام مسلمانوں کے لئے بے حد ضروری تھا۔ جب ہماری ٹریننگ کو ایک مہینہ گزر گیا تو ہمیں تخریب کاری کی مہم پر جانے کا حکم مل گیا۔ اس دوران میں نے اس بات کی تصدیق کر لی تھی کہ پاکستان میں کوئی مسلمان تخریب کار نہیں ہے۔ وہاں صرف ایک ہندو تخریب کار ان کا جاسوس ہے جس نے ہمیں انڈیا پاکستان کے جموں کشمیر والے بارڈر پر ملنا تھا اور ہمیں بارڈر پار کروا کر ساتھ لے جانا تھا۔ اور آگے ہم پانچوں تخریب کاروں کو پاکستان کے مختلف شہروں میں بموں کے دھماکے کرنے کے لئے بھیجنا تھا۔ جس روز ہمیں ٹریننگ سنٹر سے اپنے مشن پر روانہ ہونا تھا اس دن ہمیں لکشمی دیال نے خود ایک لیکچر دیا اور کہا۔

"تم لوگ یہاں سے جموں توی جاؤ گے وہاں سے ہمارا خاص آدمی تمہیں ساتھ لے کر پاکستان کا بارڈر کراس کرائے گا اسلحہ اور ٹائم بم تمہیں ہمارا آدمی پاکستان کا بارڈر کراس کرنے کے بعد دے گا۔ اس کے پاس ٹائم بموں اور اسلحہ کا ذخیرہ موجود ہے۔ تم لوگ پاکستان کے شہروں میں ریلوے پلوں کو بم لگا کر اڑاؤ گے۔ لاریوں، بسوں ریلوے ٹرینوں اور سینما کی عمارتوں میں بموں کے دھماکے کرو گے۔ ہمارا جو آدمی تمہیں جموں میں ملے گا ہم تمہیں اس کا اصلی نام نہیں بتائیں گے۔ اس کا فرضی نام جیک ہو گا۔"

پھر لکشمی دیال نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"تمہارے پارٹی لیڈر مرلی پرشاد کو جیک کی تصویر دکھا دی جائے گی۔ جیک کو وائرلیس پر تمہارے آنے کی اطلاع کر دی گئی ہے۔ تم کل صبح منہ اندھیرے یہاں سے الگ الگ ہو کر ٹرین کے ذریعے جموں جاؤ گے۔ جموں توی کے ریلوے سٹیشن پر تمہارا پارٹی لیڈر مرلی پرشاد تمہیں ایک جگہ بٹھا کر خود پنجاب ہوٹل جائے گا جہاں جیک سے اس کی ملاقات ہو گی اس کے بعد جیک تمہاری راہ نمائی کرے گا
اب تم جا کر اپنے مشن پر روانہ ہونے کی تیاریاں شروع کر دو۔ تم اپنے ساتھ کوئی فالتو جوڑا نہیں لے جاؤ گے صرف پتلون اور جیکٹ پہن کر جاؤ گے کلاس ڈس مس۔"

چاروں تخریب کار ہندو اٹھ کر چلے گئے۔ لکشمی دیال اور انسٹرکٹر کالی داس مجھے ایک

کمرے میں لے گئے۔ یہاں لکشمی دیال ڈائریکٹر نے مجھے جیک کے فرضی نام والے ہندو تخریب کار کی فوٹو دکھائی۔

"اس کا اصلی نام تمہیں بھی نہیں بتایا جائے گا اس کی شکل دماغ میں بٹھا لو۔ یہ جیک ہے۔ یہ تمہیں جموں شہر کے پنجاب ہوٹل کے کمرہ نمبر 9 میں ملے گا۔ اس سے ملنے کے بعد تم وہی کرو گے جس طرح وہ کہے گا۔ کیا تم سمجھ گئے ہو؟"

میں نے کہا۔

"یس سر!"

"اوکے۔ کل صبح منہ اندھیرے کالی داس تمہیں لے کر سٹیشن کی طرف روانہ ہو گا اب تم بھی جا کر تیاری کرو۔"

قلعے میں پرانے حجرے بنے ہوئے تھے۔ ان کو لکڑی کے تختے لگا کر چھوٹے کمروں میں بدل دیا گیا تھا۔ ایک کمرہ مجھے ملا ہوا تھا۔ میں کمرے میں آ کر چارپائی پر لیٹ گیا اس دوران مجھے صرف ایک بار شہر دلی جانے کا موقع ملا تھا اور میں نے گل خان سے ایک خفیہ ملاقات کی تھی اور اسے ساری صورت حال سے آگاہ کیا تھا۔ اس نے مجھ سے ایک ہی بات پوچھی تھی۔

"تم ان لوگوں کے ساتھ کیا سلوک کرنے والے ہو؟"

میں نے کہا۔

"یہ میں ابھی خود بھی نہیں جانتا۔ اتنا ضرور ہے کہ ان میں سے کوئی ایک تخریب کار بھی اپنے مشن میں کامیاب نہ ہو سکے گا۔ کوئی ایک بھی پاکستان کے کسی شہر میں بم کا دھماکہ نہ کر سکے گا"

"کیا تم انہیں مار ڈالو گے؟ اگر ایسا کر بیٹھے تو یہاں لکشمی دیال کو تم پر ضرور شک پڑ جائے گا کہ تم پاکستان کے آدمی ہو۔ اس طرح ہو سکتا ہے کہ پولیس مجھے گرفتار کر لے۔ کیونکہ تمہیں میں لے کر کانگریسی رحیم بخش کے پاس گیا تھا۔ رحیم بخش کو تو پولیس نہیں پکڑے گی۔ یہ سوچ لینا۔"

میں نے کہا۔

"خان بھائی تم اس کی فکر نہ کرو۔ میں کوئی ایسا منصوبہ بناؤں گا کہ سانپ بھی مر جائے گا اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے گی۔"

گل خان بولا۔

"مجھے تم پر اعتماد ہے۔ بہرحال اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو بھی گئی تو میں اپنا بچاؤ کرنا جانتا ہوں۔ یہاں دلی میں میرے کانگریسی لیڈروں سے خاص تعلقات ہیں۔ یہ تعلقات میں نے اسی لئے بنائے ہوئے ہیں کہ اگر کبھی کوئی بات ہو جائے تو مجھ پر کوئی شک نہ کر سکے۔ تم جو کرو گے ٹھیک کرو گے۔ میں تمہاری سلامتی اور پاکستان کی سلامتی کے لئے دعا گو رہوں گا۔"

میں نے گل خان سے کہا۔

"اس مشن پر مجھے تمہارے دھماکہ خیز چیونگ گم بموں کی بجائے دھماکہ خیز محلول کی ضرورت پڑے گی۔ میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے اس محلول کی تھوڑی سی مقدار بنا کر دے دو۔"

گل خان اٹھ کر اندر گیا۔ اس وقت میں اس کے اپنے مکان میں بیٹھا تھا۔ اندر سے ایک نیلے رنگ کی شیشی لا کر اس نے مجھے دکھائی اور کہا۔

"یہ دھماکہ خیز محلول میں نے پہلے سے تیار کر کے رکھ لیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس مشن پر تمہیں اس کی ضرورت ہو گی۔"

اس نے ایک چھوٹی سی کالے رنگ کی شیشی میں دھماکہ خیز محلول ڈال کر اس کا پیچ دار ڈھکن بند کیا اور شیشی لفافے میں لپیٹ کر مجھے دیتے ہوئے کہا۔

"تم اچھی طرح سے جانتے ہو کہ اس کو کس طریقے سے استعمال کرنا ہے۔ صرف میں نے اس کا ٹائم بڑھا دیا ہے۔"

"کتنا ٹائم بڑھایا ہے؟" میں نے پوچھا۔

گل خان نے جواب میں کہا۔

"پہلے پانچ منٹ کا وقفہ ہوتا تھا۔ اب اسے بڑھا کر دس منٹ کر دیا ہے۔ اس محلول کا صرف ایک قطرہ پانی، شراب یا چائے میں ڈال کر دشمن کو پلا دو گے تو دس منٹ کے بعد اس کی آنکھیں سرخ ہو کر ابل پڑیں گی اور ساتھ ہی اس کا جسم دھماکے سے پھٹ جائے گا۔ اسے سنبھال کر رکھنا۔"

میں نے شیشی لے کر جیب میں رکھ لی تھی اور جس وقت تخریب کاری کے ٹریننگ سنٹر میں لکشمی دیال ڈائریکٹر ہمیں پاکستان اور مسلمانوں کے خلاف زہریلا لیکچر دے رہا تھا اس دھماکہ خیز محلول کی شیشی میری جیب میں موجود تھی۔ اس وقت میں نے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ اس مشن سے واپس آ کر میں پاکستان دشمن لکشمی دیال اور ٹریننگ سنٹر کے انسٹرکٹر کالی داس کو یہ دھماکہ خیز محلول ضرور چکھاؤں گا۔ تاکہ وہ بھی اس کے ذائقے سے تھوڑا واقف ہو جائیں۔

صبح صبح کالی داس ہمیں ٹریننگ سنٹر کے قلعے سے نکال کر ایک پرانی جیپ میں بٹھا کر دلی کے ریلوے سٹیشن کی طرف روانہ ہوا۔ وہ خود گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا ہم پانچوں تخریب کار پرانی پتلونوں اور معمولی سی جیکٹوں میں ملبوس خاموشی سے جیپ میں آمنے سامنے سر جھکائے بیٹھے تھے۔ ابھی دن نہیں نکلا تھا۔ دلی کی سڑکوں پر بجلی کی بتیاں روشن تھیں۔

ہمیں جموں توی ایکسپریس پکڑنی تھی۔ یہ ٹرین اس زمانے میں دلی سے صبح سوا چھ بجے چلتی تھی۔ کالی داس نے ہمیں تھرڈ کلاس کے پانچ ٹکٹ لے کر دیئے اور کہا۔

"تم لوگ الگ الگ ڈبوں میں بیٹھو گے۔ مگر ایک دوسرے کو اپنی نگاہ میں رکھو گے۔ صرف جموں توی کے سٹیشن کے باہر تم ایک جگہ اکٹھے ہو گے جہاں جیک آ کر تم میں شامل ہو جائے گا۔"

اس نے مجھ سے کہا۔

"مرلی پرشاد! جموں تک یہ لوگ تمہاری ذمے داری ہیں۔ تم ان کے پارٹی لیڈر ہو گے۔ جموں سے آگے جیک تمہارا پارٹی لیڈر ہو گا۔"

میں نے کہا۔

"او کے سر!"

کالی داس نے ٹکٹ ہمارے حوالے کئے اور کہا۔

"بھگوان تمہاری رکھشا کرے"

میں نے دل میں کہا۔ بھگوان تو تمہاری رکھشا کرے گا کہ کیا کسی نہ کی ہو گی۔ اوپر سے کہا۔

"تھینک یو سر۔"

کالی داس نے آہستہ سے کہا۔

"جے ھند"

ہم نے بھی منہ ہی منہ میں یہ الفاظ دہرا دیئے۔ میں نے بڑی مشکل سے یہ دونوں لفظ زبان سے ادا کئے۔ ہم پلیٹ فارم پر آکر الگ الگ ہو گئے۔ الگ ہونے سے پہلے میں نے چاروں ہندو تخریب کاروں سے کہا۔

"جموں توی کے سٹیشن کے باہر ملاقات ہو گی۔ لیکن میں راستے میں اتر کر تم لوگوں کا دور سے حال چال معلوم کر لیا کروں گا۔"

میں نے جب دیکھا کہ چاروں تخریب کار ٹرین کے الگ الگ ڈبوں میں داخل ہو گئے ہیں تو میں بھی ایک ڈبے میں گھس گیا۔ ٹرین ٹھیک وقت پر جموں توی کے لئے روانہ ہو گئی۔ یہ سفر کافی لمبا تھا۔ ٹرین دلی سے وایا سونی پت' کرنال ہوتی ہوئی جالندھر جاتی تھی۔ جالندھر سے یہ ہوشیار پور کی طرف لائن بدل لیتی تھی۔ سارا دن سفر جاری رہا۔ اس دوران میں راستے میں سونی پت' کرنال اور انبالہ کے سٹیشنوں پر اتر کر اپنے تخریب کار آدمیوں کو دور سے دیکھتا رہا۔ وہ لوگ بڑے اطمینان سے بیٹھے تھے۔ شام کے وقت جالندھر آیا۔ یہاں سے ٹرین نے ریلوے ٹریک بدلا اور آگے امرتسر جانے کی بجائے ہوشیار پور کی طرف روانہ ہو گئی۔ ہوشیار پور سے آگے بڑا سٹیشن جموں توی کا ہی تھا۔

رات کے آٹھ سوا آٹھ بج رہے تھے کہ ٹرین نے ہمیں جموں توی پہنچا دیا۔ ہم ایک ایک کر کے الگ الگ ہو کر سٹیشن سے باہر نکل آئے۔ ہم نے ایک دوسرے کو اپنی

نگاہوں میں رکھا ہوا تھا۔ میں ان کے آگے آگے تھا۔ میں ایک جگہ اندھیرے میں کھڑا ہو گیا۔ پروگرام کے مطابق چاروں ہندو تخریب کار میرے پاس آ گئے۔ میں نے انہیں کہا۔

"ہمارا ٹارگٹ پنجاب ہوٹل ہے۔ ہم الگ الگ اس ہوٹل کے کمرہ نمبر 9 میں جائیں گے۔ او کے؟"

سب نے دبی زبان سے کہا۔

"یس سر!"

اور ہم ایک بار پھر الگ الگ ہو گئے۔

میں اس سے پہلے جموں توی آ چکا تھا۔ میرے لئے یہ شہر نیا نہیں تھا۔ میں نے ایک رکشا پکڑا اور اسے پنجاب ہوٹل چلنے کو کہا۔ پنجاب ہوٹل درمیانے درجے کا دو منزلہ ہوٹل تھا۔ میں نے کمرہ نمبر 9 کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے آواز آئی۔

"کون ہے؟"

میں نے کہا۔

"دلی سے آپ کا ایک مہمان آیا ہے"

دروازہ کھل گیا۔ میرے سامنے درمیانے قد کا گھٹے ہوئے جسم والا ایک پکی عمر کا آدمی کھڑا مجھے گھور رہا تھا۔

"کون ہو تم؟"

میں نے کالی داس کا بتایا ہوا کوڈ ورڈ بتایا تو وہ آدمی دروازے سے پیچھے ہٹ گیا اور بولا

"اندر آجاؤ۔ میرا نام جیک ہے"

کمرہ بے ترتیب چیزوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے کرسی پر سے چادر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"بیٹھ جاؤ۔ باقی لوگ کہاں ہیں؟"

میں نے کہا۔

"وہ الگ الگ کر کے آئیں گے۔"

جیک نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"مجھے معلوم ہے مجھے معلوم ہے۔ مجھے سمجھانے کی کوشش نہ کرو۔ تم نئے رنگروٹ لگتے ہو کیا تم پارٹی لیڈر ہو؟"

"ہاں"

"مرلی پرشاد تمہارا نام ہے؟"

"جی ہاں۔"

جیک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"مجھے کالی داس نے تمہارا ریکارڈ بھجوا دیا تھا تمہارے ماتا پتا گوالمنڈی کی آگ میں جل کر سورگباش ہوئے تھے کیا؟"

"یس سر!"

"ٹھیک ہے۔ تم لاہور جاؤ گے اور گوالمنڈی کے اندر کسی بڑی دکان میں اکٹھے دو ٹائم بم لگا کر دھماکہ کرو گے۔ تمہیں اس سے ضرور خوشی ہو گی"

"کیوں نہیں۔ میں تو مسلمانوں سے اپنے ماتا پتا کی مرتیوں کا بدلہ لینا چاہتا ہوں۔ اس سے اچھی اور کون سی بات ہو گی کہ جہاں میرے ماتا پتا کو جلایا گیا تھا وہیں میں اپنے دشمنوں کو بھسم کروں"

جیک اس دوران میری طرف مسلسل گھور کر دیکھتا رہا۔ مجھے ایسے لگ رہا تھا جیسے اس کی آنکھیں میرے چہرے کے پیچھے چھپے ہوئے کسی راز کو تلاش کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ میں نے دل میں کہا تم کیا تمہارے والد صاحب بھی اس راز کو معلوم نہیں کر سکتے جو میرے چہرے کے پیچھے چھپا ہوا ہے۔ آدھے گھنٹے کے اندر اندر ایک ایک کر کے ہمارے باقی تخریب کار ساتھی بھی آ گئے۔ ہم سب نے مل کر کھانا کھایا۔ کھانا ہندوؤں والا تھا۔ یعنی دال اور چھوٹی چھوٹی روٹیاں بلکہ چپاتیاں اور موٹے چاول اور دہی۔ مجھے دل میں گل خان کے ساتھ کھائے ہوئے مرغ روسٹ یاد آ رہے تھے۔ کھانے کے بعد چائے آ گئی۔ میں نے پارٹی لیڈر کی حیثیت سے جیک سے پوچھا۔

"سر! یہاں سے ہمیں کس وقت نکلنا ہو گا"

جیک نے مجھے ایک بار پھر گھور کر دیکھا۔ صاف لگ رہا تھا کہ کسی وجہ سے میں اسے پسند نہیں آیا۔ کہنے لگا۔

"تمہیں یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود بتا دوں گا۔ اور اب تم پارٹی لیڈر نہیں ہو۔ اب تمہارا لیڈر میں ہوں۔ آگے میرا حکم چلے گا۔ جیسے میں کہوں گا ویسے ہی تمہیں کرنا ہو گا۔"

میں نے کہا۔

"یس سر! جیسی آپ کی آگیا"

پارٹی لیڈر جیک جو شکل صورت سے باتوں سے اور اپنے زہریلے رویے سے بھی بڑا سخت متعصب ہندو لگتا تھا ہم سب کو ایک ساتھ مخاطب کر کے کہنے لگا۔

"تم لوگ آج رات اور کل کا دن آرام کرو گے۔ کل اندھیرا ہوتے ہی ہم یہاں سے چل پڑیں گے۔ کل کا سارا دن میری اجازت کے بغیر کوئی ہوٹل سے باہر نہیں جائے گا۔ یہ جموں کشمیر کا علاقہ ہے یہاں دشمن کے جاسوس ہمیں دیکھ سکتے ہیں۔"

رات کو ہم ایک ہی کمرے میں زمین پر چادریں لے کر لیٹ گئے۔ میں نے سوچا کہ اس آدمی جیک سے جس کا اصلی ہندوانہ نام مجھے آج تک معلوم نہیں ہو سکا' اس کے ساتھ جتنی زیادہ دوستی ڈالی جا سکتی ہے ڈال کر اس سے یہ پتہ کرنا چاہئے کہ پاکستان میں جو ہمارا ہندو جاسوس تخریب کار بیٹھا ہوا ہے اور جس کے ساتھ وہاں جا کر ہم نے رابطہ پیدا کرنا ہے اس کا نام کیا ہے اور وہ پاکستان کے کس شہر میں کس خفیہ نام اور بھیس میں رہ رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ مسلمان بن کر ہی پاکستان میں رہ رہا ہو گا۔ یہ اطلاعات مجھے جیک سے ہی مل سکتی تھیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں اس انڈین تخریب کار کو بھی ان تخریب کاروں کے ساتھ ہی ہلاک کرنا چاہتا تھا اگر میں ان چاروں کو ہلاک کر کے اس ہندو تخریب کار کی تلاش میں پاکستان میں داخل ہو گیا تو میں اسے وہاں زندہ تو بالکل نہیں چھوڑوں گا مگر پھر میرے لئے واپس انڈیا کا بارڈر کراس کرنا مشکل ہو جائے گا۔ میں کسی حکومت کا

جاسوس تو تھا نہیں کہ حکومت بارڈر کراس کرانے میں میری مدد کرتی۔ میں تو یہ ساری کارروائیاں محض اپنے بل بوتے پر اور اپنے باپ کی وصیت پوری کرنے کے لئے اور میرے دل میں اسلام، جہاد کشمیر اور پاکستان کی سلامتی اور استحکام کا جو جذبہ تھا صرف اس کی وجہ سے کر رہا تھا۔

میں نے سوچا کہ پاکستان میں مقیم ہندو تخریب کار کا کم از کم پتہ لگ جانا چاہیے۔ پھر میں کسی دوسرے طریقے سے اسے وہیں گرفتار کروانے یا ختم کرانے کی کوشش کروں گا۔ میں نے جیک کے ساتھ حد سے زیادہ خوشامدانہ رویہ اختیار کر لیا۔ خود اس کو چائے بنا کر دی۔ وہ سگریٹ سلگانے لگا تو میں نے جلدی سے ماچس جلا کر اس کے سگریٹ کو سلگا دیا۔ خوشامد بڑا خطرناک ہتھیار ہوتا ہے۔ یہ پتھر میں بھی سوراخ کر دیتا ہے۔ میرے خوشامدانہ رویے نے بڑی جلدی اثر دکھانا شروع کر دیا۔ جیک کی توجہ میری طرف ہونے لگی۔ وہ ہم سے کوئی بات کر رہا ہوتا یا ہمیں کچھ سمجھا رہا ہوتا تو میری طرف توجہ زیادہ دیتا۔ میں نے اس پر مزید اثر ڈالنے کے لئے مسلمانوں اور پاکستان کے خلاف باتیں شروع کر دیں۔ میں نے اسے بڑے کم عرصے میں یقین دلا دیا کہ میں ایک کٹر برہمن ہندو ہوں اور میرے دل میں پاکستان کے مسلمانوں سے اپنے فرضی ماتا پتا کے جل مرنے کا بدلہ لینے کی آگ بھڑک رہی ہے۔

رات کے پہلے پہر جب ہمارے دوسرے ساتھی سو گئے تو میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کمرے کی بتی جل رہی تھی۔ جیک کونے والی چھوٹی میز پر ایک نقشہ رکھے اس کو جھک کر دیکھ رہا تھا۔ میں نے سگریٹ جلایا تو اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"نیند نہیں آ رہی مرلی پرشاد؟"

میں نے کہا۔

"بھاپا جی! جب تک میں پاکستان کے مسلمانوں سے اپنے سورگباشی ماتا پتا کے خون کا بدلہ نہیں لے لوں گا۔ مجھے نیند نہیں آ سکتی۔"

جیک نے نقشہ تہہ کر کے پلاسٹک کے لفافے میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"بہت جلد تمہیں اس کا موقعہ ملنے والا ہے تمہیں اپنے پرانے محلے گوالمنڈی میں کسی دکان میں ہی بم لگانے ہوں گے۔ تمہارا گھر گوالمنڈی میں ہی تھا ناں؟"

"ہاں۔ گوالمنڈی کی آگ میں ہی وہ جل مرے تھے۔"

جیک نے بھی سگریٹ سلگا لیا اور کرسی پر بیٹھے بیٹھے اپنا رخ میری طرف کر لیا۔

"تم نے پہلے کبھی بم لگائے ہیں؟"

میں نے ان جان بنتے ہوئے کہا۔

"یہ کام میں نے پہلے تو کبھی نہیں کیا مگر چنتا نہ کریں۔ یہ کام میں بڑی ہوشیاری سے کروں گا۔"

"بس تمہیں بموں والا بریف کیس گوالمنڈی کی کسی دکان میں لے جا کر کسی ایسی جگہ رکھنا ہو گا جہاں آتے جاتے کسی کی نظر نہ پڑے۔"

مجھے لاہور والے ہندو تخریب کار کے بارے میں بات کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ میں نے جیک سے پوچھا۔

"کیا لاہور میں ہمیں اپنا لاہور والا جاسوس گائیڈ کرے گا؟"

"ہاں۔ وہی کرے گا۔"

میں نے پوچھا۔

"وہ ہمیں لاہور میں ہی ملے گا کیا؟"

جیک نے ہلکا سا کش لگا کر کہا۔

"نہیں۔ وہ ہمیں بارڈر کراس کر کے انڈیا کے ایک گاؤں میں ملے گا۔ اس کو اطلاع مل چکی ہے۔ جس وقت ہم وہاں پہنچیں گے وہ وہاں موجود ہو گا۔"

میں نے یہ معلوم کرنے کے لئے کہ پاکستان میں ان لوگوں نے اور کون کون سے ہندو تخریب کار کہاں کہاں تعینات کر رکھے ہیں جیک سے کہا۔

"میں تو کہوں گا بھاپا جی کہ ہمیں پاکستان کے ہر شہر ہر قصبے میں اپنے آدمی رکھنے چاہئیں جو ہر روز بم کا ایک ایک دھماکہ کریں۔"

جیک خاموش رہا۔ میں نے موقع مناسب جان کر وہ سوال کر دیا جو حقیقت میں پوچھنا چاہتا تھا۔

"بھاپا جی! اس وقت پاکستان میں ہمارے بھگوان کی کرپا سے کتنے آدمی کام کر رہے ہیں؟"

جیک میرے جال میں آگیا۔ کہنے لگا۔

"اس وقت تو یہی نندلال ایک ہی آدمی لاہور میں ہے۔ مگر ہمارا پروگرام پاکستان کے ہر شہر میں اپنے اگروادی جاسوس رکھنے کا ہے۔"

میرے خوشامدانہ سلوک نے اس ہندو تخریب کار جیک کی عقل پر پردہ ڈال دیا تھا۔ اس نے مجھے پاکستان میں کام کرنے والے تخریب کار ہندو کا نام بھی بتادیا۔ میں نے یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ مجھے اس موضوع سے کوئی زیادہ دلچسپی نہیں ہے جلدی سے بات کا موضوع ہی بدل دیا اور اس سے کہا۔

"پاکستان کے بارڈر پر سیکورٹی تو بہت ہو گی۔ ہم بارڈر کراس کر جائیں گے نا؟"

جیک نے جواب میں ہلکی سی جمائی لے کر کہا۔

"نندلال تم لوگوں کو ایسی جگہ سے بارڈر کراس کرائے گا جہاں کوئی خطرہ نہیں ہو گا۔ وہ پہلے بھی ہمارے آدمی بارڈر پار لے جاتا رہا ہے۔"

"پھر ٹھیک ہے۔" میں نے اپنی طرف سے بڑے اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

جیک کرسی سے اٹھ کر بستر پر لیٹ گیا۔

"مجھے نیند آرہی ہے۔ تم بھی سو جاؤ۔"

کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ یہ جموں شہر کی خنک رات تھی۔ میں پہلے بھی اس شہر میں آتا جاتا رہا تھا۔ سردیوں کا موسم نکل رہا تھا۔ جموں کی رات ہلکی خنک تھی۔ اتنی کہ کمرے کا پنکھا نہیں چل رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں ہمارے ہندو تخریب کار گائیڈ جیک کے خراٹوں کی آواز آنے لگی۔ میری پتلون کی جیب میں دھماکہ خیز محلول کی کالی شیشی موجود تھی میں ان سب کی ایک ایک کر کے گردنیں توڑ کر انہیں موت کی نیند سلا سکتا تھا۔

مجھے اس ہندو تخریب کار نندلال کو بھی ہلاک کرنا تھا جس کو بھارتی خفیہ ایجنسی را نے لاہور میں تخریب کاری کے لئے لگا رکھا تھا۔ اور نندلال نے ہمیں پاکستان کے بارڈر پر انڈیا کی سرزمین پر واقع ایک سرحدی گاؤں میں ملنا تھا۔ اس وقت تک ان لوگوں کا زندہ رہنا ضروری تھا۔ کیونکہ ان کے ساتھ ہی میں نندلال سے ملاقات کر سکتا تھا۔ چنانچہ میں دل میں مختلف منصوبے تیار کرنے لگا کہ انڈیا کے سرحدی گاؤں میں نندلال سمیت ان سب کو ایک ہی وقت میں کس طرح ہلاک کیا جا سکتا ہے۔ اور اس کے بعد کیا میں واپس ان لوگوں کے پاس جا سکوں گا جنہوں نے مجھے ہندو سمجھ کر پاکستان میں تخریب کاری کے لئے بھیجا تھا۔ جب کہ مزید تخریب کاری کے منصوبوں کو خاک میں ملانے کے لئے میرا ان کے پاس واپس جانا ضروری تھا۔ یہی کچھ سوچتے سوچتے مجھے نیند آگئی۔

دوسرا دن اس طرح گزرا کہ ہم پانچ تخریب کار ہوٹل کے کمرے میں بیٹھے رہے اور ہمارا ہندو لیڈر جیک یہ کہہ کر باہر چلا گیا کہ اسے کچھ ضروری انتظامات کرنے ہیں۔ وہ دوپہر کے بعد آیا۔ کہنے لگا۔

"سورج غروب ہونے کے بعد ہم یہاں سے چلیں گے۔ حالات بالکل ٹھیک ہیں کل سے سرحدوں پر کوئی جھڑپ بھی نہیں ہوئی۔"

جیک کو اب مجھ پر بڑا اعتماد ہو گیا تھا۔ دھماکہ خیز مواد کے بارے میں میرے بعض مشوروں نے اسے کافی متاثر کیا تھا۔ میں نے اس کو سگریٹ پیش کیا تو وہ بولا۔

"مرلی پرشاد! تم میرے پیچھے پیچھے آؤ گے۔"

اس نے باقی تخریب کاروں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"سن لو۔ اگر میں پہاڑوں میں ادھر ادھر ہو گیا تو مرلی پرشاد تمہارا لیڈر ہو گا۔"

میں نے سر ہلا کر کہا۔

"ٹھیک ہے سر۔"

سورج ابھی پوری طرح غروب نہیں ہوا تھا کہ ہماری پارٹی پاکستان کے بارڈر کی طرف روانہ ہو گئی۔ ہم دو دو ایک ایک کر کے ہوٹل سے نکلے۔ جیک نے ہمیں جموں شہر

سے باہر ایک جگہ اکٹھے ہونے کے لئے کہہ دیا تھا۔ جیک نے مجھے اپنے ساتھ ہی رکھا۔ ہم بازاروں میں پیدل چلتے شہر کے مضافات میں سے ہوتے ہوئے میدان میں آ گئے جہاں کہیں کہیں جوار کے کھیت تھے۔ دور پہاڑیوں کے پیچھے سورج ڈوب رہا تھا۔ ہم ایک جوہڑ کے پاس آکر رک گئے۔ تھوڑی دیر میں ہمارے دوسرے ساتھی بھی ایک ایک کر کے آ گئے۔ یہاں سے ہم اکٹھے مل کر چل پڑے۔ جیک کو سارے راستے کا علم تھا۔ وہ اصل میں ایک تجربہ کار پرانا سمگلر ہندو تھا جو بارڈر پر سمگلنگ کیا کرتا تھا۔ را کی ایجنسی کے کارندوں نے اس کی اچھی طرح سے جانچ پڑتال کر کے اسے بھاری معاوضے پر اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔

سورج پہاڑیوں کے پیچھے گیا تو میدان اور کھیتوں پر اندھیرا سا چھا گیا۔ ہم کھیتوں کے درمیان ایک کچے راستے پر جا رہے تھے۔ ہم خاموش تھے۔ جیک آگے آگے تھا۔ میں اس کے پیچھے تھا اور باقی چاروں تخریب کار تھوڑا تھوڑا فاصلہ ڈال کر ہمارے پیچھے چلے آ رہے تھے۔ ہمارے پاس کوئی اسلحہ وغیرہ نہیں تھا۔ ہمارے لباس دیہاتی ٹائپ کے نہیں تھے بلکہ ہم نے میلی کچیلی پرانی پتلونیں پہنی ہوئی تھیں۔ یہ لباس ہمیں اس لئے پہنایا گیا تھا کہ ہمیں یہاں سے پاکستان کا بارڈر کراس کر کے سیدھا لاہور شہر میں داخل ہونا تھا۔ جیک کو معلوم تھا کہ ہمیں کس کس علاقے سے گزرنا ہے۔ ہم نیم میدانی علاقے سے گزر رہے تھے۔ کہیں کہیں درختوں کے جھنڈ آجاتے تھے۔ اس کے بعد خشک جھاڑیوں والے بنجر میدان شروع ہو جاتے تھے۔ پہاڑیاں بھی زیادہ تر خشک تھیں۔ اور ابھی دور دور تھیں۔ ہم ان ہی کی طرف جا رہے تھے۔ ہم دو ڈھائی گھنٹے چلتے رہے۔ رات ہو گئی تھی۔ چونکہ جیک سارے پہاڑی رستوں سے واقف تھا اس لئے ہمیں چلنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ وہ لوگ چلتے چلتے تھک گئے۔ میں بالکل نہیں تھکا تھا۔ مجھے ہوشنگ آباد والے مرد مومن شاہ کمال نے دس دس بارہ بارہ میل پیدل دوڑا دوڑا کر گھوڑا بنا دیا ہوا تھا۔ جیک بھی تھک گیا تھا۔ یہ لوگ سمگلر ٹائپ کے لوگ تھے جنہیں صرف بموں لاریوں کے اڈوں کاروباری مراکز اور شاپنگ سنٹروں میں بم لگانے اور وہاں سے نکل آ

کی ہی تربیت دی گئی تھی۔

ایک کنوئیں پر آکر ہم بیٹھ گئے۔ جیک نے کہا۔

"یہاں ہم پندرہ منٹ ریسٹ کریں گے۔"

اس نے ایک تھیلے میں سے بھنے ہوئے چنے نکال کر ہمیں دیئے ہم نے کنوئیں میں سے پانی نکال کر پیا۔ منہ ہاتھ دھویا۔ میں نے جیک سے پوچھا۔

"سر! ہم ٹھیک ٹارگٹ کی طرف جا رہے ہیں ناں؟"

وہ بولا۔

"یہ سارا رستہ میرا جانا پہچانا ہے۔ میں کئی بار یہاں سے گزرا ہوں۔"

میں مطمئن ہو گیا۔ ہم نے ایک ایک سگریٹ پیا۔ جیک نے مغرب کی جانب پہاڑیوں کے سیاہ خاکوں کی طرف اشارہ کیا۔

"ان پہاڑیوں کی دوسری جانب پاکستان کا بارڈر ہے۔ ہم کل شام کے وقت وہاں پہنچیں گے۔ ہمارا آدمی نندلال وہیں ہمیں ملے گا۔"

سگریٹ ختم کر کے ہم پھر چل پڑے۔

آدھی رات تک چلتے رہے۔ اب ہم پہاڑیوں کے درمیان آ گئے تھے۔ ان پہاڑیوں کی ڈھلانوں پر رات کے اندھیرے میں چھوٹے قد کے درختوں کے دھبے نظر آ رہے تھے۔ رات کے دو بجے تک ہم ان پہاڑیوں میں چلتے رہے۔ اس کے بعد ایک دریا آ گیا۔ میں اسے دریا سمجھا۔ مگر جیک نے کہا کہ یہ دریا نہیں ہے پہاڑی نالہ ہے۔ دور پہاڑیوں کے درمیان گہری کھائی میں یہ نالہ شور مچاتا بہہ رہا تھا۔ ہم نے ایک پل پر سے نالے کو عبور کیا۔ نالے کے دوسرے کنارے پر جا کر ہم تھوڑی دیر آرام کرنے کے لئے بیٹھ گئے۔ دس پندرہ منٹ بعد دوبارہ سفر شروع ہو گیا۔

اسی طرح ہم ان چھوٹی بڑی پہاڑیوں کے درمیان صبح ہونے تک چلتے رہے۔ جب صبح کی روشنی نمودار ہوئی تو منظر کافی بدل چکا تھا۔ پہاڑی سلسلہ ختم ہو رہا تھا اور میدانی علاقہ شروع ہو رہا تھا۔ جیک کہنے لگا۔

”تھوڑی دور آگے ایک گاؤں ہے تم لوگ گاؤں کے باہر ایک جگہ چھپ کر بیٹھو گے۔ میں گاؤں سے تمہارے لئے کچھ کھانے پینے کے لئے لاؤں گا۔“

ہم تھوڑی دور گئے تو دور درختوں کے جھنڈ کے پاس گاؤں کے کچے مکان دکھائی دیئے۔ کھیتوں میں دو تین کسان ہل چلاتے بھی دکھائی دیئے۔ جیک نے ہمیں ایک طرف جھاڑیوں کی اوٹ میں بیٹھنے کو کہا اور خود گاؤں کی طرف چل دیا۔ کچھ دیر بعد وہ ہمارے لئے لسی کا کٹورا اور جوار کی روٹیاں اور ساگ لے کر آگیا۔ ہم سب نے ساگ روٹی کھائی۔ لسی پی۔ جیک کہنے لگا۔

”یہاں کا ایک زمیندار ہمارا اپنا آدمی ہے وہ سکھ ہے اور سمگلر ہے۔ اب ہم یہاں دو گھنٹے آرام کریں گے۔“

جھاڑیوں کے درمیان زمین پر خشک گھاس اگ رہی تھی۔ ہم وہیں لیٹ گئے۔ رات بھر کے تھکے ہوئے تھے۔ سو گئے۔ جس وقت میری آنکھیں نیند سے بند ہو رہی تھیں میں نے دیکھا کہ جیک جاگ رہا تھا اور سگریٹ سلگائے دور ایک طرف دیکھ رہا تھا۔ ہم نے ڈیڑھ دو گھنٹے سو کر آرام کیا اور تازہ دم ہو کر آگے چل پڑے۔

یہ علاقہ اس قسم کا تھا۔ کہ کہیں زمین اونچی ہو جاتی تھی اور کہیں میدان آجاتا تھا۔ پہاڑیاں ہماری داہنی جانب پیچھے رہ گئی تھیں۔ میں اس علاقے کو اپنے ذہن میں اچھی طرح یاد کرتا جا رہا تھا۔ کیونکہ واپسی پر مجھے اسی علاقے سے اپنے منصوبے اور سکیم کے مطابق اکیلا ہی واپس آنا تھا۔ اسی طرح چلتے چلتے اجاڑ علاقوں میں سے گزرتے شام کے سائے پھیلنے لگے۔ یہاں پہلی بار ہمیں کھیتوں میں کچھ فاصلے پر ایک فوجی جیپ جاتی نظر آئی۔

جیک نے مجھے کہا۔

”ہم انڈین بارڈر کے قریب پہنچ گئے ہیں اب ہمیں احتیاط سے کام لینا ہو گا۔ یہ انڈین بارڈر فورس کی جیپ تھی۔ یہ لوگ ہمارے دیش کے سپاہی ہیں مگر یہ ہمیں پوچھ گچھ کے لئے روک سکتے ہیں۔“

یہاں سے ہم نے راستہ تبدیل کر لیا اور چھوٹے چھوٹے ٹیلوں کی طرف چلنے لگے۔ ان ٹیلوں میں چلتے چلتے رات کا اندھیرا ہو گیا۔ جیک نے ایک جگہ ہم سب کو روک دیا اور بولا۔

”یہاں سے پاکستان کا بارڈر دو چار فرلانگ کے فاصلے پر ہی ہے۔ اب ہم میں سے کوئی سگریٹ نہیں پیئے گا ماچس نہیں جلائے گا۔ یہ چیزیں دور سے دیکھی جا سکتی ہیں۔ بارڈر سیکورٹی فورس کی پارٹیاں رات کے گشت پر ہوتی ہیں۔“

وہ ہمیں لے کر ٹیلوں کے درمیان دشوار گزار راستوں سے گزارتا ہوا ایک کھلی جگہ پر آگیا۔ آسمان پر ستارے چمک رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد زرد رنگ کا غیر مکمل سا چاند مغرب کی طرف اوپر آگیا۔ اس کی پھیکی روشنی میں میں نے ایک جانب درختوں کا جھنڈ دیکھا جیک ہمیں اسی جھنڈ کی طرف لے جا رہا تھا۔ جب یہ جھنڈ ہماری بائیں جانب رہ گیا تو سامنے ایک مکان کی دیوار نظر آئی۔ جیک نے آہستہ سے کہا۔

”یہاں بیٹھ جاؤ۔ میں اکیلا مکان میں جاؤں گا۔“

ہم وہیں زمین پر بیٹھ گئے۔ جیک مکان کی طرف چلا گیا۔ پھیکی چاندنی میں وہ مکان کے پاس جا کر جیسے غائب ہو گیا۔ یقیناً یہ وہی مکان تھا جہاں نندلال ہندو تخریب کار لاہور سے آکر ہمارا انتظار کر رہا تھا اور جس نے آگے اپنی راہ نمائی میں ہمیں پاکستان کا بارڈر کراس کرا کے لاہور لے جانا تھا۔ کچھ دیر کے بعد جیک مکان سے نکل کر ہماری طرف آتا نظر آیا۔ اس نے بتایا کہ پاکستان سے ہمارا آدمی یعنی ہندو تخریب کار نندلال آگیا ہوا ہے۔

”میرے ساتھ آجاؤ“

ہم سب اس کے پیچھے مکان کی طرف چل پڑے۔ میرے سمیت ہم کل چھ آدمی تھے۔ ایک چھوٹی سی کوٹھڑی میں لالٹین جل رہی تھی۔ چارپائی پر ایک آدمی بیٹھا تھا۔ وہ ہمیں دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ جیک نے میرا اس سے خاص طور پر تعارف کرایا۔ یہ نندلال ہی تھا۔ جوان آدمی تھا۔ اس نے نسواری رنگ کا شلوار قمیض کا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ سر پر جناح کیپ تھی۔ گویا اس ہندو تخریب کاروں کے لیڈر نے اپنا پورا حلیہ پاکستانی مسلمانوں

والا بنایا ہوا تھا۔ ہم زمین پر اور جیک اور نندلال چارپائی پر بیٹھ گئے۔ جیک نے پوچھا۔

"سب ٹھیک ہے؟"

"سب ٹھیک ہے۔ ہم رات کے پچھلے پہر بارڈر کراس کریں گے۔"

جیک بولا۔

"ٹھیک ہے۔ اسلحہ کہاں ہے؟"

نندلال نے چارپائی کے نیچے سے ایک تھیلا کھینچا۔ اس میں دو سٹین گنیں تھیں۔ جیک نے سٹین گن کا میگزین چیمبر چیک کیا۔

"میگزین لوڈ ہے۔ خیال رکھنا"

جیک نے سٹین گن گھٹنوں پر رکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے معلوم ہے۔ میں کوئی اناڑی نہیں ہوں۔ یہ بتاؤ کہ بارڈر پر کوئی سپیشل پٹرولنگ تو نہیں ہو رہی؟"

"میں نے سب چیک کر لیا ہے۔ معاملہ ٹھیک ٹھاک ہے۔"

جیک بولا۔

"سارے ٹارگٹ لاہور کے ہیں کہ دوسرے شہر بھی شامل ہیں؟"

تخریب کار نندلال نے کہا۔

"ایک ٹارگٹ لاہور کا ہے۔"

جیک نے میری طرف اشارہ کر کے کہا۔

"لاہور کا ٹارگٹ مرلی پرشاد کا ہے۔ یہ گوالمنڈی میں بم کا دھماکہ کرے گا۔ باقی کون کون سے شہر ہیں۔؟"

نندلال کہنے لگا۔

"باقی ابھی صرف دو شہر ہمارے ٹارگٹ پر ہیں۔ کراچی اور راولپنڈی۔ اس کے بعد ہمارا پروگرام پشاور کو نشانہ بنانے کا ہے۔"

"ویری گڈ۔ فکر نہ کرو۔ تمہیں جو آدمی دے رہا ہوں سارے ٹرینڈ ہیں۔ اور خطرناک

دشمن ہیں مسلمانوں کے"

"ٹھیک ہے۔"

جیک نے رومال کھول کر باقی کی بچی ہوئی جوار کی روٹیاں نکال کر سامنے رکھ دیں۔ ان پر ساگ بھی رکھا ہوا تھا۔ نندلال نے جو مکان میں پہلے سے بیٹھا تھا اور جو وہاں آتا جاتا رہتا تھا۔ کونے میں رکھی ہوئی مٹی میں سے پانی کا ڈول بھر کر درمیان میں رکھ دیا۔ میں سوچنے لگا کہ میرے پاس جو دھماکہ خیز محلول شیشی میں بند پڑا ہے وہ ان لوگوں کو کس طرح پلا سکوں گا مجھے محسوس ہوا کہ یہاں چھ گلاس بھی نہیں ہیں۔ صرف ایک ڈول ہی ہے اور یہ کوئی ضروری نہیں کہ میں اگر ڈول میں دھماکہ خیز محلول ڈال دوں تو یہ سارے کے سارے ڈول میں سے پانی پئیں۔ اگر میں محلول کے قطرے پانی کے مٹکے میں ڈال دیتا ہوں تب بھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ یہ ہمارے تخریب کار اس میں سے ایک ہی وقت میں پانی نکال کر پئیں گے۔

ایک لمحے کے لئے مجھے اپنا منصوبہ ناکام ہوتا نظر آیا۔ اس وقت میں نے یہی فیصلہ کیا کہ جو لوڈڈ سٹین گن مجھے دی گئی ہے میں اس سے کام لوں گا۔ اگر یہ رات کو سو گئے تو ان کی گردنیں توڑنے کی کوشش کروں گا۔ بہرحال معاملہ تھوڑا مشکل اور خطرے والا ہو گیا تھا۔ روٹیاں کھانے کے بعد نندلال نے چارپائی کی دوسری طرف نیچے ہاتھ ڈال کر تام چینی کی ایک چینک اور چھوٹی چھوٹی چار پانچ پیالیاں نکالتے ہوئے کہا۔

"تم یہاں بیٹھو میں تم لوگوں کے لئے باہر چولہے پر چائے بناتا ہوں"

میرے دل میں امید کی شمع ایک بار پھر روشن ہو گئی۔ یہ چائے کی چینک میرے مشن کی تکمیل کر سکتی تھی۔ میں اپنی برخورداری کے ثبوت کے لئے فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

"بھاپا جی۔ میں آپ کی مدد کرتا ہوں۔"

جیک نے کہا۔

"ٹھیک ہے نندلال۔ مرلی پرشاد چائے بنانے میں تمہاری مدد کرے گا۔"

نندلال نے بہت کہا کہ مجھے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں لیکن میں اس سے پہلے

کوٹھڑی سے باہر نکل گیا۔ باہر چھوٹے سے کچے صحن میں ایک درخت کے نیچے اینٹوں کا چولہا بنا ہوا تھا۔ ساتھ ہی ہینڈ پمپ بھی لگا تھا۔ نندلال نے چولہے میں پہلے سے خشک لکڑیاں اور گھاس ڈال رکھی تھی۔ اس نے آگ جلا دی۔ میں نے پمپ میں سے پانی نکال کر چینک کو صاف کیا اور اس میں آدھے سے زیادہ پانی ڈال کر لے آیا۔

"بھاپا جی دودھ کہاں ہے؟"

نندلال بولا۔

"دودھ نہیں ہے۔ دودھ کے بغیر چائے پئیں گے۔ اس طرح رات کو نیند بھی نہیں آئے گی۔ ہمیں صبح منہ اندھیرے بارڈر کراس کرنا ہے۔"

اس نے چینک چولہے کے اوپر رکھ دی۔ پھر جیب سے چائے کی پڑیا نکال کر اس میں چائے ڈال دی۔ اس دوران میں نے پیالیاں دھو ڈالی تھیں اور انہیں ایک چنگیر میں رکھ دیا تھا۔ میں سوچ میں پڑ گیا تھا۔ کیونکہ پیالیاں پانچ تھیں۔ ویسے تو مجھے پانچ پیالیوں کی ہی ضرورت تھی۔ لیکن یہ سوچ رہا تھا کہ اگر جیک نے چائے کی اپنی پیالی میری طرف بڑھاتے ہوئے مروت میں کہہ دیا کہ مرلی پرشاد پہلے تم چائے پیئو۔ میں بعد میں پی لوں گا تو میں کس طرح انکار کر سکوں گا۔ لیکن اب سوچنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ کمانڈو ایکشن کا وقت آگیا تھا۔ ٹارگٹ میرے سامنے تھا۔ اب مجھے اٹیک کرنا تھا۔ یہ اٹیک کا وقت تھا۔ دھماکہ خیز محلول کی شیشی میری جیب میں تھی۔ میں چاہتا تھا کسی طرح نند لال وہاں سے ادھر ادھر ہو اور میں چینک میں محلول کے چند قطرے ڈال دوں۔ مگر وہ وہیں چولہے کے پاس اینٹ پر بیٹھا تھا۔ جب چائے ابلنے لگی تو مجھے موقع مل گیا۔ میں نے جلدی سے رومال نکال کر کہا۔

"بھاپا جی آپ اندر چلیں میں پیالیوں میں چائے ڈال کر لاتا ہوں۔"

نندلال اس وقت اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر گرم چینک کو پکڑنے کے لئے کسی رومال کی تلاش میں تھا جو اسے نہیں مل رہا تھا۔ میرے ہاتھ میں رومال دیکھ کر وہ اٹھا اور بولا۔

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے"

اور وہ کوٹھڑی میں چلا گیا۔ چولہا کوٹھڑی کی اوٹ میں تھا اور کوٹھڑی میں بیٹھے ہوئے آدمیوں کو چولہا نظر نہیں آسکتا تھا۔ میں نے ایک سیکنڈ بھی ضائع نہ کیا۔ جیب سے محلول کی شیشی نکالی۔ اس کا ڈھکن کھولا اور چائے کی چینک میں اس کے دس بارہ قطرے گرا دیئے۔ شیشی دوبارہ بند کر کے جیب میں رکھ لی اور پیالیوں میں چائے ڈالنے لگا۔ گل خان نے یہ جو دھماکہ خیز محلول تیار کیا تھا اس کی خاصیت یہ تھی کہ وہ انسانی معدے میں جا کر معدے سے پیدا ہونے والے تیزابی مادے کے ساتھ مل کر ہی پھٹتا تھا۔ معدے میں جانے کے بعد بھی وہ ایک دم سے نہیں پھٹتا تھا بلکہ معدے کے تیزابی مادے سے مل کر دس منٹ کے عمل کے بعد پھٹتا تھا۔ ویسے اسے کھولتے ہوئے پانی میں بھی ڈال دیا جائے تو کچھ نہیں ہوتا تھا۔ اس کا کیمیاوی عمل صرف انسانی معدے کے تیزابی مادے کے ساتھ حل ہونے کے بعد پورا ہوتا تھا۔

میں نے پانچوں پیالیاں چائے سے بھر دیں۔ چینک وہیں چولہے کے پاس رہنے دی اور پیالیوں کی چنگیر اٹھا کر کوٹھڑی میں آگیا۔ کوٹھڑی میں پانچوں تخریب کار بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ نندلال ان لوگوں کو کچھ سمجھا رہا تھا۔ جب میں اندر آیا تو وہ کہہ رہا تھا۔

"میں مرلی پرشاد کو پہلے گوالمنڈی لے کر خود جاؤں گا۔ ہمیں کوئی ایسی دکان تلاش کرنی ہوگی جہاں رنگ روغن کا سامان فروخت ہوتا ہو۔ اس طرح بم پھٹنے کے بعد تباہی زیادہ پھیلے گی۔"

میں نے چنگیر چارپائی پر رکھ دی۔ یہ لمحہ میرے لئے سب سے زیادہ ہیجان خیز لمحہ تھا۔ پانچوں پیالیوں میں ان لوگوں کی موت موجود تھی۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ کہیں ایسا تو نہیں ہوتا کہ کوئی پیالی میں سے چائے پہلے پیئے۔ کوئی بعد میں پیئے اور کوئی بالکل ہی نہ پیئے۔ پھر یہ مرحلہ بھی آنے والا تھا جب جیک نے رواداری سے کام لیتے ہوئے مجھے پہلے چائے پینے کی دعوت دینی تھی۔ میں اس کے آگے زیادہ انکار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ بڑے عیار لوگ تھے۔ زیادہ انکار کرنے سے انہیں شک پڑ سکتا تھا کہ آخر میں چائے نہ پینے پر اتنا

اصرار کیوں کر رہا ہوں۔

سٹین گن میرے کاندھے سے لٹک رہی تھی۔ چائے کا میرا مشن فیل ہو جانے کی صورت میں مجھے سٹین گن سے اندھا دھند فائرنگ ہی کرنی تھی۔ جوابی فائرنگ میں میرے ہلاک ہوجانے کا امکان باقاعدہ موجود تھا۔ میں نے چنگیر میں سے پیالیاں اٹھا اٹھا کر انہیں دینی شروع کر دیں۔ وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ میں نے جیک کی طرف پیالی بڑھائی تو اس نے کہا۔

"مرلی پرشاد! تم پہلے پیو گے۔ میں بعد میں پی لوں گا۔"

میں نے دو تین بار انکار کیا لیکن جب جیک کا اصرار بڑھا تو میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بھاپا جی۔ جیسے آپ کی مرضی میں ہی پہلے پی لیتا ہوں۔"

میں پیالی ہونٹوں کے پاس لے گیا۔ میں نے دیکھا کہ اس دوران وہ سارے آدمی مزے سے چائے پی رہے تھے۔ میں نے پیالی ہونٹوں کے پاس لے جا کر جلدی سے نیچے رکھ دی اور کہا۔

"بڑی گرم چائے ہے۔ میں چائے کو ذرا ٹھنڈی کر کے پیتا ہوں۔"

جیک میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ لاؤ میں ٹھنڈی کر دیتا ہوں۔"

اس نے میری پیالی ہاتھ میں لے کر اس میں تین چار پھونکیں ماریں اور پیالی مجھے پکڑاتے ہوئے کہا۔

"اب پی جاؤ۔ ٹھنڈی ہو گئی ہے۔ جلدی پیالی خالی کرو۔ مجھے بھی پینی ہے۔"

میرے پاس صرف دس منٹ تھے۔ چاروں تخریب کار جیک کے سوائے چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھر رہے تھے۔ ان کی موت کی الٹی گنتی شروع ہو گئی تھی۔ میں نے پیالی دوبارہ اٹھالی۔ مجھے کسی حالت میں یہ چائے نہیں پینی تھی۔ مجھے جو کچھ کرنا تھا وہ میں نے ایک سیکنڈ میں ہی سوچ لیا تھا۔ جیک اس وقت تخریب کار نندلال سے کچھ کہہ رہا

تھا۔ نندلال چائے کی آدھی پیالی خالی کر چکا تھا۔ ان چاروں کے معدے میں چائے کے ساتھ دھماکہ خیز مواد پہنچ چکا تھا اور اس نے معدے کے تیزابی مادے سے مل کر اپنا کیمیاوی عمل شروع کر دیا تھا۔

میں نے ایک دم ہاتھ کے اشارے سے جیک اور نندلال کو اس انداز میں خاموش رہنے کو کہا جیسے مجھے باہر کوئی آواز سنائی دی ہو۔ جیک نے میری طرف دیکھ کر آہستہ سے پوچھا۔

"کیا بات ہے؟"

میں نے چائے کی پیالی زمین پر رکھتے ہوئے کہا۔

"شی۔ باہر کوئی ہے"

اس کے ساتھ ہی میں سٹین گن ہاتھوں میں تھام کر تیزی سے باہر نکل گیا۔ میں نے اپنے آپ کو موت کے منہ سے نکال لیا تھا۔ صحن میں آتے ہی میں دوڑ کر درختوں میں چلا گیا۔ یہاں چاندنی نہیں تھی۔ اندھیرا تھا۔ میں کوٹھڑی سے کوئی سو فٹ دور ایک درخت کے نیچے اس طرح بیٹھ گیا کہ میری سٹین گن کا رخ کوٹھڑی کے دروازے کی طرف تھا۔ میں جانتا تھا کہ جیک اور نندلال بھی اسلحہ لے کر ضرور باہر نکلیں گے۔ مجھے نند لال کی پروا نہیں تھی۔ وہ تو دھماکے سے پھٹنے والا تھا۔ مجھے جیک یعنی اپنے پارٹی لیڈر کی فکر تھی۔ اس نے دھماکہ خیز چائے نہیں پی تھی۔ اور اس کے پاس سٹین گن بھی تھی۔ میں سانس روکے سٹین گن کا رخ کوٹھڑی کی طرف کئے ان تخریب کاروں کے باہر نکلنے کا انتظار کر رہا تھا۔

کوٹھڑی کے اندر پانچ آدمی تھے۔

چار کو دھماکے سے اڑنا تھا۔ اگر جیک یعنی تخریب کار پارٹی کا لیڈر باہر نہ بھی نکلتا تو میرے، اندازے کے مطابق چار آدمیوں کے دھماکے میں اس کا بھی اڑ جانا یقینی تھا۔ کیونکہ اس دھماکہ خیز مواد کی تباہی کی شدت کا مجھے تجربہ ہو چکا تھا۔ صرف جیک نے چائے نہیں پی تھی۔ مجھے یہ بھی خیال تھا کہ کوٹھڑی سے میرے نکل آنے کے بعد ہو سکتا ہے اس نے چائے کی پیالی میں سے ایک آدھ گھونٹ بھر لیا ہو۔ کسی آدمی کو دھماکے سے اڑانے کے لئے اس چائے کا ایک گھونٹ ہی کافی تھا۔ لیکن میں اندھیرے میں درخت کی اوٹ میں گھات لگا کر تیار بیٹھا تھا کہ اگر جیک دس منٹ کے اندر اندر ہلاک نہ ہوا تو میں اسے سٹین گن کے ایک ہی برسٹ سے بھون ڈالوں گا۔ میرے پاس گھڑی نہیں تھی۔ مجھے وقت کا اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ دس منٹ گزر چکے ہیں یا نہیں۔ اتنے میں کوٹھڑی میں سے ایک آدمی باہر نکل آیا۔ کوٹھڑی کے آگے صحن میں زرد چاند کی پھیکی سی چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ نندلال تھا۔ اس نے میرے سامنے چائے پی تھی۔ اس کا جسم دھماکے سے پھٹنے کے قریب تھا۔

ساتھ ہی ہمارا پارٹی لیڈر جیک بھی آ گیا۔ جیک کے ہاتھ میں سٹین گن تھی۔ دونوں ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ نندلال نے مجھے آواز دی۔

"مرلی پرشاد!"

میں درخت کے پیچھے دبک کر بیٹھا رہا۔ تین ہندو تخریب کار کوٹھڑی کے اندر ہی

تھے۔ نندلال نے ایک بار پھر مجھے آواز دی۔

"مرلی! کہاں ہو تم؟"

پھر اس نے جیک سے کہا۔

"مجھے معاملہ گڑبڑ لگتا ہے۔ جیک"

گل خان نے مجھے بتایا تھا کہ اس بار اس نے دھماکہ خیز محلول کا وقت تھوڑا بڑھا کر پانچ منٹ سے دس منٹ کر دیا ہے۔ یعنی پہلے یہ مواد پانچ منٹ میں پھٹ جاتا تھا مگر اب اسے پھٹنے میں دس منٹ لگتے تھے۔ مجھے پسینہ آ گیا۔ کچھ نہیں ہو رہا تھا۔ یا خدا کہیں گل خان کا تجربہ فیل تو نہیں ہو گیا۔

اس دوران ایک اور تخریب کار کوٹھڑی سے باہر آ گیا۔ اس نے باہر آتے ہی پوچھا۔

"کیا ہو گیا ہے لالہ؟"

ابھی یہ فقرہ اس کے منہ میں ہی تھا کہ ایک دھماکہ ہوا۔ پھر دوسرا دھماکہ ہوا اور میری آنکھوں کے سامنے نندلال اور اندر سے جو تخریب کار باہر آیا تھا دونوں کے جسم پھٹ کر آگ کے شعلوں کے ساتھ ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گئے۔ جیک اچھل کر ایک طرف گرا۔ وہ گرتے ہی اٹھا اور گھبراہٹ میں وہ سیدھا ان درختوں کی طرف دوڑ پڑا جہاں میں گھات لگائے بیٹھا تھا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ جیک میری زد میں تھا۔ ٹریگر پر میری انگلی کا دباؤ پڑا اور سٹین گن سے پورا برسٹ نکل کر جیک کے جسم کو چھلنی کر گیا۔ وہ منہ کے بل آگے کو گر پڑا۔ اس کے ساتھ ہی کوٹھڑی کے اندر دو دھماکے ایک ہی وقت میں ہوئے اور کوٹھڑی کی چھت اور دروازہ اڑ گئے۔ اندر سے شعلوں کا بادل اٹھ کر آسمان کی طرف ایسے بلند ہوا جیسے اندر کوئی چھوٹا ایٹم بم پھٹ گیا ہو۔ اس کے فوراً بعد وہاں خاموشی چھا گئی۔ کوٹھڑی کے دروازے کے ٹکڑے ادھر ادھر بکھر کر جل رہے تھے۔ میں انڈین بارڈر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ بلکہ بارڈر کے اوپر ہی بیٹھا تھا۔ بھارتی باؤنڈری سیکورٹی فورس کے سپاہیوں نے اس دھماکے کی آواز اگر سن لی تھی تو وہ ضرور اس طرف آ رہے ہوں گے اس لئے میرا وہاں ٹھہرنا مجھے ایک نئی مصیبت میں پھنسا سکتا تھا۔ میں نے صرف اتنا کیا کہ

جیک کی لاش کو دیکھ کر تسلی کی کہ وہ زندہ تو نہیں ہے۔ وہ مرچکا تھا۔ سٹین گن کی گیارہ بارہ گولیاں اس کے جسم کو ادھیڑ کر دوسری طرف سے نکل گئی تھیں۔ اس کی لاش خون میں لت پت اوندھی پڑی تھی۔ میں نے سٹین گن کاندھے سے لٹکائی اور دھندلی چاندنی والی رات میں واپس جموں شہر کی طرف تیز تیز چلنے لگا۔

میری سٹین گن میں ابھی بہت گولیاں باقی تھیں۔ آدھے سے زیادہ اس کا میگزین بھرا ہوا تھا۔ میں اسی راستے پر چلا جا رہا تھا جس راستے پر پارٹی لیڈر جیک ہمیں لے کر آیا تھا۔ دھماکہ خیز مواد کا بچا ہوا محلول میری جیب میں شیشی میں محفوظ پڑا تھا۔ میں اس کی کارکردگی پر بے حد خوش تھا۔ یہ کمال کی چیز ہمارے ماسٹر سپائی اور ایکسپلوسِوز کے ماہر گل خان نے بنائی تھی۔ میں پہلے تیز تیز چل رہا تھا۔ چاند تھوڑا اوپر آکر ایک طرف ٹیلے کے پیچھے ہو گیا۔ ماحول پر اندھیرا چھا گیا۔ اس خیال سے کہ یہ بارڈر کا علاقہ ہے مجھے یہاں سے جتنی جلدی ہو سکے نکل جانا چاہئے۔ میں نے جوگنگ کے انداز میں دوڑنا شروع کر دیا۔

جب میں جائے واردات سے کافی دور نکل گیا تو ایک جگہ بیٹھ کر تھوڑا سانس لیا اور دوبارہ چل پڑا۔ اب میں نارمل رفتار سے جا رہا تھا۔ میں ٹھیک ان راستوں سے ہو کر گزر رہا تھا جن راستوں سے جیک ہمیں لے کر آیا تھا۔ آسمان پر تارے چمک رہے تھے۔ پھر آسمان پر مشرق کی جانب نیلی روشنی کا غبار سا پھیلنے لگا۔ یہ صبح کاذب کی روشنی تھی۔ صبح کاذب کی روشنی اس روشنی کو کہتے ہیں جو صبح ہونے سے بہت پہلے مشرقی افق پر نمودار ہوتی ہے۔ اس کو کاذب اس لئے کہتے ہیں کہ یہ جھوٹی ہوتی ہے۔ یعنی لگتا ہے صبح ہو گئی ہے مگر ابھی صبح نہیں ہوئی ہوتی۔ عربوں نے صبح کی روشنیوں کے مختلف مدارج کے الگ الگ نام رکھے ہوئے ہیں۔ میں اس گاؤں کے قریب سے بھی گزر گیا جہاں سے جیک ہمارے لئے لسی اور جوار کی روٹیاں لایا تھا۔ میں اس گاؤں سے آگے پہنچا تو صبح کاذب کے بعد صبح صادق کی نورانی روشنی چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ میں نے ایک پہاڑی نالے منہ ہاتھ دھویا۔ تھوڑا پانی پیا اور اس کچی پگ ڈنڈی پر آگیا جو اونچے اونچے جوار کی فصل کے کھیتوں میں چلی جاتی تھی۔

مجھے معلوم تھا کہ ابھی جموں کافی دور ہے اور اگر میں پیدل چلتا رہا تو مجھے مزید ایک دن ان پہاڑیوں اور میدانوں میں سے چلنا پڑے گا۔ جس طرح کہ ہم آتی دفعہ چل کر آئے تھے۔ میرے پاس اس سفر کو مختصر کرنے کا اور کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ دن کے وقت کسی جگہ چھپ کر سو جاؤں گا۔ تین چار گھنٹے سو کر پھر آگے چلوں گا۔ جب سورج نکل آیا اور چاروں طرف روشنی ہو گئی تو میں نے کھڑے ہو کر جائزہ لیا کہ میں کہیں اصل راستے سے بھٹک تو نہیں گیا۔ کچھ درختوں اور دو ایک چھوٹے ٹیلوں کو میں نے پہچان لیا۔ میں ٹھیک سمت جا رہا تھا۔

میری جیب میں انڈین کرنسی میں کچھ پیسے ضرور تھے مگر ہمیں غیر آباد راستوں سے بارڈر تک لایا گیا تھا۔ یہ ایسے راستے تھے جہاں لاریاں تانگے وغیرہ نہیں چلتے تھے۔ ورنہ میں کسی لاری یا یکے میں سوار ہو کر جموں جلدی پہنچ سکتا تھا۔ چلتے چلتے میری بائیں طرف آموں کا ایک گھنا باغ آگیا۔ یہ باغ ویران پڑا تھا۔ چونکہ آموں کی فصل کا موسم نہیں تھا اس لئے باغ میں کسی رکھوالے وغیرہ کا کوئی جھونپڑا نہیں تھا۔ ایک جگہ زمین تھوڑی صاف تھی۔ میں وہیں لیٹ گیا۔ مجھے اس بات کا اطمینان تھا کہ میں خطرے کے مقام سے بہت دور نکل آیا ہوں اب بارڈر سکیورٹی فورس کے آدمی مجھ تک نہیں پہنچ سکتے چنانچہ مجھے بڑی جلدی نیند آگئی۔

سو کر اٹھا تو سورج درختوں کے اوپر آگیا ہوا تھا۔ میں نے آم کے باغ سے باہر آکر دیکھا۔ دور سے مجھے وہ پہاڑ نظر آئے جن کی دوسری طرف جموں شہر تھا۔ ان پہاڑوں کو میں ایک دن پہلے وہاں سے گزرتے ہوئے دیکھ کر ان کی نشانی دل میں لگا چکا تھا۔ میرے سامنے ویران میدان پھیلا ہوا تھا۔ میں پہاڑوں کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے میں ایک جگہ چھوٹا سا کنواں آیا۔ یہ کنواں شاید اسی لئے بنایا گیا تھا کہ آتے جاتے مسافر یہاں اپنی پیاس بجھا سکیں۔ کنوئیں کے اوپر چرخی کے ساتھ ٹین کا ڈونگا لٹک رہا تھا۔ میں نے کنوئیں میں جھانک کر دیکھا۔ نیم پہاڑی علاقے کے کنوئیں بھی کافی گہرے ہوتے ہیں اور پانی کافی گہرائی میں جا کر نکلتا ہے۔

میں نے ڈونگا کنوئیں میں ڈال کر پانی نکالا۔ پانی صاف اور میٹھا تھا۔ مجھے بھوک ضرور محسوس ہو رہی تھی مگر پیاس کی شدت زیادہ تھی۔ میں نے پانی پیا۔ منہ ہاتھ دھویا۔ تھوڑی دیر آرام کیا اور پھر آگے کو چل پڑا۔ دوپہر کے بعد قریباً تیسرے پہر کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا ایک جگہ امرودوں کا باغ دیکھا۔ یہ جنگلی امرودوں کا باغ تھا۔ درختوں پر کچے پکے امرود لگے تھے۔ میں نے چار پانچ پکے ہوئے امرود توڑ کر کھالئے۔ شام ہو رہی تھی کہ مجھے دور جموں شہر کی روشنیاں نظر آنے لگیں۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ جس وقت میں جموں شہر کے مضافات میں سے گزر رہا تھا تو رات ہو گئی تھی۔ دریا کی دونوں جانب شہر کی روشنیاں اونچی نیچی ڈھلانوں پر جھلملا رہی تھیں۔ یہاں میں نے ایک تانگہ لیا اور اس ہوٹل میں آگیا جہاں ہم سب نے ایک رات اور ایک دن گزارا تھا۔ ہوٹل والا میری صورت سے آشنا تھا۔ میں نے وہی کمرہ لے لیا جہاں ہم ٹھہرے تھے۔ کمرے میں آکر میں نے جوتے اتار کر پھینکے۔ پاؤں دھوئے۔ اور بستر پر اپنے آپ کو گرا دیا۔ دروازے کو میں نے اندر سے کنڈی لگالی تھی۔ ایسا سویا کہ دوسرے دن صبح کے وقت آنکھ کھلی۔ اٹھ کر غسل کیا۔ ناشتہ کیا۔ معلوم ہوا کہ دلی جانے والی جموں توی ایکسپریس نکل چکی ہے اب دوپہر کو ایک پسنجر ٹرین جالندھر جائے گی۔ میں دوپہر تک ہوٹل ہی میں رہا۔ دوپہر سے ذرا پہلے ہوٹل سے نکلا اور سیدھا جموں کے ریلوے سٹیشن پر آگیا۔ میں کوئی گولہ بارود کا ذخیرہ اڑا کر نہیں آیا تھا کہ جس کا لرزہ خیز دھماکہ ہوا ہو اور آس پاس کے لوگوں کو پتہ چل گیا ہو۔ بڑے آرام سے پانچ پاکستان دشمن بھارتی تخریب کاروں کو جہنم میں پہنچا دیا تھا۔ چھوٹے چھوٹے محدود قسم کے چار دھماکے ہوئے تھے۔ چار تخریب کاروں کے جسم ہوا میں تحلیل ہو گئے تھے۔ اور ایک تخریب کار کو سٹین گن کا برسٹ مار کر موت کی نیند سلا دیا تھا۔ اگرچہ بارڈر کے قریب کا علاقہ تھا مگر دھماکوں کی آواز زیادہ دور تک نہیں گئی تھی اس لئے میں قدرے مطمئن تھا کہ پولیس یا خفیہ پولیس کا کوئی آدمی میری تلاش میں نہیں ہو گا۔

میں ٹرین میں سوار ہو گیا۔ ٹرین جالندھر کی طرف چل پڑی۔ راستے میں ایک

مرمت ہو رہا تھا۔ یہ صبح ہی ایک طرف سے کھولا گیا تھا۔ وہاں گاڑی نے دو گھنٹے لگا دیئے جالندھر پہنچتے پہنچتے شام ہو گئی۔ یہاں سے رات کو دلی جانے والی گاڑی ملی۔ دلی پہنچا تو صبح کاذب کا وقت ہو رہا تھا۔ سٹیشن پر اترتے ہی سیدھا بستی نظام الدین اولیاؒ کی طرف روانہ ہو گیا۔ موٹر رکشے نے جلدی پہنچا دیا۔ مغل شہزادے کی خانقاہ کے قریب سے ہوتا ہوا گل خان کے پرانے مکان میں آکر خفیہ جگہ سے چابی نکالی۔ دروازہ کھول کر اندر گیا۔ دروازے کو کنڈی لگائی اور جوتے اتار کر بستر پر لیٹ گیا۔

ایسا لگا جیسے کسی نے میرے سر کے اوپر سے ایک من کا بھاری وزن اتار دیا ہو۔ میرا کمانڈو مشن کامیابی سے مکمل ہو گیا تھا۔ پانچوں تخریب کاروں کو لاہور میں متعین بھارتی تخریب کار سمیت میں نے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی تھی۔ اب سب سے مشکل مرحلہ آگے آرہا تھا۔ وہ مرحلہ یہ تھا کہ میں اگر دلی کے قلعے والے تخریب کار ٹریننگ سنٹر میں گیا تو سنٹر کے چیف کو کیا بتاؤں گا کہ میرے ساتھیوں کا کیا انجام ہوا۔ اگر وہ مارے گئے تو کیسے مارے گئے۔ کس نے انہیں مارا؟ اور اگر وہ مارے گئے تو میں کیسے زندہ بچ گیا۔ ضروری امر تھا کہ انہیں مجھ پر شک پڑتا کہ کہیں پاکستان کا جاسوس تو نہیں ہوں۔ اس سلسلے میں پروفیسر اور گل خان سے مشورہ بہت ضروری تھا۔

جب ذرا دن چڑھا تو میں نے بستی نظام الدین کے گیٹ کے قریب جو ٹیلی فون بوتھ تھا وہاں سے گل خان کو فون کیا اور اسے کوڈ الفاظ میں بتایا کہ میں آگیا ہوں۔ گل خان نے کہا کہ وہ پہنچ رہا ہے۔

ایک گھنٹے بعد گل خان اور پروفیسر جمشید دونوں میرے پاس پہنچ گئے۔ میں نے انہیں ساری روداد سنائی تو وہ سوچ میں پڑ گئے۔ پروفیسر عینک کے شیشے صاف کر رہا تھا۔ کہنے لگا۔

”تم نے سب کچھ جلدی میں کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ تمہیں ان کے ساتھ پاکستان چلے جانا چاہئے تھا۔ اگر پاکستان جا کر تم انہیں ہلاک کرتے تو بات سمجھ میں آسکتی تھی۔ اب معاملہ مشکوک ہو گیا ہے۔“

گل خان نے بھی پروفیسر کی تائید کی۔ میں نے کہا۔

"اگر میں ان کے ساتھ پاکستان چلا جاتا تو انہیں ہلاک کرنے کے بعد مجھے واپس آنے میں مشکل پیش آسکتی تھی۔ پاکستان کا بارڈر کراس کرنا اتنا آسان نہیں ہے۔"

پروفیسر جمشید نے گل خان کو مخاطب کر کے کہا۔

"گل خان! اب جو ہونا تھا وہ ہو گیا ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ اس کا واپس ان لوگوں کے پاس جانا مناسب رہے گا جنہوں نے اسے پارٹی کے ساتھ تخریب کاری کے واسطے پاکستان بھیجا تھا؟"

گل خان تھوڑی دیر غور کرتا رہا۔ پھر کہنے لگا۔

"میرا تو خیال ہے کہ اسے ان کے پاس نہیں جانا چاہئے۔ چاہے کیسی ہی کہانی گھڑ کر انہیں کیوں نہ سنائے ان لوگوں کو شک پڑنا ضروری ہے۔ یہ بات کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آئے گی کہ ساری پارٹی ختم ہو جائے اور ہمارا کمانڈو دوست زندہ واپس آجائے اور وہ بھی بھارتی سرزمین پر یہ واقعہ پیش آئے۔"

میں نے کہا۔

"میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہم پاکستان کا بارڈر کراس کر رہے تھے کہ پاکستانی رینجرز سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ ہم نے بھی فائرنگ کی ہمارا اسلحہ ختم ہو گیا۔ میرے ساتھی مارے گئے اس فائرنگ میں' اور میں بڑی مشکل سے جان بچا کر نکل آیا۔"

پروفیسر نے کہا۔

"میرا خیال ہے لکشمی دیال بڑا کائیاں آدمی ہے۔ وہ تمہاری کہانی پر کبھی یقین نہیں کرے گا۔ میں تو تمہیں یہی مشورہ دوں گا کہ اب تخریب کاروں کے ٹریننگ سنٹر کو بھول جاؤ۔"

میں نے اس پر اعتراض کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن پروفیسر برائی کی جڑ تو اپنی جگہ پر قائم ہے۔ میں نے آج ان کے پانچ تخریب کار ہلاک کئے ہیں تو کل وہاں سے مزید پانچ تخریب کار تیار ہو کر پاکستان سمگل کر دئیے جائیں گے۔ میں تو برائی کو جڑ سے کاٹنا چاہتا ہوں۔ میں اس ٹریننگ سنٹر کو اس کے چیف

لکشمی دیال اور انسٹرکٹر کالی داس سمیت بم سے اڑا دینا چاہتا ہوں۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری"

گل خان بولا۔

"میرا خیال ہے تم ایک بار تخریب کاروں کے ٹریننگ سنٹر ضرور جاؤ۔ نہیں جاؤ گے تو لکشمی دیال اور رحیم بخش کے آگے میری پوزیشن خراب ہونے کا اندیشہ ہے۔ کیونکہ کانگریسی مسلمان رحیم بخش نے تمہیں میری سفارش پر وہاں بھرتی کرایا تھا۔ ایک بار تم جا کر وہاں جو ڈرامہ کرنا ہے ضرور کرو۔ اس طرح میری پوزیشن تھوڑی محفوظ ہو جائے گی۔ اگر لکشمی دیال اور کالی داس نے واقعی تمہاری کہانی پر یقین کر لیا تو اس کے بعد تم بے شک ٹریننگ سنٹر کو بم سے اڑا کر روپوش ہو جانا۔"

"یہی تو میں بھی چاہتا ہوں"

میں نے گل خان کی بات کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ گل خان نے اس سلسلے میں پروفیسر جمشید سے مشورہ مانگا تو وہ آنکھوں پر عینک جماتے ہوئے کہنے لگا۔

"ٹھیک ہے۔ یہ ڈرامہ کرنا میرے خیال میں ضروری ہو گیا ہے۔"

گل خان نے مجھے کہا۔

"تو پھر تمہیں دیر نہیں کرنی چاہئے۔ تم ابھی وہاں چلے جاؤ۔ دوپہر کے بعد لکشمی دیال تمہیں ٹریننگ سنٹر میں شاید نہ ملے۔ مگر اپنا حلیہ ذرا خراب کر کے جانا۔ یہ تمہاری ذہانت کا امتحان ہے۔ اگر تم نے اچھی طرح سے اداکاری کی تو میرا خیال ہے تم ان لوگوں کو یقین دلانے میں ضرور کامیاب ہو جاؤ گے۔ ہم رات کو یہاں آئیں گے۔ تم بھی اندھیرا ہونے کے بعد یہاں آکر رپورٹ کرنا۔ اب ہم جاتے ہیں تم ہمارے جانے کے تھوڑی دیر بعد یہاں سے نکل جانا۔ تمہیں ٹریننگ سنٹر کے راستے کا پتہ ہے ناں؟"

"بالکل پتہ ہے۔"

میں نے جواب دیا۔

اس کے بعد گل خان اور پروفیسر جمشید چلے گئے۔ میں نے سب سے پہلے تو دھماکہ خیز

محلول والی شیشی جیب سے نکال کر اپنے پلنگ کے نیچے چھپائی۔ پھر آئینے میں اپنی شکل
دیکھی۔ لمبے سفر کی وجہ سے میرے چہرے پر تھکان کے آثار موجود تھے۔ میں نے بالوں
تھوڑا اور پریشان کیا۔ کپڑے وہی رہنے دیئے۔ مکان کو تالا لگایا۔ چوک سے موٹر رکشہ
اور تخریب کاری کے ٹریننگ سنٹر کی طرف چل پڑا۔ کافی فاصلہ تھا۔ پون گھنٹے بعد
پرانے قلعے کے کھنڈر والے ٹریننگ سنٹر کے باہر پہنچا۔ باہر وہی راشٹریہ سیوک سنگھ
بورڈ لگا تھا۔ میں سیدھا لکشمی دیال کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ مجھے حیران ہو کر دیکھنے لگا۔

"مرلی پرشاد! تم اتنی جلدی کیسے واپس آگئے جیک کہاں ہے؟"

آپ کو معلوم ہی ہو گا جیک اس ہندو کا دوسرا نام تھا جس کی راہ نمائی میں ہم
نندلال کے پاس بارڈر پر پہنچنا تھا۔ جیک کو واپس آجانا تھا۔ اور مجھے دوسرے تخریب
کاروں کے ساتھ پاکستان کا بارڈر کراس کر کے لاہور جانا تھا۔ میں نے لکشمی دیال
کمرے میں انٹر ہوتے ہی اداکاری شروع کر دی تھی۔ سر پکڑ کر کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ میں
نے بڑے مایوسی کے انداز میں اسے ساری کہانی بیان کر دی کہ کس طرح جب ہم
پاکستان کا بارڈر کراس کر رہے تھے تو اچانک ایک طرف سے پاکستانی رینجرز کی جیپ
اور اس نے فائرنگ شروع کر دی۔ نندلال اور جیک کے پاس ایک ایک سٹین گن تھی
انہوں نے بھی جوابی فائرنگ شروع کر دی۔ مگر ہمارا اسلحہ ختم ہو گیا۔ ہم انڈیا کے بارڈر
طرف بھاگے۔ مگر پاکستانی رینجرز نے ہمارا پیچھا کیا۔ وہ ہم پر برابر گنیں فائر کر رہے تھے
میرے دیکھتے دیکھتے نندلال جیک اور باقی ساتھیوں کو گولیاں لگیں اور وہ گر کر لڑھکنے لگے
پاکستانی رینجرز میری طرف فائرنگ کرتے دوڑے۔ میں نے ایک کھائی میں چھلانگ لگا
اور اندھا دھند بھاگنے لگا۔

"مجھے نہیں پتا میں کیسے جان بچانے میں کامیاب ہوا۔ ورنہ میرا بچنا ناممکن تھا۔
کھائی سے نکل کر جموں کی طرف منہ کر کے دوڑتا چلا گیا۔ انڈیا کے بارڈر میں داخل
جان میں جان آئی۔"

میں نے گہری آہ بھر کر کہا۔

"مجھے اپنے ساتھیوں کی موت کا بڑا دکھ ہے۔ بڑا دکھ ہے۔ کاش میں بھی ان کے
ساتھ ہی مر جاتا۔"

اور یقین کریں میں تھوڑی سی کوشش کے بعد آنکھوں سے آنسو جاری کرنے میں
کامیاب ہو گیا۔ اس دوران وہاں انسٹرکٹر کالی داس بھی آگیا تھا۔ دونوں میری من گھڑت
کہانی بڑے غور سے سن رہے تھے۔ میں ساتھ ساتھ ان کے چہروں کا بھی جائزہ لیتا جاتا
تھا۔ ان کے چہروں پر کسی قسم کا تاثر نہیں تھا۔ بالکل سپاٹ چہرے ہو گئے تھے۔ کبھی مجھے
محسوس ہوتا کہ انہیں میری کہانی پر پورا یقین ہو گیا ہے۔ کسی وقت لگتا کہ وہ میری کہانی کو
محض ایک ڈرامہ سمجھ رہے ہیں۔ میں نے ہاتھ باندھ کر اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

"سر! میں آپ کا دوشی ہوں۔ میرا قصور یہ ہے کہ میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ نہیں
مرا۔ میرے پیارے ساتھی سورگباش ہو گئے اور میں زندہ وہاں سے بھاگ آیا۔ مگر میرے
پاس کوئی اسلحہ نہیں تھا۔ میں پاکستانی رینجرز کی فائرنگ کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ میں آپ
کے سامنے پیش ہو گیا ہوں۔ اب آپ کی مرضی ہے۔ مجھے جو چاہے سزا دیں۔ مجھے کوئی
اعتراض نہیں ہو گا۔ اگر آپ مجھے شوٹ کرنا چاہتے ہیں تو بے شک شوٹ کر دیں۔ میں
اپنے پیارے ساتھیوں کی موت کے بعد خود بھی زندہ رہنا نہیں چاہتا۔"

اور میں بات ختم کرنے کے بعد ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔
اس وقت مجھے اپنی پیاری بہن یاد آگئی تھی جس کو 1947ء میں ایک سکھ نے تلوار مار کر
شہید کر دیا تھا۔ میری آنکھوں سے صرف اپنی بہن کو یاد کر کے آنسو جاری تھے۔ لکشمی
دیال کرسی چھوڑ کر میرے قریب آکر ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا اور میرے کاندھے کو
تھپتھپاتے ہوئے بولا۔

"مرلی پرشاد! جو ہونا تھا ہو گیا۔ اب رونے سے تو وہ لوگ واپس نہیں آجائیں گے۔
اس قسم کے واقعات تو ہمارے ساتھ ہوتے ہی رہتے ہیں۔ اب تم اگلے مشن کی تیاری
کرو"

میں نے رومال سے آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔

"سر! میں بالکل تیار ہوں۔ مجھے حکم دیا جائے کہ اگلا مشن کب روانہ ہوگا۔ میں سب سے پہلے پاکستان کا بارڈر کراس کروں گا۔"

اس پر تخریب کاروں کا متعصب ہندو انسٹرکٹر کالی داس بولا۔

"ابھی تم اوپر والے کمرے میں جا کر نہا دھو کر آرام کرو۔ رات کو تمہیں اگلے مشن کے بارے میں تفصیل سے بتایا جائے گا۔"

میں دل میں بے حد خوش بھی ہوا اور مطمئن بھی ہو گیا کہ میری اداکاری کامیاب ثابت ہوئی ہے اور جس بات کا خطرہ تھا وہ ٹل گیا ہے۔ آج بھی جب میں اس وقت کو یاد کرتا ہوں تو مجھے اپنے آپ پر تعجب ہوتا ہے کہ میں اتنا اعلیٰ تربیت یافتہ کمانڈو اور چہرہ شناس ہونے کے باوجود ان لوگوں کے دل کا حال ان کے چہروں سے نہ پڑھ سکا۔

میں قلعے کی دوسری منزل پر ایک کمرے میں آگیا۔ یہاں پانی کے نل کے نیچے نہانے کے لئے بالٹی ڈونگا پڑا تھا۔ میں نہا کر تازہ دم ہو گیا۔ اتنے میں انسٹرکٹر کالی داس اوپر میرے پاس آگیا۔ اس نے مجھے جیب سے سگریٹ نکال کر دیا۔ کہنے لگا۔

"دو سال پہلے بھی اسی طرح پاکستانی رینجرز کے ساتھ جھڑپ میں ہماری پارٹی کے سات آدمی مارے گئے تھے۔ یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ کبھی پوری کی پوری پارٹی بارڈر کراس کر جاتی ہے اور کبھی بارڈر کراس کرانے والے تجربہ کار گائیڈ کے ہوتے ہوئے بھی اچانک بارڈر فورس سے مڈبھیڑ ہو جاتی ہے اور ہمارے آدمی کچھ مارے جاتے ہیں کچھ بھاگ کر واپس آجاتے ہیں۔"

میں نے کالی داس کو اپنی پارٹی کی پاکستانی رینجرز کے ساتھ جھڑپ کی جھوٹی کہانی بڑی تفصیل کے ساتھ سنائی۔ وہ بڑے غور سے سنتا رہا۔ پھر بولا۔

"بالکل ایسا ہی ہوتا ہے بھیا۔ تم تو پہلی دفعہ بارڈر کراس کر رہے تھے۔ ہم تو اپنے اگروادی (تخریب کار) پاکستان بھیجتے ہی رہتے ہیں۔"

اس وقت میں نے دل میں باقاعدہ طے کر لیا کہ اب ان لوگوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ کیونکہ یہ لوگ پاکستان کے بڑے خطرناک دشمن ہیں۔ ایسے دشمن جو پاکستان کے

شہروں میں اپنے تخریب کار بھیجنے سے کبھی باز نہیں آئیں گے۔ مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ میں کیا سکیم بنا رہا ہوں اور ان لوگوں نے میرے خلاف کیا سکیم تیار کر رکھی ہے۔ کالی داس جانے لگا تو بولا۔

"تم نیچے رسوئی میں جا کر بھوجن کر لو۔ اس کے بعد تمہیں اگلی پارٹی کے لیڈر سے ملاقات کراؤں گا۔"

میں نیچے رسوئی میں آگیا جہاں ایک ہندو باورچی گرم گرم پھلکے بنا رہا تھا۔ ایک پتیلے میں دال تھی۔ میں نے وہیں بیٹھ کر کھانا کھایا۔ جیب سے سگریٹ نکال کر پینے لگا۔ پھر اوپر اسی کمرے میں آکر چارپائی پر لیٹ گیا۔ اتنے دنوں سے سفر کرتا آیا تھا۔ میری آنکھ لگ گئی۔ جب جاگا تو کمرے کی بتی جل رہی تھی اور کالی داس انسٹرکٹر مجھے آہستہ آہستہ ہلا کر جگا رہا تھا۔

"مرلی پرشاد! او مرلی پرشاد۔ اٹھو"

"جی مہاراج!"

میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کالی داس مسکرایا۔ کہنے لگا۔

"نیچے آؤ۔ تمہیں نئی پارٹی کے لیڈر سے ملاؤں۔"

میں اٹھ کر اس کے ساتھ ہو گیا۔ میں نے سیڑھیاں اترتے ہوئے پوچھا۔

"یہ پارٹی کب پاکستان جا رہی ہے سر؟"

میں بڑا خوش تھا کہ ایک اور تخریب کار پارٹی کو نیست و نابود کرنے کا موقع مل رہا ہے۔ کچھ نہیں تو اس پارٹی میں چار پانچ ہندو تخریب کار تو ضرور ہوں گے۔ کالی داس بولا۔

"تمہارے سمیت چار آدمی ہوں گے۔ مگر اس بار تم امرتسر اٹاری والے بارڈر سے پاکستان میں داخل ہو گے۔"

"ٹھیک ہے سر!"

وہ مجھے تخریب کاری کے ٹریننگ سنٹر کے چیف لکشمی دیال کے کمرے میں لے آیا۔ وہ چائے پی رہا تھا۔ اس نے مجھے چائے بنا کر دی اور بڑے رازدارانہ انداز میں کہنے لگا۔

"تمہارے ساتھ تین اور آدمی ہوں گے۔ یہ بڑے پرانے سمگلر ہیں اور بارڈر کراس کرتے رہتے ہیں۔ اس بار یہ پاکستان میں ہمارے لئے بموں کے دھماکے کرنے جا رہے ہیں۔ ہم انہیں بھاری رقم ادا کر رہے ہیں۔ ویسے بھی چونکہ وہ ہماری طرح ہندو ہیں اسی لئے پاکستان کے خلاف تخریب کاری پر بڑی آسانی سے تیار ہو گئے ہیں۔ اس کے باوجود ہم انہیں معاوضہ بھی دیں گے۔ تم اس پارٹی کے لیڈر ہو گے۔"

میں دل میں بے حد خوش ہوا کہ یہ لوگ مجھ پر کس قدر اعتماد کر رہے ہیں۔ میری اداکاری واقعی کام کر گئی تھی۔ میں نے کہا۔

"سر! آپ کا دھنواد ہے۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ اس بار میں پاکستان جا کر وہ تباہی مچاؤں گا کہ وہاں کے لوگ مدتوں یاد کریں گے۔"

لکشمی دیال نے کالی داس کی طرف مسکرا کر دیکھا۔

"کالی داس! ہمیں ایسے جوان چاہئیں جو شیواجی مرہٹہ کا رول ادا کر سکیں"

وہ میری طرف متوجہ ہو کر بولا۔

"تینوں آدمی رات کو یہاں پہنچ جائیں گے۔ تمہاری پارٹی رات کے ٹھیک بارہ بجے یہاں سے ایک خاص ٹرک میں امرتسر کی طرف روانہ ہو گی۔ ریل گاڑی میں ہم تمہیں اس لئے نہیں بھیج رہے کہ ہم اس مشن کو خفیہ رکھنا چاہتے ہیں۔ امرتسر سے تمہیں ایک گاؤں میں لے جایا جائے گا۔ وہاں تمہیں ٹرک چھوڑ کر واپس آ جائے گا۔ آگے ایک سکھ سمگلر تم لوگوں کو ایک خاص جگہ سے بارڈر کراس کرائے گا۔ اور پاکستان کے اندر ایک خفیہ جگہ پر لے جائے گا جہاں ہمارا آدمی تمہیں بتائے گا کہ تم لوگوں نے پاکستان کے کس کس شہر میں بموں کے دھماکے کرنے ہیں۔ کوئی سوال پوچھنا ہو تو پوچھ سکتے ہو"

میں نے کہا۔

"سر! سب ٹھیک ہے۔ میں تو ابھی روانہ ہونے کے لئے تیار ہوں"

لکشمی دیال اٹھ کر میرے پاس آیا۔ میرے شانے کو سہلاتے ہوئے بولا۔

"شاباش! ہمیں تمہارے ایسے اگروادی اور پاکستان کے دشمن چاہئیں۔ ابھی تم جا کر

آرام کرو۔ جب وہ آدمی آئیں گے تو تمہیں بلا لیا جائے گا۔"

میں نمسکار کر کے اوپر کمرے میں آ گیا۔ یہ سوچ کر خوش ہو رہا تھا کہ مجھے ایک بار پھر پاکستان کے دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کا موقع مل رہا ہے۔ افسوس اس بات کا تھا کہ میرے پاس دھماکہ خیز محلول کی شیشی نہیں تھی۔ اس دفعہ مجھے ان لوگوں کو دوسری طرح سے ہلاک کرنا تھا۔ میرے لئے یہ کوئی مشکل بات نہیں تھی۔ ایک تجربہ کار کمانڈو کے پاس اپنے دشمن کو ہلاک کرنے کے واسطے کئی طریقے ہوتے ہیں۔ میں سگریٹ پیتا اور سوچتا رہا کہ اس بار ان تخریب کاروں کو کس طرح ہلاک کروں گا۔

اتنے میں انسٹرکٹر کالی داس بھی آ گیا۔ وہ مجھ سے ہمارے نئے مشن اور نئی پارٹی کے آدمیوں کے بارے میں باتیں کرنے لگا۔ اس نے مجھے خاص طور پر کہا۔

"مرلی پرشاد! تمہارے ساتھ جو آدمی جا رہے ہیں۔ یہ لوگ پیشہ ور سمگلر ہیں۔ تمہیں ان پر نگاہ رکھنی ہو گی۔ پاکستان پہنچ کر ان لوگوں کو اکیلا نہیں چھوڑنا۔ اپنی نگرانی میں ان سے بم لگوانا۔"

میں نے بڑی شان سے کہا۔

"سر! آپ فکر ہی نہ کریں۔ میں ان کی پوری نگرانی کروں گا اور ان پر کڑی نگاہ رکھوں گا۔ ہر ایک سے اس کی ڈیوٹی پوری لوں گا۔"

"شاباش!"

کالی داس نے وہیں چائے منگوالی۔ ہم چائے پیتے اور باتیں کرتے رہے۔ کالی داس کہنے لگا۔

"تم اس بار پہلا بم کا دھماکہ لاہور کے ریلوے سٹیشن پر کرو گے۔ ہم نے گوالمنڈی میں بم دھماکے کا پروگرام تبدیل کر دیا ہے۔ وہاں تم دو دن بعد دھماکہ کرو گے"

میں نے بڑے مصنوعی جوش کے ساتھ کہا۔

"سر! میں تو سب سے پہلے گوالمنڈی میں دھماکہ کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ وہیں میرے ماتا پتا جل کر مر گئے تھے۔"

کالی داس نے میری بات ٹوک کر کہا۔

"مر گئے تھے نہ کہو۔ سورگباش ہو گئے تھے کہا کرو"

فوراً مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ اصل میں میں مسلمان تھا۔ اگرچہ میں نے ہندو کا روپ دھار رکھا تھا مگر میں بولتے وقت ان لوگوں کے خاص خاص موقع پر بولے جانے والے خاص الفاظ بھول جاتا تھا۔ میں نے جلدی سے کہا۔

"سورگباش ہو گئے تھے۔"

اس طرح اپنے نئے مشن پر گفتگو کرتے رات کے ساڑھے گیارہ بج گئے۔ نیچے سے ایک آدمی نے آکر اطلاع دی کہ باہر سے تینوں مہمان آگئے ہیں۔ کالی داس بولا۔

"جلدی سے نیچے آجاؤ۔ کوئی خاص چیز ساتھ لے جانی ہے تو وہ بھی لے لو۔ تمہیں یہیں سے امرتسر اٹاری بارڈر کی طرف روانہ ہونا ہے"

نیچے لکشمی دیال کے کمرے میں تین دیہاتی قسم کے آدمی بیٹھے تھے۔ میں نے انہیں پرنام کیا۔ لکشمی دیال نے ان کا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

"مرلی پرشاد! یہ تمہاری پارٹی کے آدمی ہیں"

پھر اس نے ان سب کے باری باری نام بتائے۔ سب نے مجھے ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا۔
لکشمی دیال انہیں سمجھانے لگا۔

"مرلی پرشاد تمہارا پارٹی لیڈر ہو گا تمہیں اس کی ہر بات اس کا ہر حکم ماننا ہو گا۔ جیسے یہ کہے گا تم ویسے ہی کرو گے"

تینوں آدمیوں نے سرہلاتے ہوئے باری باری کہا۔

"صاحب ہم ایسا ہی کریں گے جیسا یہ لیڈر ہمیں بتائے گا۔"

تینوں آدمی پکی عمر کے تھے اور چہرے مہرے سے بڑے تجربہ کار اور چالاک لگ رہے تھے۔ ہم نے وہیں بیٹھ کر چائے پی۔ باہر کسی ٹرک کے قلعے کے احاطے میں داخل ہونے اور پھر رکنے کی آواز آئی۔ کالی داس نے کہا۔

"ٹرک آگیا ہے۔ بھگوان کا نام لے کر چل پڑو۔"

ہم باہر نکل آئے۔ لکشمی دیال نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر راز داری سے کہا۔

"مرلی! امرتسر کے قریب گاؤں میں جہاں یہ ٹرک تم لوگوں کو چھوڑ دے گا وہاں تمہیں ہمارا خاص آدمی ملے گا اس کا نام ہربھجن سنگھ ہے۔ وہاں سے تمہارا پارٹی لیڈر ہربھجن سنگھ ہو گا۔ وہی تمہیں بارڈر کراس کرائے گا۔ ذرا ہوشیار رہنا۔ مجھے تم پر بھروسہ ہے۔"

میں نے کہا۔

"سر! میری طرف سے نچنت رہیں یہ مشن بھگوان کی کرپا سے ہمارا سب سے کامیاب مشن ہو گا۔"

لکشمی دیال نے میرے کندھے پر ہاتھ پھیرا اور کہا۔

"شاباش! جاؤ۔ اور ٹھہرو"

اس نے بٹوے میں سے مجھے سو روپے کا نوٹ نکال کر دیا۔

"یہ اپنے پاس رکھو۔ ویسے ہربھجن سنگھ کے پاس کافی رقم ہو گی۔ تمہیں جتنی ضرورت ہو اس سے لے لینا۔ اسے میں نے خاص طور پر کہلوا بھیجا ہے کہ وہ تمہارا خاص خیال رکھے۔"

مجھے امید نہیں تھی کہ پانچ تخریب کاروں کو ہلاک کرنے کے بعد میرے ساتھ ایسا سلوک روا رکھا جائے گا۔ مجھے تو یہ بھی امید نہیں تھی کہ یہ لوگ میری من گھڑت کہانی کا اعتبار بھی کریں گے۔ لیکن انہوں نے نہ صرف مجھ پر اعتبار کر لیا تھا بلکہ مجھے پہلے سے زیادہ اپنے اعتماد میں لے لیا تھا۔

بس میں یہاں سے مار کھا گیا۔ کیسے مار کھا گیا۔ آپ کو آگے چل کر بتاؤں گا۔ میں کیا بتاؤں گا آپ کو خود بخود پتہ چل جائے گا۔ ٹرک عام سائز کے ٹرکوں ایسا تھا۔ صرف اس کی باڈی اوپر سے بند تھی۔ دونوں سائیڈوں پر کھڑکیاں بنی ہوئی تھیں۔ اندر آمنے سامنے صرف دو بنچوں کی طرح کی سیٹیں تھیں۔ سیٹوں پر تکیے پڑے تھے۔ یہ ہمارے آرام کرنے کے واسطے تھے۔ ہم سوار ہو گئے تو ٹرک چل پڑا۔ تینوں آدمی آہستہ آہستہ میرے ساتھ

کھل گئے اور ہم آپس میں بے تکلف بھی ہو گئے۔ ان کی طرف سے زیادہ بے تکلفی کا اظہار ہوا تھا۔ یہ تینوں ہندو تھے۔ ان کے بیان کے مطابق بارڈر پر سمگلنگ ان کا پیشہ تھا مگر لکشمی دیال نے انہیں بھاری رقم دینے کا وعدہ کیا ہے جس کی وجہ سے ہم پاکستان کے شہروں میں بم لگانے جا رہے ہیں۔ ایک آدمی جس کا نام سکھ بیر تھا۔ کہنے لگا۔

"مہاراج ہم نے آدھی رقم دلی میں ہی ان سے وصول کر لی ہے کیا معلوم یہ بعد میں مکر جائیں۔"

میں نے لکشمی دیال کی طرف داری کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں بھائی سکھ بیر! یہاں اس قسم کی بات نہیں ہوتی۔ جتنی رقم باقی ہے وہ جب تم پاکستان میں اپنا کام پورا کر لو گے تو تمہیں اسی وقت ادا کر دی جائے گی۔"

دلی سے امرتسر تک سفر بڑا لمبا تھا۔ ٹرک جب جمنا کا پل پار کرنے کے بعد شہر کے مضافات سے گزرتا ہوا جی ٹی روڈ پر آیا تو میں نے کہا۔

"دوستو! مجھے تو نیند آ رہی ہے۔ میرا خیال ہے تم بھی تھوڑی دیر آرام کر لو"

میں سیٹ پر سرہانے پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔ ایک آدمی سامنے والی بنچ پر لیٹ گیا۔ باقی دونوں بنچ کے کونوں پر آمنے سامنے بیٹھے سگریٹ پیتے اور باتیں کرتے رہے۔ ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر اس کا کلینر لڑکا بیٹھا تھا۔ ٹرک کا پچھلا حصہ آدھا بند تھا۔ اوپر سے خوب ہوا اندر آ رہی تھی۔ مجھے بڑی جلدی نیند آ گئی۔ رات کے چار بجے کے قریب میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے سکھ بیر نے بتایا کہ رات کے چار بج گئے ہیں۔ ہم لوگ رات کے پچھلے پہر کو بھی رات ہی کہتے ہیں تاوقتیکہ صبح نہ ہو جائے۔ میں نے سکھ بیر سے پوچھا۔

"سکھ بیر! ہم کہاں تک آ گئے ہیں؟"

وہ بولا۔

"بس جی میرٹھ گزر گیا ہے۔ آگے مظفر نگر آئے گا۔ پھر سہارن پور اور آگے انبالہ۔"

ٹرک مظفر نگر رک گیا۔ یہاں اتر کر ہم نے لاری اڈے کی کینٹین پر چائے پی۔ کچھ

دیر آرام کیا اس کے بعد ٹرک جی ٹی روڈ پر سہارن پور کی جانب روانہ ہو گیا۔ مظفر نگر میں ہی دن نکل آیا تھا۔ مگر ناشتہ ہم نے مظفر نگر سے آگے ایک چھوٹے سے شہر دیو بند میں کیا۔ یہاں سے ٹرک روانہ ہوا تو دوپہر سے تھوڑا پہلے ہم سہارن پور میں تھے۔ سہارن پور تھوڑی دیر کے لئے رکے اس کے بعد انبالہ آ گیا۔ مجھے پنجاب کی ڈی آئی جی پولیس کی طوائف بیوی ہرپال کور یاد آ گئی۔

انبالے سے ہم لدھیانے اور پھر جالندھر پہنچ گئے۔ یہاں سے امرتسر چالیس میل کے قریب ہی تھا۔ اس وقت تک شام ہو چکی تھی۔ امرتسر کے سیڑھیوں والے پل کے ٹرکوں کے اڈے پر ٹرک کھڑا ہو گیا۔ یہاں ہم نے کھانا کھایا۔ ٹرک کا ڈرائیور ہماری خاطرداری میں لگا ہوا تھا۔ ہمیں امرتسر کے سرحدی گاؤں اٹاری پہنچانے کی اس کی ڈیوٹی تھی۔ وہ ہر سٹیشن پر جہاں ٹرک رکتا تھا ہمیں آ کر پوچھ لیتا تھا کہ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔ ہمارے ناشتے چائے سگریٹ اور کھانے وغیرہ کا بل بھی وہی ادا کرتا تھا۔ مجھے ایسے لگ رہا تھا جیسے ہم کہیں پک نک منانے جا رہے ہیں۔ کھانا وغیرہ کھانے کے بعد ہم ٹرک میں سوار ہو گئے۔ ڈرائیور نے ہمیں بتا دیا کہ اب ہم اٹاری بارڈر والے گاؤں میں ہی جا کر رکیں گے۔

"ٹرک کی کھڑکیاں بند کر دو یہاں پاکستانی جاسوس بھی ہوتے ہیں"

ڈرائیور کی ہدایت پر ہم نے ٹرک کی کھڑکیاں بند کر دیں۔ ٹرک میں اندھیرا ہو گیا۔ پیچھے جو ٹرک کا آدھا حصہ کھلا تھا ڈرائیور نے اس پر بھی ترپال ڈال دی۔ میں نے کہا۔

"یار اندر تو اندھیرا ہو گیا ہے"

سکھ بیر بولا۔

"کوئی بات نہیں بھائیا جی! اٹاری یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ آدھے گھنٹے میں وہاں پہنچ جائیں گے۔ پھر ساری کھڑکیاں کھول دیں گے۔"

یہ سب کچھ ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت ہو رہا تھا جس کے بارے میں ان سب کو معلوم تھا۔ ٹرک ایک طرف گھوم کر آگے کو چل پڑا۔ مجھے لگا کہ ٹرک ایک چڑھائی چڑھ

رہا ہے۔ یہ امرتسر کے ریلوے پل کی چڑھائی تھی۔ یہاں سے ٹرک سیدھا چلنے لگا۔

ہم اندھیرے میں بیٹھے تھے ٹرک کوئی دس ایک منٹ تک چلتا رہا۔ اس نے ایک موڑ کاٹا۔ تھوڑی دیر کے لئے رکا۔ پھر چل پڑا۔ مگر اس کی رفتار بڑی آہستہ تھی۔ پھر ایک طرف کو گھوم کر رک گیا۔ ڈرائیور نے آکر پیچھے دروازے پر پڑی ہوئی ترپال اتار دی اور لوہے کا کنڈا اتار کر دروازے کا آدھا حصہ بھی نیچے گرا دیا۔ ٹرک میں باہر کی روشنی آگئی۔ یہ روشنی سامنے لگے ایک کھمبے پر جلتے بلب کی تھی۔ کھمبے کی روشنی میں مجھے تین وردی پوش سپاہی جنہوں نے رائفلیں اٹھا رکھی تھیں ٹرک کی طرف تیز تیز چلتے نظر آئے۔ میرے دل نے فوراً کہا۔

"دوست! پھنس گئے ہو"

میری پارٹی کے تینوں آدمی چھلانگیں لگا کر ٹرک سے اتر گئے۔ میں ابھی تک عجیب الجھن میں بنچ پر ہی بیٹھا تھا کہ ایک سکھ وردی پوش سپاہی نے ٹرک کے پاس آکر کہا۔

"نیچے آؤ اوئے تم بھی"

میری پارٹی کے آدمی ہنس ہنس کر سپاہیوں سے باتیں کرنے لگے۔ ایک نے ان میں سے کسی حوالدار کو مخاطب کر کے کہا۔

"بچن سنگھ! سنبھالو اپنے آدمی کو"

تین سپاہی جن میں حوالدار بچن سنگھ بھی تھا ٹرک میں آگئے انہوں نے مجھے بازوؤں سے پکڑ کر کھینچ کر نیچے اتار لیا۔ دو سپاہی رائفلیں لے کر میرے دائیں بائیں ہو گئے۔ میں نے کہا۔

"تم کون ہو؟ مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟"

حوالدار بچن سنگھ نے مجھے زور سے ایک تھپڑ مارا اور گالی دے کر کہا۔

"تمہیں پاکستان لے جا رہے ہیں۔"

مجھے میری غفلت اور بے سمجھی کی سزا مل رہی تھی۔ ان لوگوں نے بڑی مکاری اور عقل مندی سے مجھے اپنے جال میں پھنسا لیا تھا۔ تخریب کاری ٹریننگ سنٹر کا لکشمی دیال

اور کالی داس مجھ سے زیادہ چالاک اور ہوشیار ثابت ہوئے تھے۔ میں نے ان کے سامنے جو کہانی گھڑ کر بیان کی تھی اس سے وہ سمجھ گئے تھے کہ میں ڈرامہ کر رہا ہوں اور پارٹی کے آدمیوں کو میں نے ہی ہلاک کیا ہے اور یہ کہ میں پاکستان کا جاسوس ہوں۔ خود مجھے اپنی حراست میں لے کر پوچھ گچھ کرنے کی بجائے انہوں نے باقاعدہ سکیم بنا کر مجھے امرتسر جیل کے حوالے کر دیا تھا۔ جہاں سے میرا بھاگنا اتنا آسان نہیں تھا۔ جو حقائق مجھے بعد میں معلوم ہوئے ان کی تھوڑی سی جھلک میں آپ کو بیان کرتا چلوں۔

انڈیا کے مشرقی پنجاب میں سات جیل خانے اپنی بربریت اور پاکستانی شہریوں کے ساتھ غیر انسانی درندوں ایسا سلوک کرنے میں سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ ان میں نابقہ، فیروز پور، گورداسپور، امرتسر، جالندھر، پٹیالہ اور لدھیانہ کے جیل خانے ہیں۔ ان جیل خانوں میں بڑا ظالم عملہ رکھا جاتا ہے۔ ان جیلوں میں جرائم پیشہ قاتل اور ڈاکوؤں کے ساتھ ان پاکستانیوں کو بھی قید میں رکھا جاتا ہے۔ جنہیں بھارت میں ویزے کی مدت گزر جانے کے بعد پکڑ لیا جاتا ہے۔ یا بارڈر پر کوئی دیہاتی بھول کر انڈیا کے بارڈر والے کسی کھیت میں داخل ہو جاتا ہے تو اسے بھی پکڑ کر ان میں سے کسی جیل میں ڈال دیا جاتا ہے۔ ان سب پر یہی الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ پاکستان کے جاسوس ہیں۔ آج بھی ان جیلوں میں ایسے کتنے ہی بے گناہ پاکستانی شہری تشدد اور قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر رہے ہیں اور ان کا کوئی پرسان حال یا والی وارث نہیں۔ ایسے بھی پاکستانی ہیں جنہیں ان کے کنبوں کے ساتھ پکڑ لیا گیا۔ ان جیلوں میں معصوم پاکستانی بچے بھی اپنی ماؤں کے ساتھ قید ہیں۔ ان کو روز مارا پیٹا جاتا ہے اور ان سے صرف ایک ہی سوال پوچھا جاتا ہے۔

"بتاؤ بھارت میں اور کتنے پاکستانی جاسوس ہیں۔"

ان بے گناہ پاکستانیوں کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہوتا چنانچہ ان پر دلناک تشدد کیا جاتا ہے اور ان میں سے کوئی پاکستانی تشدد سے ہلاک ہو جاتا ہے تو اسے وہیں گڑھا کھود کر دبا دیا جاتا ہے۔ یہ حقائق خاص طور پر پاکستان کے ان نوجوانوں کو بتا رہا ہوں جو انڈیا کی وڈیو فلمیں گھر لے جا کر بڑے شوق سے دیکھتے ہیں۔ ان کے چترہار کے نیم

عریاں فحش فلمی گانے سنتے ہیں اور آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس کو خط لکھتے ہیں کہ
آپ کے پروگرام اور آپ کی فلمیں بڑی پسند ہیں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ تم پاکستا
ان بے غیرت نوجوانوں کو ان جیلوں میں لے جا کر دکھاؤں کہ دیکھو جس بھارت کی
دیکھے بغیر تمہیں نیند نہیں آتی اس بھارت کے لوگ تمہارے بھائی بہنوں کے ساتھ
درندگی کا سلوک کر رہے ہیں اور کس طرح پاکستان کو دن رات برا بھلا کہتے رہتے
حوالدار بچن سنگھ تو جب بھی میری کوٹھڑی کے قریب سے گزرتا تو مجھے گالی دے
ضرور کہتا۔

"بلاؤ اپنے پاکستان کو۔ کہاں ہے تمہارا پاکستان۔"

مجھے اسی وقت معلوم ہو گیا تھا کہ یہ امرتسر کی جیل ہے۔ اس جیل میں پاکستانیو
ہونے والے ظلم و ستم کی کہانیاں میں دلی بمبئی میں بہت سن چکا تھا۔ اب میں خود
ظلم و ستم سہنے کے لئے لایا گیا تھا۔

دو آدمی مجھے گھسیٹ کر ایک کوٹھڑی میں لے آئے اور اس کا سلاخوں والا
بند کر کے باہر تالا لگا دیا۔ جیسا کہ بعد میں مجھے معلوم ہوا امرتسر کی جیل کی دو
بیرکیں تھیں۔ ان بیرکوں میں چھوٹی چھوٹی کتنی ہی کوٹھڑیاں تھیں۔ یہ قیدیوں کی کو
تھیں جنہیں جیل کی اصطلاح میں چکیاں کہا جاتا تھا۔ یہ کوٹھڑیاں کوئی دس فٹ
گیارہ بارہ فٹ چوڑی تھیں۔ ان میں تین تین چار چار قیدیوں کو جانوروں کی طرح
دیا جاتا۔ میں چونکہ نیا نیا آیا تھا اور مجھ سے پوچھ گچھ کا سلسلہ شروع ہونے والا تھا
مجھے جنوبی بیرک کی کوٹھڑی میں اکیلا رکھا گیا تھا۔ مجھے کوٹھڑی میں پڑے بمشکل با
گزرے ہوں گے کہ میرے پاؤں میں لوہے کی بیڑیاں ڈال دی گئیں اور اسی طرح
کر جیل کے سپرنٹنڈنٹ کے آفس میں لے جایا گیا جس کے کمرے کے باہر ایس
لکھا ہوا تھا۔ اندر جا کر دیکھا کہ وہ ایک سکھ تھا جس کی آنکھیں لومڑی کی آنکھو
مشابہت رکھتی تھیں۔ اس نے سپاہیوں کو ایک طرف کھڑے ہونے کا اشارہ کیا
دس پندرہ سیکنڈ تک گھورنے کے بعد کہنے لگا۔

"یہاں بھارت میں اور کون کون سے پاکستانی جاسوس ہیں؟؟"
میں نے صاف انکار کرتے ہوئے کہا۔

"میں پاکستانی جاسوس نہیں ہوں۔"

اس سپرنٹنڈنٹ کا پورا نام سکھوندر دندر سنگھ دگل تھا۔ میں اسے دگل سنگھ ہی کہوں
گا۔ اس نے ایک ایسی بات کہہ دی جس سے میرے اندر حوصلہ پیدا ہو گیا۔ کہنے لگا۔

"تمہیں شرم آنی چاہیے کہ ہندو ہو کر پاکستان کے لئے جاسوسی کرتے ہو"

اس کا مطلب تھا کہ یہ لوگ مجھے ہندو ہی سمجھ رہے تھے۔ میں نے بڑے اعتماد کے
ساتھ کہا۔

"سردار صاحب ان لوگوں کو میرے بارے میں غلط رپورٹ ملی ہے۔ میں دیش بھگت
ہوں اسی لئے پاکستان کے شہروں میں بم لگانے جا رہا تھا۔"

دگل سنگھ اس دوران ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھتا رہا۔ کہنے لگا۔

"مگر تم نے تو اپنی پارٹی کے سارے آدمیوں کو مار ڈالا تھا۔ ہندو ہو کر تم نے ایسا کیوں
کیا؟"

میں نے کہا۔

"سر! میں نے انہیں نہیں مارا۔ بارڈر پر پاکستانی رینجر فورس سے مقابلہ ہو گیا اور
میرے ساتھی ان کی فائرنگ سے ہلاک ہو گئے۔"

لگتا تھا کہ میری باتوں کا دگل سنگھ پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے ایک فائل
کھول کر سامنے رکھ لی۔ مجھ سے پوچھا۔

"تم برہمن ہندو ہو؟"

"ہاں جی۔ برہمن ہندو ہوں۔ میرا نام مرلی پرشاد ہے"

دگل سنگھ نے ایک سپاہی کو کہا۔

"اس کی پتلون اتارو"

سپاہی نے فوراً آرڈر پر عمل کرتے ہوئے میری پتلون اتار دی۔ میرے مسلمان

ہونے کا حتمی ثبوت نہیں مل گیا تھا۔ دگل سنگھ نے مجھے اور پاکستان کو گالی دے کر کہا۔

"میرا نام دگل ہے۔ سکھوندر سنگھ دگل۔ میں تو پاکستانی جاسوس کو اس کی چال سے پہچان لیتا ہوں۔ لے جاؤ اوئے اسے صبح اس کی خبر لوں گا۔ دیکھتا ہوں کیسے یہ اپنے ساتھی جاسوسوں کے نام نہیں بتاتا۔"

میرے پاؤں میں بیڑیاں پڑی تھیں۔ میرا کھیل ختم ہو گیا تھا۔ اب شک شبے کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہی تھی۔ سپاہی مجھے کھینچتے ہوئے باہر لے گئے۔ باہر لے جا کر انہوں نے میری مار کٹائی شروع کر دی۔ وہ مجھے لاتیں اور گھونسے مار رہے تھے اور پاکستان کو برا بھلا کہہ رہے تھے۔ وہ مجھے گھسیٹتے ہوئے وہاں سے لے گئے کوٹھڑی میں بند کر دیا۔ میں سخت جان کمانڈو تھا۔ مگر ان لوگوں نے مجھے کچھ اس طرح سے مارا پیٹا تھا کہ میرا سارا جسم پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر گزری ہو گی حوالدار بچن سنگھ ایک آدمی کے ساتھ اندر آگیا۔ انہوں نے آتے ہی مجھ پر تھپڑوں اور گھونسوں کی بارش برسا دی۔ میں جواب میں ان کی گردنیں توڑ سکتا تھا لیکن اگر ایسا کرتا تو مجھے وہیں شوٹ کر دیا جاتا۔ پھر انہیں ہلاک کرنے کا جواز مل جاتا۔ میں ان کی پٹائی سہتا رہا اور یہی کہتا رہا کہ میں پاکستانی جاسوس نہیں ہوں۔ میں بارڈر کے گاؤں آیا ہوا تھا۔ غلطی سے بارڈر کراس کر کے انڈیا میں آگیا۔ اور سوچا کہ دلی کی بھی سیر کرتا جاؤں۔

"اور راشٹریہ سیوک سنگ میں تیرا باپ گیا تھا؟ وہاں کیا لینے گئے تھے؟"

حوالدار بچن سنگھ نے یہ کہہ کر ایک بار پھر میری پٹائی شروع کر دی۔ وہ اس بے دردی سے مجھے پیٹ رہا تھا جیسے میں اس کا ازلی دشمن ہوں۔ اس میں کوئی شک بھی نہیں تھا۔ بھارت کا ہندو اور ہر سکھ پاکستان کے مسلمان کو اپنا ازلی دشمن سمجھتا ہے۔ جب وہ مجھے مار مار کر تھک گیا تو دوسرے آدمی نے میری کٹائی شروع کر دی۔ اس وقت میں نے ابھی کمانڈو ٹریننگ سے کام لیتے ہوئے اپنے جسم کو سخت بنا لیا اور اپنے اوپر بے ہوشی طاری کر لی۔ میرا جسم بے حس ہو گیا تھا مگر میں پوری طرح سے ہوش میں تھا۔ اور ان لوگوں کو نیم وا آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ مجھے فرش پر بے حس پڑا دیکھ کر وہ لوگ رک

گئے۔ جو آدمی مجھے پیٹ رہا تھا اس نے کہا۔

"حوالدار! یہ تو مر گیا ہے"

"نہیں اوئے۔ اسے ابھی نہیں مارنا۔ اس سے دوسرے پاکستانی جاسوسوں کا پوچھ کر مارنا ہے۔"

انہوں نے میری نبض دیکھی اور پھر مجھے وہیں چھوڑ کر چلے گئے۔ ساری رات میں نے جگہ جگہ سے درد کرتے جسم کی اذیت برداشت کرتے گزار دی۔ صبح ہوئی تو مجھے کوٹھڑی سے نکال کر ایک دوسری کوٹھڑی میں پہنچا دیا گیا۔ اس کوٹھڑی میں چھت کے ساتھ دو زنجیریں لٹک رہی تھیں۔ دیوار کے ساتھ دو تین سٹول پڑے تھے۔ ایک طرف لوہے کا شکنجہ دیوار کے ساتھ لٹک رہا تھا۔

مجھے فرش پر پھینک دیا گیا۔ ایک آدمی چھت کی زنجیر کو ادھر ادھر کرنے لگا۔ اتنے میں دگل سنگھ دو آدمیوں کے ساتھ اندر آکر سٹول پر بیٹھ گیا۔ اس نے مجھ سے پوچھ گچھ شروع کر دی۔

"اگر تم مجھے اپنے ساتھی جاسوسوں کے نام پتے بتا دو تو میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں نہ صرف چھوڑ دوں گا بلکہ تمہیں بارڈر کراس کرا کر پاکستان بھی بھجوا دوں گا۔ بولو۔ کیا کہتے ہو؟ تمہارے ساتھی کون کون ہیں اور بھارت کے کس کس شہر میں ہیں؟"

میں نے درد کی ٹیسیں برداشت کرتے ہوئے کہا۔

"میرا کوئی ساتھی نہیں ہے۔ میں پاکستانی جاسوس نہیں ہوں"

دگل سنگھ نے اشارہ کیا۔ دو آدمی آگے بڑھے۔ ایک نے میرے پاؤں زنجیر کے ساتھ باندھے۔ دوسرے آدمی نے دوسری زنجیر کو کھینچنا شروع کر دیا۔ اوپر چرخی لگی تھی۔ میں الٹا ہو کر لٹک گیا۔ میرا سر فرش سے کوئی پانچ فٹ اونچا تھا۔ باہر سے مٹی کا ایک بڑا پیالہ لا کر میرے سر کے نیچے رکھ دیا گیا۔ اس میں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ یہ دھواں میری ناک اور منہ میں گھسنے لگا۔ یہ ہرمل کا دھواں تھا۔ میں نے سانس روک لیا۔ لیکن کب تک سانس روک سکتا تھا۔ سانس لیا تو سارا دھواں میرے پھیپھڑوں میں داخل ہو گیا۔ مجھے

بے اختیار کھانسی آگئی۔ میری زنجیر کو ایک آدمی نے بانس سے پکڑ رکھا تھا۔

دگل سنگھ کی آواز آئی۔

"اب بھی بتا دو تمہارے دوسرے ساتھی کہاں کہاں پر ہیں۔ ان کی نشاندہی کر میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔"

میں نے کہا۔

"میں پاکستانی جاسوس نہیں ہوں"

اس کے ساتھ ہی دھواں ایک بار پھر میرے منہ اور ناک کے رستے پھیپھڑوں بھر گیا اور میں بری طرح کھانسنے لگا۔ مجھے میرے انسٹرکٹر مرد مومن کمانڈو کمال شاہ ہوشنگ آباد کے جنگل میں بڑی زبردست اور ہر قسم کی اذیت برداشت کرنے کی ٹرینگ دی تھی مگر مجھے دھونی نہیں دی تھی۔ مجھے جو دھونی دی جا رہی تھی اس نے مجھے بے کر دیا۔ اگرچہ میں سخت جان تھا۔ مگر آخر انسان تھا۔ جب تکلیف میری برداشت سے ہو گئی اور میرا سانس رکنے لگا تو میں واقعی بے ہوش ہو گیا۔

جب ہوش آیا تو میں سٹول پر بیٹھا تھا۔ دو آدمیوں نے مجھے بازوؤں سے پکڑ رکھا میرے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے جا رہے تھے اور میرا سر لوہے کے شکنجے میں جکڑا ہوا دگل سنگھ میرے سامنے سٹول پر بیٹھا تھا۔ مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر اس نے کہا۔

"بتاؤ تمہارے ساتھی جاسوس کہاں کہاں پر ہیں؟"

میں نے کہا۔

"میں جاسوس نہیں ہوں۔ نہیں ہوں۔"

یقین کریں دھونی نے میرے جسم کی جیسے ساری طاقت چھین لی تھی۔ میرے شکنجے میں کسا جانے لگا۔ جب مجھے اپنی کھوپڑی چٹختی ہوئی محسوس ہونے لگی تو میں نے کہ کیوں نہ ان لوگوں کو جھوٹ موٹ دو چار مسلمانوں کے نام بتا دوں اور پتے بھی سلط بتا دوں۔ آپ ہی ڈھونڈتے پھریں گے۔ کم از کم میری جان تو اس عذاب سے چ گی۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"بتاتا ہوں"

اس وقت شکنجہ ڈھیلا ہو گیا۔ دگل سنگھ نے اشارہ کیا میرے سر سے شکنجہ اتار لیا گیا۔ مجھے پانی پلایا گیا۔ دگل سنگھ خوش ہو کر کہنے لگا۔

"پہلے بتا دیتے تو کیا حرج تھا بتاؤ۔ کیا نام ہیں تمہارے ساتھی جاسوسوں کے اور وہ کہاں کہاں پر ہیں۔"

پانی پینے کے بعد میری حالت کچھ سنبھل گئی۔ میں نے کہا۔

"میرا صرف ایک ہی ساتھی جاسوس ہے اس کا نام خدا بخش ہے۔ وہ ناگ پور کے محلہ چاندی والا کے مکان نمبر 15 میں رہتا ہے۔"

ناگ پور شہر کا نام میں نے اس لئے لیا تھا کہ وہ وہاں سے بہت دور تھا۔ اس طرح بھی انہیں دو چار دن لگ جاتے۔ دگل سنگھ نے فائل پر یہ نام اور پتہ لکھ لیا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

"دلی میں تم جس آدمی گل خان کے پاس رہتے تھے تم نے اس کا نام نہیں لیا وہ بھی تو تمہارا ساتھی ہے۔"

میں سنبھل گیا۔ گل خان پر شک پڑنا قدرتی بات تھی۔ ظاہر ہے گل خان نے ہی مجھے کانگریسی مسلمان رحیم بخش کے ذریعے تخریب کار ٹریننگ سنٹر کے ڈائریکٹر لکشمی دیال سے ملایا تھا اور اسی کی سفارش پر مجھے ہندو سمجھ کر بھرتی کیا گیا تھا۔ اس اعتبار سے گل خان کا پکڑا جانا یقینی بات تھی۔ کانگریسی مسلمان رحیم بخش نے تو یہ کہہ کر اپنی جان چھڑا لی ہو گی کہ گل خان اسے لے کر میرے پاس آیا تھا۔ میرا اس جاسوس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں سوچنے لگا نہ جانے ہمارے ماسٹر سپائی گل خان پر کیا گزر رہی ہو گی۔ لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ ضرور روپوش ہو گیا ہو گا۔ ایک اور بات بھی مجھے مسلسل پریشان کئے ہوئے تھی۔ ان لوگوں کو ابھی میرے سابقہ ریکارڈ کا علم نہیں ہوا تھا۔ انہیں بالکل علم نہیں ہو سکا تھا کہ میں وہی کمانڈو ہوں جس نے بھوپال لائن پر اسلحہ سے بھری ہوئی فوجی گاڑی اور دوار کا فورٹ کا فوجی گولہ بارود کا ذخیرہ اڑایا تھا اور راجستھان کے ایٹمی سنٹر میں بھی میں نے

ہی دھماکہ کیا تھا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ لکشمی دیال نے مجھے دلی پولیس کے حوالے کرنے کی بجائے راتوں رات امرتسر جیل کی طرف روانہ کر دیا تھا۔ اس کی وجہ مجھے بعد میں معلوم ہوئی اور وہ یہ تھی کہ دگل سنگھ لکشمی دیال کا دوست تھا اور وہ چاہتا تھا کہ امرتسر جیل میں مجھے ٹارچر کر کے مجھ سے دوسرے پاکستانی جاسوسوں کے بارے میں معلومات حاصل کی جائیں۔ اگر وہ مجھے دلی پولیس کے حوالے کر دیتا تو عین ممکن تھا کہ میرا سابقہ گجرات کا ریکارڈ بھی پہنچ جاتا اور پھر مجھے ملٹری انٹیلی جینس کے حوالے کر دیا جاتا اور انڈیا کی ملٹری انٹیلی جینس کے ہاتھوں میرا زندہ بچنا مشکل تھا۔

میں نے گل خان کے بارے میں دگل سنگھ سپرنٹنڈنٹ امرتسر جیل کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

"وہ میرا ساتھی نہیں ہے۔ میں اس کے آگے اپنے آپ کو ہندو ظاہر کر کے اس کے ہاں صرف دو چار دن کے لئے ٹھہرا تھا۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ اس کے کانگریسی مسلمان کے ساتھ تعلقات ہیں اور اس کی سفارش سے میں راشٹریہ سیوک سنگ میں بھرتی ہو سکتا ہوں۔"

دگل سنگھ نے کہا۔

"اس معاملے کی تفتیش بعد میں ہو گی۔ پہلے تم نے جو مجھے جو نام بتایا ہے ان کی تصدیق ہو جائے۔ یاد رکھو اگر تم نے غلط نام بتایا ہے تو تمہیں اسی کوٹھڑی میں پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا"

میں سر جھکا کر خاموش رہا۔

مجھے میری پہلی والی کوٹھڑی میں ڈال دیا گیا۔

مجھے کھانے کے لئے روٹی دی گئی جس کے اوپر دال کا پوچا پھیر دیا گیا تھا۔ میرے ساتھ پاکستانی جاسوس قیدیوں والا بدترین سلوک ہی ہوتا رہا۔ فرق صرف اتنا پڑا تھا کہ مجھ پر تشدد نہیں کیا جاتا تھا۔ ناگ پور پولیس کو ان لوگوں نے ضرور خبر کر دی ہو گی کہ اس نام کے آدمی کا فلاں محلے میں جا کر پتہ کیا جائے اور اگر وہاں پر ہو تو اسے فوراً گرفتار کر کے امرتسر جیل روانہ کر دیا جائے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ امرتسر پولیس نے اپنی پولیس پارٹی ناگ پور روانہ کر دی ہو۔

اس طرح مجھے کچھ آرام کے دن مل گئے۔ مجھے بد روح چندریکا کا خیال بھی آیا کہ وہ مجھ سے انتقام لے رہی ہے۔ اگر میں نے اس کی بات مان لی ہوتی تو اس وقت وہ ضرور میری مدد کرتی۔ جس طرح کہ پہلے وہ اس قسم کے حالات میں ہمیشہ میری مدد کرتی رہی تھی۔ مگر وہ مجھے بھارت میں ہندو بن کر رہنے کے لئے کہہ رہی تھی۔ اس کی شرط یہ تھی کہ میں انڈین ملٹری کے اسلحہ خانوں اور گولہ بارود کے ذخیروں کو تباہ نہ کروں۔ یہ شرط میں کیسے مان سکتا تھا۔ میرا تو مشن ہی یہی تھا۔ اور پھر میں صرف وہ ذخیرے اڑا رہا تھا جس کا اسلحہ اور گولہ بارود کشمیر کے محاذ پر مجاہدین کے خلاف استعمال ہونا تھا۔ یہ ایک محب وطن پاکستانی اور سچے مسلمان کا فرض تھا جسے میں ادا کر رہا تھا۔ میں اپنے مشن سے ایک قدم بھی پیچھے نہیں ہٹ سکتا تھا۔ چنانچہ چندریکا کی بدروح میری دشمن ہو گئی تھی۔ مجھے مغل شہزادے کی روح کی پیش گوئی بھی یاد آ رہی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ مجھ پر عنقریب ایک بہت بڑی آفت نازل ہونے والی ہے۔ خدا جانے شاید وہ یہی آفت تھی کہ میں بھارتی درندوں کے قابو آ گیا تھا جو میرے ساتھ جانوروں سے بھی بدتر سلوک کر رہے تھے۔ مجھے

تشدد کا خوف نہیں تھا۔ افسوس اس بات کا تھا کہ میرے کمانڈو مشن کی سرگرمیاں رک گئی تھیں۔

میں نے رات کو کوٹھڑی کے فرش پر پڑے پڑے وہاں سے فرار کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ کیونکہ مجھے اس جہنم سے صرف اسی صورت نجات مل سکتی تھی کہ میں کسی طریقے سے وہاں سے فرار ہو جاؤں۔ اگر میں کسی تھانے کے حوالات میں ہوتا تو وہاں سے فرار میرے لئے آسان تھا۔ کیونکہ تھانے میں عملہ زیادہ نہیں ہوتا اور پھر وہاں لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا ہے اور ایک دلیر کمانڈو کو فرار کا موقع مل جاتا ہے۔ لیکن یہ جیل تھی اور بہت بڑی جیل تھی جس میں عملے کے علاوہ مسلح پولیس کی پوری پلٹن ہر وقت پہروں پر موجود رہتی تھی۔ دوسرے یہ کہ جیل کی دیوار جس نے جیل کو گھیر رکھا تھا کم از کم چار مرد اونچی تھی۔ ایک تو وہ کوٹھڑی تھی جس میں مجھے بند کیا ہوا تھا۔ اس کا دروازہ بھی سلاخوں والا تھا۔ اس کے آگے راہ داری تھی۔ اس کا دروازہ بھی سلاخوں والا تھا۔ اس طرح سے مجھے پہلے دو سلاخوں والے دروازے میں سے گزرنا تھا۔ اس کے بعد جیل کی اونچی دیوار پر چڑھنا تھا۔ جیل کے چاروں کونوں پر اونچی مچانیں بنی ہوئی تھیں جہاں بندوقیں رائفلیں لئے ہندو سکھ سپاہی دن رات پہرے پر موجود رہتے تھے۔ رات کے وقت تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد سرچ لائٹ کی روشنی دیوار کے دونوں جانب ڈالی جاتی تھی کہ کہیں کوئی قیدی بھاگنے یا نقب لگانے کی کوشش تو نہیں کر رہا۔ جیل کی دیوار کے ساتھ اندر کی طرف رات کو گشتی پہرہ بھی ہوتا تھا۔

اپنے ایک جعلی جاسوس کا نام اور پتہ بتا دینے کے بعد میرے پاؤں کی بیڑیاں اتار دی گئی تھیں اور رات کے سات آٹھ بجے ایک رائفل بردار سپاہی مجھے تین چار منٹ کے لئے ٹہلائی کے لئے بھی لے جاتا تھا۔ مجھے بیرک کے ساتھ ہی ٹہلایا جاتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ یہ رعایت چند روز کے لئے ہے جب انہیں پتہ چلا کہ میں نے فرضی آدمی کا نام بتایا تھا تو مجھ پر دوبارہ تشدد شروع ہو جائے گا اور مجھے بیڑیاں دوبارہ پہنا دی جائیں گی جیل سپرنٹنڈنٹ دگل سنگھ نے یقیناً امرتسر سے پولیس پارٹی کو ناگ پور روانہ کیا تھا۔ شا

اسے ناگ پور کی پولیس پر اعتبار نہیں تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس بات کو تین دن مزید گزر گئے اور مجھ پر کسی قسم کی قیامت نہ ٹوٹی۔ اسی دوران میں فرار کی سکیموں پر غور کرتا رہا۔ بظاہر اس جیل خانے سے مجھے فرار کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ امرتسر کی جیل میں سیکورٹی کا بڑا سخت انتظام تھا۔ کوئی بھی قیدی لوہے کے جنگلے والے تین دروازے توڑ کر بڑے گیٹ تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ بڑے گیٹ کے دروازے پر بھی لوہے کی موٹی موٹی سلاخیں لگی تھیں اور وہاں ہر وقت گارڈ موجود رہتی تھی۔ میں یہاں کوئی سکیم بنا کر ہی فرار ہو سکتا تھا اور فرار کی کوئی سکیم وہاں میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

لیکن کہتے ہیں کہ جب خدا مہربان ہو تو غیب سے آدمی کی مدد کا سامان مہیا ہو جاتا ہے۔ ایک رات کیا ہوا کہ سپاہی میری ٹہلائی کروا رہا تھا کہ ایک ٹرک جیل کے گیٹ سے اندر آیا اور سامنے والی جیل کی بڑی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اس میں سے ڈرائیور نکل کر جیل کے اس طرف چلا گیا جدھر جیل کا تنور وغیرہ تھا۔ اس وقت میں کچھ فاصلے پر شمالی بیرک کے پیچھے ٹہل رہا تھا اور رائفل اٹھائے سپاہی مجھ سے چند قدم دور بڑا ہوشیار ہو کر کھڑا میری طرف دیکھ رہا تھا۔ ٹرک کو میں نے بڑے غور سے دیکھا۔ ٹرک کا پچھلا حصہ جیل کی دیوار کے بالکل ساتھ لگا ہوا تھا اور اس کے اوپر دیوار صرف چند فٹ ہی اونچی تھی۔ جیسے بادلوں میں اچانک بجلی چمک جاتی ہے بالکل اسی طرح ایک خیال میرے دماغ میں چمک اٹھا۔ میرے دل نے اسی وقت مجھے کہا۔ نکل جاؤ۔ اس کے بعد تمہیں یہ موقع نہیں ملے گا۔ اس خیال کے ساتھ ہی میرے اندر کی ساری توانائیاں بیدار ہو گئیں۔ میرے بازوؤں کے پٹھے تن گئے۔ میں اب جان پر کھیل جانے والا کمانڈو تھا۔

ٹرک ڈرائیور جیل کے کچن کی طرف گیا تھا۔ وہ کسی بھی وقت واپس آسکتا تھا رات کا وقت تھا۔ جس جگہ ٹرک کھڑا تھا وہاں تک دیوار کے اوپر جو بلب جل رہا تھا اس کی روشنی بہت کم آ رہی تھی۔ میں نے اپنے پیٹ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑا اور ہائے کی آواز نکال کر وہیں بیٹھ گیا۔ میں ہائے ہائے کرنے لگا۔ یہ میں نے دیکھ لیا تھا کہ بیرک کے آس پاس کوئی آدمی نہیں تھا۔ سپاہی نے آواز دے کر پوچھا

"کیہ گل اے اوئے۔ اٹھ تاں!"

میں وہیں لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ سپاہی جلدی سے میرے پاس آکر مجھ پر جھکا۔ بر
میرے لئے اتنا ہی کافی تھا۔ دوسرے لمحے اس کی گردن میرے بازو کے آہنی شکنجے میں
تھی۔ ایک جھٹکے کی بات تھی اور سپاہی کی گردن لٹک گئی۔ میں جیل کی دیوار کی طرف دوڑ
پڑا اور اس جگہ آکر بیٹھ گیا جہاں اندھیرا تھا۔ اتنے میں مچان پر لگی ہوئی سرچ لائیٹ کی
روشنی کا گول دائرہ ایک طرف سے ہوتا ہوا آیا اور میرے اوپر سے ہو کر گزر گیا۔ روشنی
کے اس دائرے کو ابھی دوبارہ ایک دومنٹ کے بعد وہاں آنا تھا۔ میں اٹھ کر ٹرک کی
طرف دوڑ کر گیا اور پیچھے سے اس کے اوپر چڑھ گیا۔ ٹرک کی چھت نہیں تھی۔ لیکن اس
کی ایک طرف کی سائیڈ کی لکڑی کی دیوار جیل کی دیوار سے ایک فٹ کے فاصلے پر تھی۔
میں ٹرک کی دیوار کے اوپر چڑھ گیا۔ جیل کی داور کی منڈیر مجھے صاف نظر آرہی تھی۔

میں نے اچھل کر منڈیر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑا اور ایک ٹانگ کو دیوار کے اوپر کر
کے دوسری ٹانگ بھی اوپر کرلی۔ منڈیر کے اوپر لیٹے لیٹے میں نے دوسری طرف دیکھا۔
نیچے اندھیرے میں مجھے جھاڑیاں سی نظر آئیں۔ میرے پاس سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ کر
بھی لمحے کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ میں نے اللہ کا نام لیا اور اپنے آپ کو نیچے گرا دیا میں
جھاڑیوں میں گرا اور میرے جسم کو کانٹے سے چبھے۔ میں جلدی سے اٹھا اور دیوار سے
ہٹ کر جیل کے دروازے کی مخالف سمت کو دوڑا۔

میں امرتسر شہر کے گلی کوچوں اور بازاروں سے بچپن ہی سے واقف تھا مگر جس طرف
امرتسر جیل تھی اس طرف کبھی نہیں آیا تھا۔ آپ پڑھ چکے ہیں کہ ہمارا گاؤں مجیٹھہ تھا جو
امرتسر کے قریب ہی واقع ہے اور میں بچپن میں اپنے باپ کے ساتھ اور پھر اپنے گاؤں
کے سکول کے لڑکوں کے ساتھ اکثر امرتسر آیا کرتا تھا۔ میں ابھی چھ سال کا ہی تھا کہ
پاکستان بن گیا اور ہم مجیٹھہ سے ہجرت کر کے پاکستان آگئے۔ مجیٹھہ اور امرتسر سٹیشن کے
درمیان کھیتوں میں ہم پر سکھوں کے جتھے نے حملہ کر دیا اور میری بہن شہید ہو گئی۔ شہر
کے بازاروں سے میں واقف تھا لیکن کمپنی باغ سے آگے میں کبھی نہیں گیا تھا اور امرتسر

جیل خانہ کمپنی باغ کے شمال میں جہاں بجلی گھر تھا اس کے آگے جا کر آتا تھا۔

یہ سب کچھ اتنی اور جلدی اور آناً فاناً ہو گیا تھا کہ مجھے ابھی تک یقین نہیں آرہا تھا
کہ میں جیل کے دوزخ سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ ایسے لگ رہا تھا۔ جیسے
قدرت نے سارا انتظام پہلے سے ہی کر رکھا تھا۔ میں سڑک پر آگیا۔ اب میں دوڑ نہیں رہا
تھا لیکن قدرتی طور پر میرے قدم تیز تیز اٹھ رہے تھے۔ رات کا اندھیرا چاروں طرف
تھا۔ کہیں کہیں سڑک پر بجلی کے کھمبے پر روشنی نظر آرہی تھی۔ میں سڑک سے ہٹ کر
کھیتوں کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ میرا رخ کمپنی باغ کے دوراہے کی طرف تھا۔ میرے
حساب سے کم از کم آدھ گھنٹے تک میرے فرار کی کسی کو خبر نہیں ہو سکتی تھی۔ کیونکہ
سپاہی نے مجھے پانچ منٹ ٹہلانے کے بعد واپس کوٹھڑی میں بند کر دینا تھا۔ اس کے بعد کوئی
آدھے گھنٹے کے بعد جمعدار نے آکر قیدیوں میں دال روٹی تقسیم کرنی تھی۔

میرے پاس بمشکل آدھا گھنٹہ تھا۔ اس آدھے گھنٹے کے اندر اندر مجھے امرتسر شہر سے
باہر نکل جانا چاہئے تھا۔ اس کی ایک ہی صورت تھی کہ میں کمپنی باغ میں سے ہو کر مجیٹھہ
روڈ کی طرف پڑ جاؤں۔ کیونکہ وہ ایسا علاقہ تھا کہ جس کو میں رات کے اندھیرے میں بھی
پہچان سکتا تھا۔ مجھے مجیٹھہ اپنے گاؤں سے جدا ہوئے بارہ سال ہی گزرے تھے اور ہمارے
ملکوں میں اتنی جلدی شہروں میں تبدیلی نہیں آیا کرتی۔ پرانی چیزیں اپنی جگہوں پر جوں کی
توں موجود رہا کرتی ہیں۔ لیکن میں مجیٹھہ گاؤں میں رکنا نہیں چاہتا تھا۔ یہ پہلے بھی سکھوں
کا گاؤں تھا اور اب تو وہاں پاکستان کے علاقوں سے بھی سکھ آکر آباد ہو گئے ہوں گے۔ میں
چاہتا تھا کہ مجیٹھہ گاؤں کے قریب سے جو سڑک آگے جالندھر لدھیانے والی ریلوے لائن
کی طرف جاتی ہے اس طرف نکل جاؤں۔ میں تیز تیز چلتا کمپنی باغ والے دوراہے سے
گزر کر کمپنی باغ میں داخل ہو گیا۔ میرا حلیہ بھی خراب تھا۔ میلی چیکٹ قمیض اور میلی
پھٹی پرانی پتلون اور پاؤں میں جوتا تھا۔ جوتے کی حالت خراب نہیں تھی۔ اس لئے چلنے
میں مجھے کوئی دقت پیش نہیں آرہی تھی۔ امرتسر کی جیل میں مجھ پر کافی تشدد ہوا تھا اور
کافی مارا پیٹا گیا تھا۔ مگر میرے جسم کی توانائی پھر سے بحال ہو گئی تھی۔ یہ فکر ضرور تھا کہ

کہیں دوبارہ نہ پکڑا جاؤں۔ میں ابھی تک خطرے کے مقام سے دور نہیں ہوا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد جیل میں الارم چیخ اٹھے گا اور پولیس کو اطلاع کر دی جائے گی۔ ان جیل والوں نے فوراً میرا فوٹو بھی اتروا کر رکھ لیا تھا۔ پولیس کو میرا فوٹو دکھا کر میرے پیچھے لگا دیا جائے گا۔ ہر تھانے میں فون پر میرے فرار کی خبر کر دی جائے گی اور پولیس کی پارٹیاں مختلف سمت سے نکل کر مجھے شہر کے اندر ہی گھیرے میں لینے کی کوشش کریں گی۔

جیل یا دشمن کے قیدی کیمپ سے فرار ہونا مشکل نہیں ہوتا آدمی کے اندر دلیری اور ہمت ہو تو فرار کا کوئی نہ کوئی سبب بن جاتا ہے۔ آدمی فرار ہو جاتا ہے لیکن اصل کام فرار کے بعد اپنے آپ کو اس وقت تک پولیس کے چنگل سے بچانا ہوتا ہے جب تک کہ آدمی خطرے کی سرحد سے باہر نہیں نکل جاتا۔ فرار سبھی ہو جاتے ہیں مگر اپنی منزل تک فرار کے بعد کوئی کوئی ہی پہنچتا ہے۔ میرا بھی یہی حال تھا۔ قسمت نے یاوری کی تھی اور قدرت نے میرے فرار کا از خود سامان مہیا کر دیا تھا اور میں نے جرات سے کام لے کر اپنے آپ کو جیل کی چاردیواری سے باہر پھینک دیا تھا مگر اصل کام جو فرار سے بھی زیادہ مشکل اور نازک تھا اب شروع ہو رہا تھا۔ جب مجھے اس علاقے سے نکل کر دلی پہنچنا تھا۔ میں دلی پہنچ کر اپنے ماسٹر سپائی گل خان اور پروفیسر جمشید کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا تھا کہ ان پر میری گرفتاری کے بعد کیا گزری اور کیا وہ دلی میں ہی تھے یا وہاں سے کسی طرف روپوش ہو گئے تھے۔ یہ معلوم کرنا میرا اخلاقی فرض تھا۔ بہت ممکن تھا کہ وہ کسی اذیت ناک مشکل میں ہوں اور میں ان کی مدد کر سکوں۔

لیکن اس وقت سب سے اہم مسئلہ خود میری اپنی مدد کرنے کا تھا۔ اپنی مدد آپ سے مراد یہ ہے کہ مجھے خود کسی طریقے سے اپنے آپ کو امرتسر کی حدود سے باہر نکال لے جانا تھا۔ مجھے امرتسر کی اس ہندو طوائف کا بھی خیال آیا جس کے گھر میں گھس کر میں چھپ گیا تھا۔ مگر میں اس طرف یعنی امرتسر کے طوائفوں والے بازار رام باغ کی طرف جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ وہاں ہر وقت پولیس پھرتی رہتی تھی اور میں جاتے ہی پکڑا جا سکتا تھا۔

مجسمہ بھی کمپنی باغ سے کافی دور تھا۔ البتہ مجسمہ روڈ قریب تھی۔ رات کے نو پونے بجے کا وقت ہو گا۔ سردیوں کا موسم ختم ہو چکا تھا اور مارچ کا مہینہ شروع ہو گیا ہوا تھا۔ رات بڑی خوشگوار تھی اور کمپنی باغ کی فضا رات کے اندھیرے میں طرح طرح کے پھولوں کی خوشبوؤں سے بسی ہوئی تھی مگر اس وقت میرا دھیان پھولوں کی طرف بالکل نہیں جا رہا تھا۔ میں نہر کراس کر گیا۔ آگے بائیں جانب ہو گیا۔ یہاں کافی لوگ آ جا رہے تھے۔ چوک میں پان کی دکان تھی جہاں فلمی گانے بج رہے تھے۔ میں آرام آرام سے چلنے لگا تھا۔ میں وہیں سے ایک خالی سڑک پر ہو گیا۔ اس سڑک کی دونوں جانب جامن کے گھنے درخت ہوا کرتے تھے۔ میں نے درختوں کو غور سے دیکھا۔ اندھیرے میں مجھے یہ جامن کے درخت ہی لگے۔ اس کا مطلب تھا کہ میں ٹھیک راستے پر جا رہا تھا۔ یہ سڑک آگے جا کر ایک میدان میں نکلتی تھی۔ اس میدان کو پار کر کے میں ہندوؤں کے ایک مرگھٹ کے قریب سے گزر گیا۔ اس مرگھٹ کو بھی میں پہچانتا تھا۔ یہاں بچپن میں ہندو کسی مردے کو جلانے کے لئے لاتے تو ہم ایک طرف کھڑے ہو کر مردے کو جلتا دیکھا کرتے تھے۔ آگے کھووال کا چھوٹا سا گاؤں آتا تھا۔

مجھے دور سے گاؤں کی دو تین بتیاں جلتی نظر آئیں۔ اس گاؤں کی دوسری طرف سے جالندھر جانے والی ریلوے لائن تھی۔ مجھے وہاں جانا تھا۔ میں رکے بغیر چلتا گیا۔ جس طرف سے میں گاؤں میں داخل ہوا وہ گاؤں کا عقبی حصہ تھا جہاں ایک چھپڑ یعنی جوہڑ ہوتا تھا۔ یہ جوہڑ آج بھی اندھیرے میں مجھے نظر آ گیا۔ میں گاؤں کی تنگ و تاریک گلیوں میں داخل ہونے کی بجائے گاؤں کے باہر سے ہو کر آگے کی طرف چلنے لگا۔ ایک طرف کوئی باغیچہ تھا جہاں کچھ لوگ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ پھر ایک آدمی پورن بھگت کی داستان سنانے لگا۔ میں گاؤں کے گندے نالے کی طرف ہو گیا۔ اتنے میں اچانک پیچھے مجھے موٹر گاڑی کی آواز آئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ باغیچے کے باہر کھمبے پر بجلی کا بلب روشن تھا۔ سامنے اس کی روشنی میں ایک ٹرک کو رکتے دیکھا۔ ٹرک کے رکتے ہی اس میں سے وردی پوش پولیس کے سپاہی چھلانگیں لگا کر اترے اور کسی نے باغیچے میں بیٹھے لوگوں کو

مخاطب کر کے اونچی آواز میں کہا۔

"خبردار اوئے۔ جہاں بیٹھے ہو بیٹھے رہو۔"

پھر سپاہیوں کو حکم دیا۔

"پنڈ کی ناکہ بندی کر لو۔ بھاگ کے جاؤ"

میں ایک بار تو سن ہو کر رہ گیا۔ پھر جلدی سے نالے کے پل پر سے گزر کر گاؤں ایک تنگ گلی میں گھس گیا۔ کسی سپاہی نے پیچھے سے آواز دی۔

"ٹھہر جا اوئے توں کون ایں؟"

میں نے گلی میں بے تحاشا بھاگنا شروع کر دیا۔ میرے جیل سے فرار ہونے کا پتہ چل گیا تھا اور پولیس نے میری تلاش میں اس گاؤں کی ناکہ بندی کر لی تھی اور اب وہ گھر گھر تلاشی لینے والی تھی اور میرا پکڑا جانا یقینی تھا۔ گاؤں کی گلیاں زیادہ لمبی نہیں ہوتیں۔ میں چند قدم ہی بھاگا تھا کہ آگے دیوار آ گئی۔ یہ اندھیرے میں مجھے دیوار لگی مگر یہ ایک مکان تھا جس کا دروازہ آدھا کھلا تھا اور اندر سے کسی آدمی کے بھجن گانے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ بغیر ساز کے پڑھنے کے انداز میں گا رہا تھا۔ میں ہندوؤں کے بھجن گانے اور اشلوک پڑھنے کے سارے طریقوں سے واقف تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ کسی کٹر ہندو کا گھر ہے رات کے وقت سونے سے پہلے بھجن گا رہا ہے۔ مگر میرے سامنے اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ پولیس کے آدمی گلی تک آ گئے تھے۔ مجھے ان کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

میں نے دل میں سوچا اب جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ میں مکان میں داخل ہو گیا۔ میرا خیال تھا کہ کوئی نہ کوئی سیڑھی مکان کی چھت پر جاتی ہو گی۔ میں چھت پر چلا جاؤں گا اور وہاں سے دوسری طرف کود کر رات کے اندھیرے میں بھاگ جاؤں گا۔ لیکن دروازے کے اندر ایک تنگ ڈیوڑھی تھی۔ ڈیوڑھی کے آگے ایک اور دروازہ تھا جو بند تھا۔ بھجن گانے کی آواز اسی دروازے کے پیچھے سے آ رہی تھی۔ اتنے میں مجھے پولیس کے آدمیوں کے قدموں کی آواز سنائی دی۔ پولیس میری تلاش میں گلی میں آ گئی تھی۔ شاید کسی سپاہی نے مجھے گلی میں دوڑ کر داخل ہوتے دیکھ لیا تھا۔ میرے پیچھے بھی موت تھی۔ آگے بھی

موت تھی۔ آگے جو موت تھی اس میں بچنے کی تھوڑی سی امید تھی۔ میں نے دروازے کو دھکیلا۔ وہ کھل گیا۔ اندر ایک آدمی لالٹین کے پاس چھوٹی سی کتاب لے کر بیٹھا بھجن گا رہا تھا' اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ میں نے جلدی سے دروازہ بند کر کے کہا۔

"میں بے گناہ ہوں۔ میں ہندو ہوں۔ پولیس میرے پیچھے لگی ہے۔ بھگوان کے لئے مجھے بچا لیں"

اس آدمی نے ایک لمحے کے لئے میری طرف دیکھا۔ پھر اٹھا۔ کتاب بند کر کے چارپائی پر رکھی اور سب سے پہلے دروازے کو کنڈی لگائی۔ مجھے چارپائی کے نیچے اشارہ کر کے کہا۔

"اس کے نیچے چھپ جاؤ۔"

میں چارپائی کے نیچے گھس گیا۔ اس شخص نے چارپائی پر پڑی ہوئی چادر کھینچ کر اس طرح نیچے کر دی کہ باہر سے کوئی شخص چارپائی کے نیچے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ دوبارہ چوکی پر لالٹین کے آگے بیٹھ کر بھجن گانے لگا۔ اتنے میں دروازہ زور سے کھٹکھٹایا گیا۔ اس شخص نے پوچھا۔

"کون ہو بھائی؟"

"پولیس ہے۔ باہر آؤ"

وہ آدمی جو یقیناً ہندو تھا۔ کیونکہ ایک تو وہ بھجن گا رہا تھا۔ دوسرے اس کے ماتھے پر تلک لگا تھا۔ تیسرے اس گاؤں میں تقسیم کے بعد کسی مسلمان کی موجودگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ اٹھا۔ مجھے دروازے کی کنڈی کھولنے کی آواز آئی۔ میں نے سانس روک لیا۔ دروازے پر پولیس کے سپاہی اور اس آدمی کے درمیان جو مکالمہ ہوا وہ میں بھی آپ کو سناتا ہوں۔ سپاہی نے کہا۔

"یہاں کوئی آدمی تو نہیں آیا؟ ایک پاکستانی مسلمان جاسوس جیل سے فرار ہو گیا ہے۔"

پاکستان کا لفظ سن کر مجھے یقین ہو گیا کہ اب یہ ہندو یقیناً پولیس کو بتا دے گا۔ کیونکہ

میں نے اس کے آگے اپنے آپ کو ہندو ظاہر کیا تھا۔ مگر میں حیران رہ گیا جب اس نے پولیس کانسٹیبل سے کہا۔

"یہاں تو صرف میں ہی ہوں۔ اور کوئی نہیں ہے۔ تم مجھے پاکستانی جاسوس کا ح دو اگر وہ یہاں آگیا تو میں اسے پکڑ کر تھانے لے آؤں گا۔"

پولیس کانسٹیبل نے کہا۔

"جوان آدمی ہے۔ میلی سے پتلون قمیض میں ہے۔ ڈاڑھی مونچھ نہیں ہے خیال رکھنا۔ ہم گاؤں کی تلاشی لے رہے ہیں۔"

وہ آدمی بولا۔

"چنتا نہ کریں۔ یہاں آیا تو بچ کر نہیں جا سکے گا۔"

مجھے پولیس کانسٹیبل کے قدموں کے واپس جانے کی اور دروازہ بند کر کے لگانے کی آواز آئی۔ میں چارپائی کے نیچے پڑا حیران ہو رہا تھا کہ یہ کس قسم کا ہندو اس نے یہ جاننے کے باوجود کہ میں ہندو نہیں ہوں۔ پاکستانی جاسوس ہوں اور ہوں مجھے پولیس کے حوالے نہیں کیا بلکہ پولیس کے آگے جھوٹ بول کر مجھے بچا لیا

اس آدمی نے چارپائی کی چادر ہٹا کر نیچے جھک کر کہا۔

"ابھی نیچے ہی لیٹے رہو۔ کوئی پتہ نہیں پولیس پھر آجائے۔"

اس نے چادر کا پلو نیچے کر دیا اور چوکی پر بیٹھ کر دوبارہ بھجن گانے لگا۔ میں چارپائی کے نیچے لیٹے لیٹے آنکھیں بند کر لیں۔ دونوں ہاتھ سینے پر رکھ لئے اور خدا ادا کرنے لگا کہ اس نے عین وقت پر مجھے بچا لیا۔ لیکن اس بھجن گانے والے ہندو ک تک مجھے کچھ سمجھ نہیں آئی تھی کہ اس نے یہ معلوم ہو جانے کے بعد بھی کہ میں ہوں اور مجھ پر پولیس نے پاکستانی جاسوس ہونے کا الزام لگایا ہے۔ پھر بھی مجھے کیوں ہے؟ یہاں میری عقل جواب دے گئی۔ کیونکہ یہ آدمی مجھے پاگل بھی نہیں معلو تھا۔ اس دوران گلی میں پولیس آگئی تھی اور آدمیوں کے باتیں کرنے کی آوازیں آ تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ پولیس نے گھروں کی تلاشی لینی شروع کر دی ہے۔

وہ آدمی بھجن گاتے گاتے رک گیا۔ وہ چارپائی کے قریب ہی چوکی پر بیٹھا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

"میرے ساتھ اوپر آؤ۔ یہاں تمہارے پکڑے جانے کا خطرہ ہے۔ باہر نکل آؤ"

میں جلدی سے چارپائی کے نیچے سے نکل آیا۔ کوٹھڑی کا اس نے آہستہ سے کنڈی اتار کر دروازہ کھولا۔ آگے ڈیوڑھی میں اندھیرا تھا۔ اس نے مجھے کہا۔

"میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ لو"

ڈیوڑھی میں اتنا اندھیرا تھا کہ کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ تین چار قدم چل کر ایک طرف مڑ گیا۔ یہاں سیڑھیاں اوپر جاتی تھیں جو مجھے آتے ہوئے اندھیرے میں نظر نہیں آئی تھیں۔ میں اس کے پیچھے پیچھے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ چھ سات سیڑھیاں چڑھنے کے بعد اوپر ایک اور کوٹھڑی کا دروازہ تھا۔ اس نے دروازہ کھول دیا۔ کہنے لگا۔

"ٹھہرو۔ میں دیا جلاتا ہوں"

میں سیڑھیوں کے دروازے میں ہی کھڑا رہا۔ اس نے دیا روشن کیا۔ چھوٹی سی کوٹھڑی تھی۔ ایک طرف اونچا سا پلنگ تھا جس کے نیچے شاید چاولوں یا گندم کی بھری ہوئی بوریاں پڑی تھیں۔ وہ بولا۔

"پلنگ کے نیچے ان بوریوں کے پیچھے چھپ جاؤ۔ بھگوان نے چاہا تو یہاں کوئی نہیں آئے گا۔"

میں جلدی سے پلنگ کے نیچے گھس کر بوریوں کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گیا۔ یہ دیہاتی ٹائپ کا پلنگ تھا جو اونچے ہوتے ہیں۔ ان کے پائے فرش پر بنے ہوئے مٹی کی چار چھوٹی تھڑیوں کے اوپر رکھے ہوتے ہیں۔ میں وہاں لیٹنے کی بجائے بیٹھ سکتا تھا۔ اس آدمی نے واپس جاتے ہوئے مٹی کا دیا بجھا دیا اور دروازے کو باہر سے کنڈی لگا کر سیڑھیاں اتر گیا۔ کوٹھڑی میں خاص طور پر پلنگ کے نیچے گرمی اور حبس تھا۔ مگر اس وقت میری جان پر بنی تھی۔ اس کوٹھڑی میں بھی شاید کوئی کھڑکی تھی جو نیچے گلی میں کھلتی تھی۔ مجھے اس کھڑکی

میں سے نیچے گلی میں سپاہیوں اور دوسرے مکان کے لوگوں کی آوازیں صاف سنائی دے
رہی تھیں۔ پولیس مکانوں کی تلاشی بھی لے رہی تھی اور ان سے میرے بارے میں پوچھ
بھی رہی تھی اور انہیں ہدایت بھی کر رہی تھی کہ مفرور پاکستانی جاسوس ہے۔ اگر کہیں
نظر آجائے تو اسے فوراً پکڑ لینا اور پولیس کو اطلاع کر دینا۔

ایک بار پولیس کے سپاہی اس ہندو کے مکان کے باہر آگئے جس کے مکان میں میں
نے پناہ لے رکھی تھی۔ کسی سپاہی نے یا شاید حوالدار نے آواز دی۔

"دروازہ کھولو"

دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ ساتھ ہی میرے میزبان ہندو نے کہا۔

"مہاراج! ایک سپاہی پہلے بھی تلاشی لے گیا ہے"

یہ کوئی دوسرا سپاہی یا حوالدار تھا۔ اس نے کہا۔

"مہاراج مجھے معلوم ہے۔ پر کیا پتہ کہ اب پاکستانی جاسوس یہاں گھس آیا ہو"

میرے میزبان ہندو نے کہا۔

"مہاراج اگر وہ یہاں آتا تو مجھ سے بچ کر نہیں جا سکتا تھا۔ میں مکان میں اکیلا
ہوں۔ بھگوان کا بھگت ہوں آپ نے تلاشی لینی ہے تو بے شک لے لیں"

کانسٹیبل یا حوالدار نے کہا۔

"اس کی ضرورت نہیں۔ مگر ہوشیار رہنا وہ اسی گاؤں میں کہیں چھپا ہوا ہے۔ یہاں
آگیا تو اسے دبوچ لینا بے شک اس کی ٹانگ وانگ توڑ دینا۔"

اس کے بعد سپاہیوں کے گلی میں سے واپس جانے کی آوازیں آئیں۔ وہ آپس میں
ایک دوسرے سے کہہ بھی رہے تھے کہ جائے گا کہاں' ہے وہ اسی گاؤں میں۔ ابھی پکڑا
جائے گا۔ آوازیں دور جا کر غائب ہو گئیں۔ گلی میں رات کا سناٹا چھا گیا۔ میں پلنگ کے
نیچے بوریوں کے پیچھے سمٹ کر بیٹھا تھا۔ نیچے سے ایک بار پھر ہندو میزبان کے بھجن گانے کی
آواز آنا شروع ہو گئی۔ مجھے گرمی محسوس ہوئی تو میں پلنگ کے نیچے سے نکل کر پلنگ پر
ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گیا اور کوٹھڑی کے اندھیرے میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

میں سوچنے لگا کہ اس نیک دل ہندو نے مجھے پولیس سے تو بچا لیا ہے۔ مگر ابھی یہاں
سے نکلنا مناسب نہیں تھا۔ اتنے میں نیچے بھجن گانے کی آواز بند ہو گئی۔ مجھے کسی کے
سیڑھیاں چڑھنے کی آواز آئی۔ میں جلدی سے پلنگ کے نیچے چلا گیا۔ دروازہ کھلا۔ یہ میرا
میزبان ہندو ہی تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

"پولیس چلی گئی ہے۔ فکر نہ کرو"

پھر اس نے دیا روشن کیا۔ کوٹھڑی میں دیے کی مدھم روشنی پھیل گئی۔

"باہر آجاؤ"

میں پلنگ کے نیچے سے نکل آیا۔ اب میں نے اس شخص کو دیے کی روشنی میں غور
سے دیکھا۔ ساٹھ کے قریب اس کی عمر ہو گی۔ جسم دبلا تھا۔ رنگ گہرا گندمی تھا۔ بال سفید
ہو رہے تھے۔ ماتھے پر تلک لگا تھا۔ اس نے دھوتی کرتہ پہنا ہوا تھا۔ مگر اس کے چہرے پر
ایک عجیب قسم کی رحمدلی نظر آرہی تھی۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ یہ مسکراہٹ
کوئی ایسی مسکراہٹ نہیں تھی جو کوئی لطیفہ سن کر یا خوشی کی کوئی خبر سن کر چہرے پر آجاتی
ہے۔ یہ بڑی بے معلوم سی مسکراہٹ تھی۔ یہ مسکرانے سے پہلے اور مسکرانے کے بعد کی
مسکراہٹ معلوم ہوتی تھی۔

مجھے کہنے لگا۔

"بیٹا نیچے آجاؤ"

اس کے منہ سے بیٹے کا لفظ سن کر میں اور بھی حیران ہوا۔ میں اس کے دشمن ملک کا
جاسوس تھا۔ پولیس کی حراست سے بھاگا ہوا تھا۔ اس شخص نے نہ صرف یہ کہ مجھے پناہ
دی تھی۔ بلکہ پولیس کے آگے جھوٹ بھی بولا تھا۔ مجھے بچا لیا تھا اور اب بڑی شفقت کے
ساتھ مجھے بیٹا کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ میں نے اپنی کمانڈو ٹریننگ کے دوران ہندو مذہب'
ہندو دیو مالا اور سنسکرت زبان کا کافی مطالعہ کیا تھا۔ بلکہ یہ چیزیں میری ٹریننگ کا ایک حصہ
سمجھ کر مجھے پڑھائی گئی تھیں۔ تاکہ میں دشمن کی ذہنیت کو پوری طرح سمجھ جاؤں اور صحیح
طریقے سے سراغ رسانی کی لڑائی لڑ سکوں اور دشمن سے کسی محاذ پر بھی مار نہ کھا جاؤں

لیکن اس ہندو کا سلوک میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ پھر میں نے سوچا کہ ہو سکتا ہے کہ اس شخص کا جوان بیٹا مرگیا ہو اور میری شکل اس کے بیٹے سے ملتی ہو۔

وہ مجھے نیچے اس کوٹھڑی میں لے گیا جہاں وہ چوکی پر بیٹھا بھجن گا رہا تھا۔ اس کوٹھڑی میں لالٹین روشن تھی جس کی بتی اس نے پولیس کے جانے کے بعد مدھم کر دی تھی۔ وہ چوکی پر بیٹھ گیا اور بولا۔

"تم یہاں سو جاؤ۔ صبح چلے جانا۔ اس وقت جاؤ گے تو پولیس تمہیں پکڑ لے گی"

مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے کہا۔

"مہاراج! مجھے شما کر دیں کہ میں نے آپ کے آگے جھوٹ بولا کہ میں ہندو ہوں۔ اب تو آپ کو پتہ چل گیا ہے کہ میں مسلمان ہوں۔ میں بھی مانتا ہوں کہ میں واقعی مسلمان ہوں اور پاکستان سے آیا ہوں۔ لیکن ایک بات میں آپ سے ضرور پوچھنا چاہوں گا کہ آپ نے یہ سب کچھ جاننے کے بعد مجھے پولیس کے حوالے کیوں نہیں کیا؟"

میں چپ ہو گیا۔ وہ بھی چپ تھا۔ چوکی پر آلتی پالتی مار کر کمر بالکل سیدھی کر کے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے بوڑھے اور ہلکے ہلکے تبسم والے چہرے پر لالٹین کی مدھم روشنی پڑ رہی تھی۔ میری طرف اس نے آنکھیں اٹھائیں اور میرے سوال کا جواب دینے کی بجائے مجھ سے سوال کیا۔

"تم یہ سوال کیوں پوچھ رہے ہو؟"

میں نے بڑے ادب سے کہا۔

"اس لئے مہاراج کہ میں آپ کے اس سلوک پر اتنا حیران ہوں کہ شاید اتنا حیران میں پہلے کبھی نہیں ہوا۔ مجھے ایک ہندو سے ایسے سلوک کی کبھی امید نہیں تھی"

اس شخص کے چہرے کے بے معلوم تبسم پر ذرا سا بھی فرق نہ آیا تھا۔ اس نے پھر ایک سوال کر دیا۔

"تم یہ سب کچھ پوچھ کر کیا کرو گے؟"

میں نے کہا۔

"مہاراج! کم از کم میری حیرانی ضرور دور ہو جائے گی"

اس نے پھر ایک سوال پوچھ لیا۔

"تمہاری حیرانی دور ہو گئی تو پھر تمہارے پاس کیا رہ جائے گا؟"

اس کی یہ بات بالکل میری سمجھ میں نہ آئی۔ میں نے کہا۔

"میں آپ کا بڑا دھن واری ہوں کہ آپ نے میری خاطر اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر مجھے بچا لیا۔"

اس شخص نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"تم مسلمان ہو کر ہندوؤں کی زبان کے لفظ کیوں استعمال کرتے ہو؟"

اب جب کہ اس شخص کے آگے ساری بات کھل چکی تھی اس لئے کچھ چھپانے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے جواب دیا۔

"مہاراج! ہندو بن کر بھارت میں پھر رہا ہوں ہندی بولنے کی عادت پڑ گئی ہے"

وہ شخص ایک لمحے کے لئے خاموش ہو گیا۔ پھر اس نے میری طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر وہی نرم مسکراہٹ تھی۔ کہنے لگا۔

"کچھ کھاؤ گے؟ میرے پاس اس وقت گڑ اور روٹی ہے۔"

مجھے بھوک بالکل نہیں تھی۔ صرف پیاس لگی تھی۔ میں نے کہا۔

"صرف پانی پیوں گا مہاراج"

اس نے کونے میں رکھے مٹکے میں سے مجھے پانی نکال کر پلایا۔ کہنے لگا۔

"اس چارپائی پر نہیں۔ اوپر والی کوٹھڑی میں پلنگ پر جا کر سو جاؤ۔ تمہارا اس وقت یہاں سے نکلنا ٹھیک نہیں۔ منہ اندھیرے میں تمہیں جگا دوں گا۔ اس وقت چلے جانا۔ پولیس گاؤں سے جا چکی ہو گی۔"

میں اس شخص کو حیرت اور تشکر کے ملے جلے جذبات کے ساتھ دیکھتا اوپر چلا آیا۔ کوٹھڑی میں دیا جل رہا تھا۔ میں پلنگ پر لیٹ گیا۔ نیند بالکل نہیں آرہی تھی۔ نہ جانے

رات کتنی گزر چکی تھی۔ لیٹ کر سوچنے لگا کہ اس شخص کا احسان شاید میں زندگی بھر نہ بھلا سکوں گا۔ خدا جانے یہ کوئی انسان تھا یا خدا نے میری مدد کے لئے آسمان سے کوئی فرشتہ اتار کر وہاں بٹھا دیا تھا۔ کتنے ہی دنوں سے امرتسر جیل کی کوٹھڑی کے سخت فرش پر راتوں کو پہلو بدلتا رہا تھا۔ اب پلنگ پر لیٹا تو نیند آنا شروع ہو گئی۔ یہ اطمینان بھی تھا کہ کوئی مجھے پکڑنے نہیں آئے گا۔ میں سو گیا۔

منہ اندھیرے مجھے اس شخص نے جگا دیا۔

وہ بڑے آرام سے میرا کندھا ہلا رہا تھا۔

"بیٹا اٹھو! تمہارے جانے کا وقت ہو گیا ہے"

میں جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ کہنے لگا۔

"میں نے تمہارے لئے چائے بنائی ہوئی ہے باہر غسل خانے میں جا کر منہ ہاتھ دھو لو"

وہ مجھے مکان کی دوسری منزل کے ایک چھوٹے سے دالان میں لے گیا جہاں ایک بغیر چھت کے غسل خانہ بنا ہوا تھا۔ نلکا لگا تھا۔ میں نے وہاں منہ ہاتھ دھویا۔ نیچے آ گیا۔ کوٹھڑی میں اسی طرح لالٹین جل رہی تھی۔ چارپائی پر چادر اسی طرح بچھی تھی۔ اس پر ایک بھی سلوٹ نہیں پڑی ہوئی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ شخص رات بھر بیٹھا رہا تھا۔ تانبے کے گلاس میں گرم چائے تھی۔ چنگیر میں ایک روٹی اور تھوڑا سا گڑ رکھا ہوا تھا۔ میں نے وہ ساری روٹی اور گڑ کھا لیا۔ روٹی باسی تھی اور بڑی لذیذ تھی۔ اوپر سے چائے بھی پی۔ تازہ دم ہو گیا۔ میں اس نیک دل ہندو کا شکریہ ادا کرنے لگا تو وہ بولا۔

"بیٹا شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں۔ تم اب گاؤں سے نکل جاؤ اور جدھر جانا ہے چلے جاؤ۔ ابھی رات کا اندھیرا ہے۔ دن نکل آیا تو گاؤں کے آدمی تمہیں پکڑ کر پولیس کے حوالے کر دیں گے"

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ آدمی ڈیوڑھی تک میرے ساتھ آیا۔ میں نے آخری بار اس شخص کی طرف دیکھا اور کہا۔

"آپ کا نام کیا ہے مہاراج؟"

اس نے میرے کاندھے پر آہستہ سے ہاتھ رکھ کر کہا۔

"تم میرا جو نام رکھ لو گے وہی میرا نام ہو گا اب جاؤ۔"

میں ڈیوڑھی سے نکل کر گلی میں آ گیا۔

گلی میں اندھیرا تھا۔ یہ کوئی رات کے تین ساڑھے تین بجے کا وقت ہو گا۔ میں گلی میں سے قدموں کی آواز پیدا کئے بغیر گزر گیا۔ آگے کچی ڈھلان تھی۔ میں بائیں جانب ہو گیا۔ ایک کتا مجھے دیکھ کر زور زور سے بھونکنے لگا۔ میں چلتا گیا۔ ایک جوہڑ آ گیا۔ وہاں ایک خالی گڈا کھڑا تھا۔ گاؤں کے چند ایک مکان تھے۔ ان پر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ سامنے مجھے سڑک کی روشنی نظر آئی۔ ضرور یہ جی ٹی روڈ ہی ہو گی۔ میں نے سوچا ریلوے لائن سے میں بائیں جانب نکل آیا ہوں۔ اب یہی بہتر ہے کہ جی ٹی روڈ کے ساتھ ساتھ چلتا جاؤں اور دن نکلنے تک امرتسر شہر سے جتنی دور نکل سکتا ہوں نکل جاؤں۔ یہاں پھر میں نے عقل کا ثبوت نہیں دیا تھا۔ کیونکہ جی ٹی روڈ ایک ایسی سڑک تھی کہ جہاں پر تھوڑی بہت ساری رات ٹریفک جاری رہتی ہے اور شہر کی حد ختم ہونے تک اس سڑک کی دونوں جانب آدھ آدھ فرلانگ کے فاصلے پر کھمبوں پر بجلی کے بلب جلتے رہتے ہیں۔ مجھے ریلوے لائن کی طرف ہی جانا چاہئے تھا۔ میں اس خیال سے اس طرف آ گیا تھا کہ ریلوے لائن وہاں سے کافی دور تھی اور مجھے ڈر تھا کہ راستہ ویران ہے کتے ہوں گے مجھے دیکھ کر بھونکیں گے اور میرے پکڑے جانے کا ڈر تھا۔

میں جی ٹی روڈ پر چڑھنے کی بجائے اس کی دوسری جانب کھیتوں کی مینڈھ پر ہو کر چلا جا رہا تھا۔ بارہ برس کے بعد بھی امرتسر کی جی ٹی روڈ ویسی کی ویسی چھوٹی تھی۔ میں نے ایک جگہ رک کر سڑک کے پیچھے نگاہ دوڑائی تو مجھے عقب میں دور امرتسر شہر کی روشنیاں نظر آئیں۔ میں ابھی امرتسر کی حدود میں ہی تھا۔ میں تیز تیز چلنے لگا۔ فصل والے کھیت ختم ہو جاتے تو خالی کھیت آ جاتے۔ آسمان پر صبح کاذب کی نیلی نیلی جھلکیاں نمودار ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ میں نے چلنے کی رفتار اور تیز کر دی۔ آگے میری دائیں جانب ایک

آبادی آگئی۔ یہاں کہیں کہیں کھمبوں پر بجلی کے بلب جل رہے تھے۔ میں ان سے دور ہ
کر دوسری طرف ہو گیا۔ ایک کھیت میں کسان ہل چلا رہا تھا۔ مجھے اس کا سایہ سا ہی نظر
آرہا تھا۔ وہ ہل چلاتے ہوئے جانوروں کو چلتا رکھنے کے لئے جو آوازیں نکال رہا تھا صرف
اس کی آواز آرہی تھی۔ ایک خشک کھائی آگئی۔ آسمان پر صبح کاذب کی نیلی روشنی کی وجہ
سے مجھے چیزیں دکھائی دینے لگی تھیں۔ یہ کھائی خالی اور خشک تھی۔ میں اس میں اتر گ
اور سامنے والی چڑھائی چڑھ کر کھائی کی دوسری طرف آگیا۔

اس وقت جی ٹی روڈ میری ایک جانب کچھ فاصلے پر ساتھ ساتھ جا رہی تھی۔ جی ا
روڈ کی پہچان ٹاہلی کے درخت تھے جو اس کی دونوں جانب قطاروں میں اگے ہوئے تھے
کہیں قریب ہی کوئی مندر ہو گا۔ ادھر سے پوجا پاٹھ کرنے اور آرتی اتارتے وقت ج
چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں بجائی جاتی ہیں ان کی دبی دبی آوازیں سنائی دیں۔ اس وقت مجھے
شدت سے محسوس ہوا کہ میں ایک غیر مسلم ملک میں ہوں۔ ہندوؤں سکھوں کے ملک
میں ہوں۔ کیونکہ اذان کا وقت ہو رہا تھا۔ اگر میں کسی مسلمان ملک میں ہوتا تو اس وقت
مسجدوں سے صبح کی اذان کی آوازیں بھی ضرور آتیں مجھے بارہ برس پہلے کا امرتسر اور
امرتسر کے گاؤں یاد آنے لگے۔ بارہ برس پہلے صبح صبح جب میں اٹھا کرتا تھا تو دور دور سے
اذانوں کی آوازیں آیا کرتی تھیں۔ مگر اب ان علاقوں میں بلکہ سارے مشرقی پنجاب میں
ہندو سکھوں نے سب مسجدوں کو شہید کر دیا ہوا تھا۔ جو مسجدیں بچ گئی تھیں انہیں اصطبل
بنا دیا گیا تھا یا ہندو سکھ شرنارتھی وہاں آکر رہنے لگے تھے۔

میں اس قسم کے خیالات سوچتا چلا جا رہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے پنجابی میں آواز
دی۔

"کون ہے؟ رک جاؤ"

آواز کا سننا تھا کہ میں نے دوڑ لگا دی۔ مجھے اپنے پیچھے بھی کسی کے دوڑتے قدموں
کی آواز آئی۔ ابھی سورج نکلنے میں دیر تھی اور ہر طرف اندھیرا تھا۔ میں ایک اونچی فصل
والے کھیت میں گھس گیا۔ فصل شاید کماد کی تھی۔ میرے دوڑنے سے ٹہنوں کے ٹوٹنے

اور ادھر ادھر ہونے کی آواز پیدا ہوئی۔ مجھے اپنے پیچھے بھی ایسی ہی آوازیں آنے لگیں۔
کوئی میرے پیچھے بھاگا چلا آرہا تھا۔ یقیناً یہ کوئی پولیس کا سپاہی تھا۔ اگر پولیس کا آدمی نہیں
تھا تو پولیس کا مخبر ہو گا۔ اس سارے علاقے میں پولیس نے لوگوں کو اور رات کو پہرہ
دینے والوں کو میرے بارے میں ہوشیار کر دیا تھا۔ ضرور یہ کوئی چوکیدار تھا جس نے مجھے
للکارا تھا اور میرے بھاگنے پر وہ بھی میرے پیچھے دوڑ پڑا تھا۔

کھیت ختم ہوا تو سامنے درختوں کا جھنڈ تھا۔ میں ان درختوں میں گھس گیا۔ میں بے
تحاشا دوڑتا چلا جا رہا تھا۔ دوڑنے میں وہ شخص میرا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ تیز دوڑنا اور
زیادہ سے زیادہ دیر تک دوڑتے رہنا میری کمانڈو ٹریننگ کا اہم حصہ رہا تھا۔ مگر میرے
آگے درختوں کی اور جھاڑیوں کی رکاوٹیں آرہی تھیں میرے پیچھے دوڑنے والے نے
مجھے گالی دے کر بلند آواز میں کہا۔

"بھاگ کر کہاں جاؤ گے۔ آگے پولیس کھڑی ہے۔"

پولیس کا نام لے کر شاید اس نے مجھے ڈرانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن پولیس کے
نام سے مجھے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ میرے پیچھے بھاگنے والے کو یقین ہے کہ میں وہی پاکستانی
جاسوس ہوں جو امرتسر جیل سے بھاگا ہوا ہے اور جس کو پولیس تلاش کر رہی ہے۔

میں اونچے اونچے سرکنڈوں اور ٹبوں کے درمیان بھاگا جا رہا تھا۔ آسمان پر پھیکی پھیکی
صبح کی روشنی ہونے لگی تھی۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ میں آخر کب تک دوڑتا رہوں گا۔
میرے پیچھے ایک ہی آدمی لگا ہوا ہے۔ میں اسے قابو کر سکتا ہوں۔ یہ سوچ کر میں گھوم کر
سرکنڈوں کی ایک اونچی جھاڑی کے پیچھے ہو کر گھات لگا کر کھڑا ہو گیا۔ جو آدمی میرے پیچھے
دوڑتا ہوا آرہا تھا۔ وہ تھک گیا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ دوڑ رہا تھا۔ اس نے اونچی آواز میں
کسی کو آواز دے کر کہا۔

"اوئے ایدھر آؤ اوئے۔ پاکستانی جاسوس کو میں نے پکڑ لیا ہے۔"

جیسے ہی وہ سرکنڈوں کے قریب سے گزر کر ایک دو قدم آگے گیا۔ میں نے پیچھے سے
اس پر اس طرح چھلانگ لگائی کہ میرے سیدھے بازو نے اس کی گردن کو اپنے فولادی شکنجے

میں لے کر اپنے ساتھ ہی نیچے گرا دیا۔ یاد رکھیں۔ اگر خدا نہ کرے کسی اعلیٰ تربیت یافتہ کمانڈو نے آپ کی گردن میں اپنے بازو کا شکنجہ ڈال دیا ہے تو پھر آپ اپنے آپ کو مردہ سمجھیں۔

میں نے اس آدمی کے ساتھ نیچے گرتے گرتے اس کی گردن کو صرف ایک جھٹکا دیا۔ اس کا سانس بند ہو چکا تھا۔ میں نے اس کی لاش کو وہیں چھوڑا اور اٹھ کر سامنے کی جانب دوڑ پڑا۔ جس طرف آبادی تھی میں اس علاقے کو چھوڑ کر جی ٹی روڈ والے ٹاہلی کے درختوں میں آگیا۔

اب میں چاہتا تھا کہ مجھے آگے جالندھر کی طرف جاتی کوئی ایسی سواری مل جائے جو مجھے اس خطرناک علاقے سے نکال دے۔ ایسی سواری کوئی ٹرک ہی ہو سکتا تھا۔ اپنے کمانڈو مشن کی سرگرمیوں کے دوران میں نے اکثر دو شہروں کے درمیان راتوں کو چلنے والے مال بردار ٹرکوں پر لفٹ لے کر کافی سفر کیا تھا۔ مجھے یہ احساس بھی تھا کہ امرتسر جیل سے میرے فرار کی اطلاع اردگرد کے شہروں اور ضلع کے سارے تھانوں کو پولیس نے کر دی ہو گی اور بہت ممکن ہے کہ راستے میں پولیس نے ناکہ بندی بھی لگا رکھی ہو۔ پولیس چیکنگ بھی کر رہی ہو۔ میری تصویر پولیس کو مل گئی ہو گی۔ ٹھیک ہے ہر سپاہی کے پاس میری تصویر نہیں ہو سکتی تھی لیکن پولیس مجھے مشکوک سمجھ کر پکڑ ضرور سکتی تھی۔

میں ٹاہلی کے درختوں کی دوسری طرف سے ہو کر جی ٹی روڈ پر چل رہا تھا۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا دن کی روشنی سفید ہوتی جا رہی تھی۔ میرے پاس ایک پیسہ تک نہیں تھا۔ جتنی انڈین کرنسی تھی وہ ساری امرتسر جیل کے عملے نے اپنے پاس رکھ لی تھی۔ میرا حلیہ ایسا تھا کہ اپنے لباس سے میں یا تو کوئی مزدور لگ رہا تھا یا مشکوک۔ دور مجھے سڑک کے کنارے کچے پر رکی ہوئی ایک موٹر کار نظر پڑی۔ اس کا ڈرائیور اس کا ٹائر بدل رہا تھا میرے قریب جانے تک اس نے ٹائر بدل لیا تھا اور اگلی سیٹ کھول کر بیٹھنے ہی والا تھا میں دوڑ کر اس کے پاس گیا۔ پرنام کیا اور کہا۔

"مہاراج آپ کی بڑی کرپا ہو گی مجھے آگے تک لے جائیں۔ میری ماتا جی سورگباش

ہو گئی ہیں۔ میرے پاس گاؤں جانے کے لئے پیسے نہیں ہیں"

ڈرائیور بوڑھا آدمی تھا اور ہندو تھا۔ اس نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اور کہا۔

"کہاں جاؤ گے؟ میں تو انبالے جا رہا ہوں"

میں نے کہا

"مہاراج مجھے جالندھر کے قریب میانوالے گاؤں جانا ہے۔"

میں نے اس خیال سے یونہی ایک فرضی گاؤں کا فرضی نام بول دیا تھا کہ پنجاب میں بے شمار چھوٹے چھوٹے گاؤں ہیں اور ان گاؤں کے نام اسی قسم کے ہوا کرتے تھے۔ اس نے کہا۔

"بیٹھ جا اندر۔ سویرے سویرے کیا کام لے کر آگئے ہو۔ انکار بھی نہیں کر سکتا۔"

وہ گاڑی سٹارٹ کر کے سڑک پر لے آیا اور گاڑی خالی سڑک پر چل پڑی۔ یہ پرانی سی موٹر کار تھی۔ خدا جانے کس ماڈل کی تھی اور اس کا کیا نام تھا۔ پھولی ہوئی نسواری رنگ کی گاڑی تھی۔ پچھلی سیٹ کافی نیچے بیٹھی ہوئی تھی۔ میں اس پر ایسے بیٹھ گیا کہ پیچھے سے کسی کو نظر نہ آسکوں۔ ڈرائیور نے پوچھا۔

"تم کہاں کام کرتے ہو کہ تمہاری ماتا سورگباش ہو گئی اور اس نے تمہیں گاؤں جانے کا کرایہ بھی نہیں دیا۔"

سوال اس نے بالکل ٹھیک کیا تھا۔ میں جلدی سے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ کیونکہ ڈرائیور مجھے سامنے لگے آئینے میں سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"مہاراج! ایک دکان پر خراد کا کام سیکھتا ہوں۔ لالہ جی دلی گئے ہوئے تھے۔ ماتا جی کے سورگباش ہونے کی خبر ملی تو کسی سے پیسے نہیں مانگ سکتا تھا۔ دس پندرہ روز ہی ہوئے ہیں یہاں کام کرتے۔ اکیلا دکان کی چھت پر سوتا ہوں۔

اس کے بعد ڈرائیور نے مجھ سے کوئی سوال نہ کیا۔ میں نے سیٹ پر کھسکتے کھسکتے اپنا سر نیچے کر لیا تا کہ پچھلے شیشے سے میں نظر نہ آسکوں۔ گاڑی ایک خاص رفتار سے بھاگی جا رہی تھی۔ سڑک پر ٹریفک زیادہ نہیں تھی۔ سورج نکل آیا تھا۔ دھوپ چاروں طرف

پھیل گئی تھی۔ پیچھے سے ایک ٹرک آگیا۔ ڈرائیور نے گاڑی ایک طرف کرلی۔ ٹرک گز
گیا۔ ڈرائیور نے گالی دے کر کہا۔

"اتنی تیز ٹرک چلاتے ہیں۔ ایکسیڈنٹ کیوں نہ ہوں گے"

میں بڑا چوکس ہو کر سامنے کی طرف سڑک پر دیکھ رہا تھا۔ دور تک سڑک خالی تھی
کوئی پندرہ بیس منٹ کے بعد کوئی قصبہ آیا جس کے مکان اور دکانیں جی ٹی روڈ کی دونو
جانب تھیں۔ خطرہ تھا کہ یہاں پولیس کا ناکہ نہ لگا ہو۔ مگر ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ گاڑ
قصبے سے گزر گئی۔ امرتسر سے جالندھر چالیس میل دور ہو گا۔ پون گھنٹے کے بعد جالندھ
کے آس پاس کا علاقہ شروع ہو گیا۔ یہ علاقہ میرا جانا پہچانا تھا۔ ڈرائیور نے سامنے وا
آئینے میں سے مجھے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"اوئے تمہارا گاؤں کہاں ہے؟ آگے تو جالندھر آرہا ہے۔"

میں یونہی موٹر کی کھڑکی میں سے باہر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ میرے حساب سے
وہیں کسی جگہ اتر جانا چاہئے تھا۔ کیونکہ جالندھر بڑا شہر تھا اور بڑا پولیس سٹیشن تھا و
ضرور پولیس میری تلاش میں گاڑیوں وغیرہ کی چیکنگ کر رہی ہو گی۔ میں نے کہا۔

"بس مہاراج یہاں روک دیں۔ یہاں سے میرا گاؤں زیادہ دور نہیں ہے۔"

اس نے گاڑی کچے میں روک دی۔ میں نے نیچے اتر کر اس کا ہندی زبان میں شکر
ادا کیا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا اور موٹر آگے چلی دی۔ میں سڑک سے اتر کر کھیتو
میں داخل ہو گیا۔ میں ایک قوس کی شکل میں جالندھر شہر کے مغرب کی طرف سے ہو
ایک لمبا چکر لگا کر بہت آگے جا کر دوبارہ جی ٹی روڈ پر نکل آنا چاہتا تھا۔ ابھی تک میں
یہی فیصلہ کیا تھا کہ اسی طرح ٹرکوں اور موٹر گاڑیوں میں لفٹ لے کر دلی کی جانب جتنا آ
نکل سکتا ہوں نکل جاؤں گا۔ سوچنے کو تو میں نے سوچ لیا اور چلنے کو چل بھی پڑا مگر جالن
شہر آزادی ملنے کے بارہ سال بعد بہت پھیل گیا تھا۔ نئی نئی کالونیاں بن گئی تھیں۔ نئے
کارخانے لگ گئے تھے۔ آبادی بہت ہو گئی تھی۔ کھیتوں سے نکل کر میں نے سامنے
جانب دیکھا تو آبادیاں ہی آبادیاں تھیں۔ میں اپنے اندازے کے مطابق ذرا ایک جانب

گیا۔ میں نصف دائرے کی شکل میں جالندھر شہر کی آبادیوں کے پیچھے سے ہوتا ہوا آگے
واپس جی ٹی روڈ پر جانا چاہتا تھا۔ لیکن آگے اتنی آبادی تھی کہ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا
کہ کس طرف سے رخ بدلوں؟

دن پوری طرح نکل آیا تھا۔

جگہ جگہ لوگ نظر آرہے تھے۔ کھیتوں میں ٹریکٹر بھی چل رہے تھے۔ میں ایک ج
سے گزرا جہاں درختوں میں اکھاڑہ بنا ہوا تھا۔ نوجوان ہندو سکھ وہاں زور کر رہے تھے
پاس ہی رہٹ چل رہا تھا۔ اس کا پانی ایک حوض میں سے ہو کر نالی کی شکل میں ا
طرف سے گزر رہا تھا۔ مجھے پیاس لگ رہی تھی۔ میں نے بیٹھ کر منہ ہاتھ دھویا اور آہ
آہستہ پانی پینے لگا۔ میری طرف کسی نے دھیان نہ دیا۔ دو تین ہندو اکھاڑے کے کنار
بیٹھے بدن پر تیل کی مالش کرتے ہوئے اونچی اونچی آواز میں ایک دوسرے سے ہنس ہنس
مذاق کی باتیں کر رہے تھے۔

ایک ہندو کہنے لگا۔

"سوھنیا اوئے خبردار ہو کر گھر جانا ایک پاکستانی جاسوس امرتسر جیل سے فرار ہ
ہے۔"

میرے کان کھڑے ہو گئے۔ دوسرے ہندو نے ہنس کر کہا۔

"تم بڑی افواہیں اڑاتے رہتے ہو"

پہلے والا ہندو بولا۔

"میں نے پرتاپ اخبار میں خبر پڑھی ہے تم ان پڑھ ہو۔ پڑھے لکھے ہوتے تو یہ
ضرور پڑھتے"

اس دوران ذرا پرے بیٹھے ہوئے ایک ہندو نے کہا۔

"تارا ٹھیک کہتا ہے۔ میں نے بھی پرتاپ میں یہ خبر پڑھی ہے۔ ایک پاکستانی جاسوس
بل توڑ کر بھاگ گیا ہے۔ اخبار نے لکھا ہے کہ وہ جالندھر انبالے کی طرف بھاگا ہے۔

اب میرا وہاں رکنا ٹھیک نہیں تھا۔ میں بڑے اطمینان سے اٹھ کر وہاں سے آگے
ل گیا۔ اخبار کے مطابق پولیس میرے پیچھے پیچھے جالندھر کی طرف آرہی تھی اور اس
ے علاوہ امرتسر پولیس کی رپورٹ پر جالندھر کی پولیس بھی ہوشیار ہو گئی ہو گی۔ خطرہ
ہرے قریب آگیا تھا۔ جالندھر شہر سے میں زیادہ واقف نہیں تھا۔ میں اندازے سے ہی
ف دائرے بنانے کی کوشش کرتے ہوئے جی ٹی روڈ پر بہت آگے نکل جانا چاہتا تھا مگر
بادیاں اور نئی کالونیاں جگہ جگہ بنی ہوئی تھیں۔ سڑکوں پر رکشا موٹریں اور سکوٹر چل
ہے تھے۔ لوگ دفتروں اور کالجوں کی طرف جا رہے تھے۔

جالندھر شہر کے صرف اس علاقے کو میں پہچانتا تھا جدھر مشرقی پنجاب کے ڈی آئی جی
لیس کی طوائف بیوی ہرپال کور کی کوٹھی تھی جہاں وہ اپنی طوائف ماں کے ساتھ رہتی
ں اور جہاں میں بھی دو تین راتیں گزار چکا تھا۔ ہرپال کور کا خیال آتے ہی میں نے سوچا
کیوں نہ اس کے ہاں جا کر کچھ دنوں کے لئے چھپ جاؤں۔ جب حالات ذرا معمول پر
ئے تو وہاں سے دلی روانہ ہو جاؤں گا۔ مگر مجھے یہ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ علاقہ یہاں
ے کس طرف ہے جہاں ہرپال کور کی کوٹھی ہے۔ یہ سکھ طوائف عورت مجھ سے بڑی
ت کرنے لگی تھی۔ آپ کو یاد ہو گا کہ میں نے اسے اپنا نام جگدیش بتایا تھا اور اپنے
پ کو جالندھر کا رہنے والا اور کالج سٹوڈنٹ ظاہر کیا تھا۔ میں سوچ بھی رہا تھا اور چل بھی
تھا۔

میں ایک کالونی کے کوارٹروں کے درمیان سے گزر گیا۔ آگے پھر ایک کالونی آگئی۔
ں سے اندازہ لگا کر جی ٹی روڈ کی طرف ہو گیا۔ میں ایک چھوٹے سے ویران میدان میں
گزر رہا تھا جہاں کوڑے کرکٹ اور لوہے کے سکریپ کے ڈھیر جگہ جگہ پڑے تھے۔
ان کو عبور کر کے چھوٹی سی سڑک پر آیا تو ایک جانب چار دیواری میں سبز رنگ کا
لہراتا نظر آیا۔ یہ جھنڈا ایک نیم شکستہ سے گنبد پر لگا ہوا تھا۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ یہ

کوئی مزار ہے میں دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا مزار کے دروازے کے پاس آگیا۔ میں نے اندر جھانک کر دیکھا۔ ایک جانب چھوٹی سی مسجد کا صحن تھا۔ دوسری طرف گنبد والے مزار کا چھوٹا سا دروازہ تھا جس کے اوپر چھوٹی چھوٹی سبز جھنڈیاں لگی تھیں۔ ایک آدمی دروازے کے پاس صف پر بیٹھا تھا۔ مسجد کے صحن میں بھی ایک آدمی صفیں تہہ کر رہا تھا۔ یہ کسی مسلمان بزرگ کا مزار تھا۔

اتنا مجھے معلوم تھا کہ جالندھر میں تقسیم کے وقت ایک بھی مسلمان باقی نہیں بچا تھا۔ کچھ عرصے کے بعد وہاں ریاست مالیر کوٹلہ کے پنجابی مسلمانوں نے آکر کاروبار شروع کر دیا تھا۔ کیونکہ ریاست مالیر کوٹلہ کے مسلمانوں کو سکھوں نے ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ ریاست کا سربراہ مسلمان تھا بلکہ اصل وجہ یہ تھی کہ اورنگ زیب کے زمانے میں جب سکھوں کے ایک گورو کے بچوں پر ایک روایت کے مطابق مغل دربار کی طرف سے ظلم وستم ہوا تو صرف ریاست مالیر کوٹلہ کے نواب نے اس کے خلاف آواز اٹھائی تھی۔ اس وقت سکھوں کے گورو نے پنتھ کو حکم صادر کر دیا تھا کہ آج سے ریاست مالیر کوٹلہ کے مسلمان ہمارے دوست ہیں۔ چنانچہ جب پاکستان بنا اور مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا قتل عام شروع ہو گیا تو ریاست مالیر کوٹلہ کے مسلمان محفوظ رہے تھے۔ ادھر ادھر کے دیہات سے پنجابی مسلمان یہاں آگئے تھے۔ یہ بات مجھے مالیر کوٹلہ کے مسلمان نے ہی بتائی تھی۔ اب خدا جانے اس میں کہاں تک سچائی ہے۔

مشرقی پنجاب میں جو مسلمان بزرگوں کے مزار تھے مسلمانوں کے جانے کے بعد سکھوں نے اسے سنبھال لیا تھا۔ کیونکہ اکثر ان مزاروں پر ہندو سکھ مرد عورتیں بھی مانتے آیا کرتی تھیں۔ میرے خیال میں یہ مزار بھی ایسا ہی تھا۔ مگر یہاں جو متولی باہر بیٹھا تھا اس کی شرعی ڈاڑھی تھی۔ وہ مسلمان معلوم ہوتا تھا۔ میں نے اپنے ذہن میں ایک بات سوچ کر اس کے پاس جا کر سلام کیا اور بزرگ کے مزار پر فاتحہ پڑھنے کے بعد وہیں ایک طرف بیٹھ گیا۔

متولی نے مجھ سے پوچھا۔

"تمہیں پہلے یہاں کبھی نہیں دیکھا۔ کہاں سے آئے ہو۔ پنجابی ہو کیا؟"

میں نے جواب دیا۔

"جی میں مالیر کوٹلہ سے جالندھر ایک عدالت میں پیشی بھگتنے آیا ہوں۔ میرے چچا نے مجھ پر دکان سے بے دخل کرانے کا کیس دائر کر رکھا ہے۔ سوچا ان بزرگ کے مزار پر آکر دعا مانگ لوں"

متولی نے میری طرف اس کے بعد کوئی خاص توجہ نہ دی اور جو صندوقچی اس نے اپنے سامنے رکھی ہوئی تھی اس میں سے پرانے تہہ کئے ہوئے کاغذ نکال نکال کر دیکھتا رہا۔

میں نے اصل مقصد کی طرف آتے ہوئے کہا۔

"میرا یہاں کوئی جاننے والا نہیں۔ کوئی سفارش کرنے والا بھی نہیں۔ چچا نے مجھ پر جھوٹا مقدمہ بنایا ہوا ہے۔ ہمارے محلے کے ایک بابو نے کہا تھا کہ جالندھر جا کر ڈی آئی جی پولیس کے پاس جا کر میرا نام لینا وہ تمہاری مدد کرے گا۔ میں ان کے دفتر گیا تھا وہاں نہیں تھے۔ مجھے ان کے گھر کا پتہ معلوم نہیں۔ سوچتا ہوں ڈی آئی جی صاحب کے گھر جا کر ان سے ملوں شاید وہ میری مدد کریں"

متولی نے کہا۔

"ڈی آئی جی تو سکھ سردار ہیں بڑے اچھے آدمی ہیں۔ تم ان سے ضرور ملو۔ وہ اکثر ادھر ہی رہتے ہیں۔ یہاں ان کی بیوی کی کوٹھی ہے میں تمہیں اس کا پتہ بتاتا ہوں۔ جا کر مل لو۔ شاید وہ تمہاری کوئی مدد کر دے۔"

اس نے مجھے ہرپال کور کی کوٹھی کا پتہ بتا دیا۔ میں نے متولی سے یہ کہہ کر تھوڑے پیسے ادھار لئے کہ میری جیب کٹ گئی تھی۔ مالیر کوٹلہ جاتے ہی یہ پیسے منی آرڈر کرا دوں گا۔ میں سلام کر کے اٹھا اور سڑک پر ایک طرف چلنے لگا۔ دل میں سوچ رہا تھا کہ میرا ہرپال کور کے ہاں جانا مناسب رہے گا یا نہیں۔ کہیں کسی مصیبت میں نہ پھنس جاؤں۔ لیکن پولیس چاروں طرف سے مجھے گھیرے میں لے رہی تھی۔ اس بات کا خطرہ تھا کہ میں اسی طرح پیدل چلتا رہا تو جی ٹی روڈ پر یا کہیں نہ کہیں ضرور پکڑ لیا جاؤں گا۔ میں نے

ایک خالی موٹر رکشا لیا اور ہرپال کور کی کوٹھی جس علاقے میں تھی اس طرف روانہ ہو گیا۔ کوٹھی کے گیٹ سے کافی پیچھے میں نے رکشا چھوڑ دیا۔ کوٹھی کو میں نے پہچان لیا تھا۔ پورچ اور لان خالی تھی۔ ہرپال کور کی گاڑی وہاں نہیں تھی۔ چوکیدار ایک طرف بیٹھا بیڑی پی رہا تھا۔ اس نے مجھے نہیں پہچانا تھا۔ میرا حلیہ بہت شکستہ ہو رہا تھا۔ کپڑے میلے کچیلے تھے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ شریمتی ہرپال کور جی گھر پر ہیں مجھے ان سے ملنا ہے میں ان کا رشتے دار ہوں تو وہ میری شکل صورت اور کپڑوں کو دیکھ کر بولا۔

"تم کہاں سے آئے ہو؟"

میں نے کچھ ایسی باتیں کیں کہ اسے یقین آگیا کہ میں شریمتی جی کا کوئی قریب رشتے دار ہوں جو ان سے مدد لینے آیا ہوں۔ کہنے لگا۔

"ادھر بیٹھ جاؤ۔ شریمتی جی اپنی ماتا کی خبر لینے ہسپتال گئی ہیں۔ ابھی آجائیں گی"

معلوم ہوا کہ ہرپال کور کی ماں ہسپتال میں داخل ہے۔ مجھے اس کی ماں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں کوٹھی کے باغیچے میں کیاری کے پاس بیٹھ گیا۔ کوئی پندرہ بیس منٹ کے بعد ہرپال کور کی گاڑی کوٹھی میں داخل ہوئی۔ وہ کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ اس کا پرانا سکھ ڈرائیور چلا رہا تھا جس کی شکل سے میں واقف تھا۔ ہرپال کور نے سرسری نگاہ سے مجھے دیکھا مگر نہ پہچانا۔ میں اٹھ کر پورچ کی طرف گیا۔ گاڑی پورچ میں کھڑی ہو گئی تھی۔ ہرپال کور گاڑی سے باہر نکل رہی تھی۔ اس نے مجھے دیکھا تو دیکھتی ہی رہ گئی میں نے ہاتھ جوڑ کر ست سری اکال کہا تو وہ حیران ہو کر بولی۔

"جگدیش جی تم ہو؟"

میں نے کہا۔

"ہاں شریمتی۔ میں جگدیش ہی ہوں"

"اندر آجاؤ۔ آؤ۔ آؤ"

میں ہرپال کور کے ساتھ ڈرائینگ روم میں آگیا۔ ہرپال کور ویسی کی ویسی ہی اس کے مردانہ حسن میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ مردانہ حسن میں نے اس لئے کہا

عورت ضرور تھی مگر مرد لگتی تھی۔ میں نے اسے ایک فرضی کہانی گھڑ کر سنادی کہ میرے پتا کی وفات کے بعد ہمارے حالات خراب ہو گئے۔ ہم نے اپنا جالندھر والا مکان بیچ دیا اور بمبئی چلے گئے۔ وہاں میں نے اپنا کاروبار شروع کیا کاروبار میں نقصان اٹھانا پڑا۔ جو پاس تھا سب ختم ہو گیا۔ ماتا جی بیمار رہ کر مر گئیں۔ میں نے بمبئی میں نوکری کی تلاش شروع کر دی۔ کچھ عرصہ ادھر ادھر چھوٹی موٹی نوکریاں کرتا رہا۔ مگر حالات نہ سدھر سکے۔ تنگ آکر واپس جالندھر آگیا ہوں۔

"میرے پاس اتنے پیسے بھی نہیں، تھے کہ ریل کا ٹکٹ خرید سکتا۔ بغیر ٹکٹ کے آیا ہوں۔"

ہرپال کور میری من گھڑت کہانی سے بہت متاثر ہوئی کہنے لگی۔

"تمہاری یہ حالت دیکھ کر میرے دل پر بڑا اثر ہوا ہے جگدیش جی۔ پر تم فکر نہ کرو۔ میں اپنے پتی سے کہہ کر تمہیں نوکری دلا دوں گی۔ جاؤ تم پہلے نہا دھو لو۔"

میں نے اس کی ماں کے بارے میں پوچھا کہ اب اس کی حالت کیسی ہے۔

"مجھے چوکیدار نے بتایا ہے کہ ماتا جی بیمار ہو کر ہسپتال میں پڑی ہیں"

ہرپال کور نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

"بس واہے گورو اپنی کرپا کر کے ماتا جی کو ٹھیک کر دیں۔ تم جا کر نہا لو۔"

میں غسل خانے میں جا کر خوب مل مل کر نہایا۔ ہرپال کور نے مجھے خدا جانے کس کا استری کیا ہوا کھدر کا کرتہ پاجامہ دیا۔ میں نے پہن لیا۔ نوکرانی چائے کے ساتھ بسکٹ وغیرہ لے کر آگئی۔ ہرپال نے پوچھا۔

"تم کھانا کھاؤ گے یا صرف چائے پیو گے؟"

میں نے کہا۔

"صرف چائے پیوں گا۔"

ہم چائے پینے اور باتیں کرنے لگے۔ ہرپال کور میرے سامنے صوفے پر بیٹھی تھی۔ کہنے لگی۔

"میرا خاوند سردار یہاں نہیں ہے۔ انبالے میں ہے۔ میں اس سے فون پر تمہا
نوکری کے بارے میں بات کروں گی۔ بلکہ میں اس سے تمہیں نوکری دلوا کر رہوں گ
آخر تم بی اے پاس ہو۔ بی اے کر لیا تھا ناں تم نے؟"

"ہاں۔ کر لیا تھا"

اتنے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میرا دل تھوڑا سا تیز ہو کر دھڑکا۔ آخر یہ پنجاب
ڈی آئی جی یا خدا جانے آئی جی پولیس کی کوٹھی تھی۔ یہاں پولیس کا بھی فون آسکتا
ہرپال کور نے فون اٹھایا۔ میں اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے لائن
دوسرا شخص تھا اس سے کہا۔

"سردار جی تو انبالے میں ہی ہیں۔ ہاں کیا؟ انبالے میں نہیں ہیں؟ تو پھر دلی یا
تھلے فون کر کے پتہ کر لو یہاں وہ تین دن سے نہیں آئے۔ ہاں۔"

اس نے فون رکھ دیا اور جو کوئی بھی فون پر بات کر رہا تھا اس کو پنجابی کی چھو
گالی دے کر کہنے لگی۔

"بڈھا کھوسٹ سردار نئی نئی طوائفوں سے عیش کرتا پھرتا ہے اور یہ پولیس
اس کی تلاش میں ادھر ادھر فون کرتے رہتے ہیں۔"

میں معلوم کرنا چاہتا تھا کہ ٹیلی فون پر کیا بات ہو رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔

"کیا کوئی خاص بات تھی؟"

ہرپال کور کے خضاب والے کالے سیاہ بال شانوں پر کھلے تھے۔ وہ انہیں پیچھے
کرجوں۔

"یہ سٹی سٹیشن کا ایس ایچ او گورمندر سنگھ تھا۔ کہہ رہا تھا کہ امرتسر جیل ۔
پاکستانی جاسوس فرار ہو گیا ہے اس سلسلے میں سردار جی سے کوئی آرڈر لینا ہے۔ میں
مجھے کیا پتہ بڈھا کس طوائف کے کوٹھے پر ہے جاؤ جا کر دلی میں دیکھو۔ اور اب ا
کپورتھلے میں بھی کسی طوائف سے یارانہ لگا لیا ہے۔ میری طرف سے جو مرضی
مجھے ہر ماہ قسط مل جاتی ہے۔ مجھے تو یہ سردار ویسے بھی زہر لگتا ہے۔"

ہرپال کور سامنے والے صوفے سے اٹھ کر میرے پاس آ گئی۔ اس کی ساڑھی اور
زو میں سے خوشبوئیں اٹھ رہی تھیں۔ میں یہ خبر سن کر بے حد محتاط ہو گیا تھا کہ
لندھر پولیس کو نہ صرف میرے فرار کی اطلاع مل چکی تھی بلکہ یہاں کی پولیس میری
اش میں سرگرم ہو گئی ہوئی تھی۔ صرف ایک بچت تھی کہ میں آئی جی پولیس کی کوٹھی
ں بیٹھا تھا۔ یہاں مجھ پر اتنی آسانی سے ہاتھ نہیں ڈالا جا سکتا تھا۔ لیکن سب سے بڑی
بیت یہ تھی کہ میری فوٹو امرتسر پولیس کے پاس تھی اور وہاں سے یقیناً جالندھر سٹی
لیس سٹیشن بھی پہنچ گئی ہو گی۔ مجھے یہ بھی ڈر لگ رہا تھا کہ اگر پولیس نے اخبار میں
ری تصویر چھپوا دی تو میں ہرپال کور کی کوٹھی میں ہی پکڑ لیا جاؤں گا۔ لیکن خدا کا شکر تھا
ہ جالندھر پولیس نے اخبار میں میری خبر ہی دی تھی۔ میری تصویر نہیں چھپی تھی۔ ہو
تا ہے کہ آج پولیس کے پاس میری تصویر نہ پہنچی ہو۔ کل تک پہنچ جائے۔ اس اعتبار
ے میں زیادہ دیر ہرپال کور کے پاس نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ میں ایک رات
اں بسر کر سکتا تھا مجھے اگلے روز وہاں سے ہر صورت میں دلی کی طرف روانہ ہو جانا
ہیے تھا اور جانا بھی اس طرح تھا کہ میں راستے میں پولیس کی ناکہ بندی اور چیکنگ سے
فوظ رہ سکوں۔ اس سلسلہ میں ہرپال کور میری مدد کر سکتی تھی۔ میں اسی لئے اس کے
س آ گیا تھا۔

پال کور چائے پینے کے بعد کہنے لگی۔

"چلو میرے ساتھ شاپنگ سنٹر چلو۔ اپنی پسند کے ریڈی میڈ کپڑے خرید لو۔"

میں وہاں سے ایک قدم باہر نہیں نکالنا چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔

"نہیں نہیں ہرپال جی اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہی کپڑے کافی ہیں اور پھر مجھے
ل واپس بمبئی بھی جانا ہے۔ ماتا جی کی سمادھی پر پھول چڑھانے ہیں۔ بمبئی سے واپس
ؤں گا تو پھر نئے کپڑے بنوا لوں گا۔"

ہرپال کور نے میری طرف آنکھیں جھپکاتے ہوئے دیکھا۔

"ارے تو کیا تم میرے پاس صرف ایک دن ہی ٹھہرنے کے لئے آئے تھے؟ نہیں۔

جگدیش جی۔ میں تمہیں اتنی جلدی نہیں جانے دوں گی۔"

اس نے اپنی عادت کے مطابق اپنا بازو میری گردن میں ڈال دیا اور پیار سے بولی
"اتنے دنوں بعد ملے ہو۔ میں تو تمہیں بڑا یاد کیا کرتی تھی۔ اچھا بتاؤ کیا تم نے
کبھی مجھے یاد کیا تھا؟"

میں اس وقت اس قسم کی باتوں کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس عورت کو پتہ ہی نہیں
کہ میں ہی وہ آدمی ہوں جو امرتسر جیل سے فرار ہوا ہے۔ جس نے ایک خون بھی
ہے۔ اور جس پر پاکستانی جاسوس ہونے کا الزام ہے۔ مگر مجبوری تھی۔ مجھے اس سے
بھری باتیں کرنی پڑ رہی تھیں۔ اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ واقعیٔ جھوٹی محبت کا
کرنا بہت بڑا صبر طلب کام ہے۔ میں نے بھی بادل نخواستہ اپنا بازو اس کی گردن میں
کر دیا۔ وہ بڑی خوش ہوئی۔ میں نے کہا۔

"ہرپال جی! میں چاہے جتنے بھی کشٹ اٹھاتا رہا پر واہگورو گواہ ہے کہ میں نے
بڑا یاد کیا۔ تم بہت یاد آتی رہی ہو۔"

اس نے میرا منہ چوم لیا۔ مجھے اس کے منہ سے شراب کی ہلکی سی بو آئی۔ م
پوچھا۔

"کیا تم نے دن کے وقت بھی پینی شروع کر دی ہے؟"

وہ دوبارہ میرا منہ چوم کر بولی۔

"یونہی ہسپتال جاتے وقت سکاچ کا ایک ہلکا سا پیگ پی لیا تھا۔"

پھر اس نے اپنا بازو میری گردن سے نکال لیا اور اداس ہو کر کہنے لگی۔

"مجھے اپنی ماتا جی کی بڑی فکر ہے۔ تم نہیں جانتے۔ میری ماتا جی نے مجھے
مصیبتیں جھیل کر پالا ہے۔"

اور اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ مجھ پر لازم تھا کہ میں اس کے
پونچھوں۔ میں نے اس کی ساڑھی کے پلو سے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"جی ہلکا نہ کرو ہرپال جی! واہگورو ماتا جی کو اچھا کر دے گا۔"

اس نے بڑی محبت کے ساتھ مجھے دیکھا اور کہا۔

"اگر تم باہر نہیں جانا چاہتے تو تم آرام کرو۔ میں تمہارے لئے پتلون قمیض خرید کر
لے آتی ہوں۔ مجھے تمہارے سائز کا پتہ ہے۔"

میں اسے روکتا ہی رہا مگر وہ نہ مانی اور گاڑی لے کر شہر کی طرف چل دی۔ میں
نگ روم میں چپ چاپ بیٹھا سوچتا رہا کہ مجھے یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہرنا چاہئے۔ کسی
ی وقت کچھ ہو سکتا ہے۔ سب سے زیادہ پریشانی مجھے اس بات کی تھی کہ امرتسر پولیس
ٹن سے پولیس پارٹی میری تصویر لے کر جالندھر شہر کی طرف روانہ ہو چکی ہو گی۔ اور
تصویر اخباروں کے دفاتر میں پہنچا دی جائے گی اور کل کے اخباروں میں میری تصویر
رور چھپ جائے گی۔ مجھے ہر حالت میں صبح صبح منہ اندھیرے یہاں سے نکل جانا ہو گا۔
نہ میں پکڑ لیا جاؤں گا۔

کوئی ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد ہرپال کور بازار سے واپس آئی۔ وہ میرے لئے دو اعلیٰ
الٹی کی قمیضیں اور دو جینز جرابیں رومال اور دو بنیانیں وغیرہ لائی تھی۔ کہنے لگی۔

"میرے سامنے پہن کر دکھاؤ"

میں نے ہنس کر کہا۔

"تمہارے سامنے نہیں، میں اندر جا کر پہنتا ہوں۔"

وہ ہنسنے لگی۔

"اچھا تو پھر میں بھی اندر آؤں گی"

یہ عورت ہی اس قسم کی تھی۔ آپ کو یاد ہو گا میں نے اپنی داستان کے شروع میں
ں عورت کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا تھا اور اس کی شخصیت اور کردار کے ہر پہلو پر
روشنی ڈالی تھی۔ یہ طوائف رہ چکی تھی۔ اس کی طوائف ماں نے ایک سکھ سے شادی کر
لی تھی۔ یہ اسی سکھ کی اولاد تھی۔ قد کاٹھ مردوں ایسا تھا۔ چہرے پر زنانہ حسن کی بجائے
مردانہ وجاہت زیادہ تھی۔ دل کی بڑی کشادہ اور سچی تھی۔ منہ پھٹ تھی۔ رات کو تھوڑی
ہت سکاچ ضرور پیتی تھی۔ کہتی تھی کہ مجھے اس کے بغیر نیند نہیں آتی۔ میں یونہی اسے

اچھا لگنے لگا تھا۔ وہ مجھے موڈ میں آکر کہا کرتی تھی۔

"جگدیش تم مجھے ہندو نہیں لگتے۔ تم میں ساری عادتیں مسلمانوں والی ہیں۔ تم دل
ہو۔ تمہارے شانے چوڑے ہیں اور تم بہادر مردوں کی طرح محبت کرتے ہو"

وہ خود بھی بڑی بہادر اور دلیر عورت تھی۔ اپنی گفتگو میں چھوٹی موٹی گالی عام بول
کرتی تھی۔ جب شراب پی لیتی تھی تو بڑی فحش گالیاں نکالتی تھی۔ کسی وقت اس
افسردگی کا دورہ پڑ جاتا تھا۔ پھر وہ خدا جانے کیا کیا یاد کر کے رونا شروع کر دیتی تھی۔
میرے ساتھ دوسرے کمرے میں آئی۔ اس کے باوجود میں نے دوسری طرف منہ کر
کپڑے بدلے۔ حیرانی کی بات ہے کہ وہ پورے میرے سائز کے کپڑے لائی تھی۔ میر
جوتے پھٹ گئے تھے۔ کہنے لگی۔

"چلو میرے ساتھ جوتے بھی خرید لو۔ میں جوتے اکیلی نہیں خریدنا چاہتی تھی"

میں جانا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے پولیس کی طرف سے خطرہ تھا کہ اگر پولیس کے پا
میری تصویر آگئی ہو گی تو میں مشکل میں پھنس سکتا ہوں۔ مگر وہ مجھے زبردستی گاڑی میں
کر لے گئی۔ ایک بہت بڑا شاپنگ سنٹر تھا۔ وہاں سے میں نے ایسے بوٹ خریدے جن
تلا ربڑ کا تھا۔ اس خیال سے کہ خدا جانے کب اور کہاں مجھے بھاگنا پڑ جائے اور سخت
والے جوتے مجھے پریشان نہ کریں۔ دوپہر کا کھانا ہم نے اکٹھے کھایا۔ اس کے بعد وہ یہ
کر چلی گئی کہ میں ماتا جی کا کھانا لے کر ہسپتال جا رہی ہوں۔ تم آرام کرو۔ اس کے جا
کے بعد میں نے نوکرانی سے کہا۔

"میں کمرے میں سو رہا ہوں۔ مجھے جگانا مت"

اور میں ہرپال کور کے بیڈ روم میں جا کر اس کے نرم آرام دہ بستر پر لیٹ گیا۔
نہیں چاہتا تھا مگر نیند آگئی اور سو گیا۔ آنکھ کھلی تو دیکھا کہ ہرپال کور مجھ پر جھکی مسکرا
تھی۔

"شام ہو گئی ہے اب اٹھ کر نہا دھو لو چائے پی کر اکٹھے فلم دیکھنے جائیں گے"

میں اٹھ بیٹھا۔ چائے میز پر لگی ہوئی تھی۔

ہم چائے پینے لگے۔ میں نے اپنی تسلی کے لئے یونہی پوچھ لیا۔

"کسی کا فون تو نہیں آیا تھا؟"

میرا مطلب یہ تھا کہ کہیں پولیس چوکی سے پھر کوئی فون نہ آگیا ہو۔ کہنے لگی۔

"ہاں آیا تھا۔"

میں نے جلدی سے پوچھا۔

"کس کا فون تھا؟"

وہ ایک چھوٹی سی گالی دے کر بولی۔

"بڈھے سردار میرے خاوند کا فون تھا۔ دلی سے آیا تھا فون۔ آج کل دلی میں عیش کر
ہا ہے۔ پر وہ کیا عیش کرے گا۔ اس کے پلے رہ کیا گیا ہے۔"

میں فلم دیکھنے کے لئے سینما ہاؤس بھی نہیں جانا چاہتا تھا مگر ہرپال کور پروگرام طے کر
ی تھی۔ کہنے لگی۔

"خبردار جو تم نے انکار کیا۔ تمہیں معلوم ہے میں تو اپنے خاوند کے ساتھ بھی کبھی
م دیکھنے نہیں جاتی۔ تمہارے ساتھ جاؤں گی۔ ضرور جاؤں گی۔ تم مجھے پیارے جو لگتے
و۔"

اتنے میں جوان خادمہ بڑے میں کچھ لے کر اندر آگئی۔ ہرپال کور نے اس کو سخت
ے ڈانٹ دیا۔

"تمہیں کئی بار کہا ہے دروازے پر دستک دے کر اندر آیا کرو۔"

وہ بے چاری شرمسار سی ہو کر خاموشی سے ٹرے میز پر رکھ کر واپس چلی گئی۔ وہ
ائے کے ساتھ کھانے کے لئے مزید کچوریاں بنا کر لائی تھی۔

میں نے اصل بات چھیڑ دی۔

"ہرپال جی! کیا خیال ہے صبح بمبئی کی ٹرین میں سیٹ بک کرا لوں؟"

ہرپال کور نے آہ بھر کر کہا۔

"میں مر گئی۔ جگدیش جی کیوں جدائی کی باتیں کر رہے ہو۔ چلے جانا۔ جب تمہیں

جانا ہی ہے تو چلے جانا"

میں نے کہا۔

"ہرپال جی ماتا جی کی سمادھ پر میں ہر منگل کی شام کو پھول چڑھاتا ہوں۔ پرسوں منگل ہے۔ کل یہاں سے جاؤں گا تو پرسوں ماتا جی کی سمادھ پر پھول چڑھا سکوں گا۔"

ہرپال نے گہرا سانس لے کر کہا۔

"صبح بمبئے ایکسپریس میں سیٹ بک کرا دوں گی وہ جالندھر سے منہ اندھیرے ساڑھے چار بجے چلتی ہے۔"

میں نے ضد کرتے ہوئے کہا۔

"سینما جاتے وقت ریلوے سٹیشن سے ہو کر چلیں گے۔ ٹرین میں سیٹ بھی بک کرا لیں گے۔"

"جیسے تمہاری مرضی۔ لیکن تمہیں مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہو گا۔"

"کیا؟" میں نے پوچھا۔

وہ میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔

"وعدہ یہ کرنا ہو گا کہ ماتا جی کی سمادھ پر پھول چڑھانے کے فوراً بعد تم میرے پاس واپس آجاؤ گے اور اس کے بعد یہاں جالندھر میں ہی رہو گے۔ میں تمہیں بڑی اعلیٰ نوکری دلوا دوں گی بس پھر دونوں روز ملا کریں گے وعدہ؟" اس نے ہاتھ میرے آگے کر دیا۔

میں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"وعدہ۔"

"ویری گڈ۔ اب چلو پہلے سٹیشن چل کر تمہاری سیٹ بک کراتے ہیں پھر سینما ہاؤس چلیں گے۔ بڑی اچھی انگریزی فلم لگی ہے۔"

وہ بڑی جلدی تیار ہو گئی۔ ہم گاڑی میں بیٹھے اور ریلوے سٹیشن کی طرف چل دیئے۔ وہ گاڑی خود ڈرائیو کر رہی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ ہرپال کور سے میری جگدیش

کے روپ میں آخری ملاقات ہے۔ کل میرے جانے کے بعد اس پر یہ حیرت انگیز راز کھل جائے گا کہ میں مسلمان پاکستانی جاسوس تھا جیسا کہ بھارتی پولیس نے میرے بارے میں مشہور کر رکھا تھا۔ اس خبر پر ہرپال کور کو کس قدر صدمہ ہو گا یہ مجھے اچھی طرح معلوم تھا۔ کیونکہ اسے پاکستان اور انڈیا سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اپنی پسند کے مردوں سے محبت کرنے والی' انہیں اپنے قبضے میں کر کے رکھنے والی عورت تھی اور میں اسے پسند آگیا ہوا تھا۔ اسے صرف یہ صدمہ ہو گا کہ اس کی پسند کا مرد اور وہ بھی ایک مسلمان مرد اس سے چھن گیا ہے۔ کیونکہ وہ سکھوں اور ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمان مردوں کی زیادہ شیدائی تھی۔ لیکن وہ حیران بھی ضرور ہو گی کہ میں اتنی دیر اس کے پاس رہا اور اسے خود بھی معلوم نہ ہو سکا کہ میں مسلمان ہوں۔

جالندھر ریلوے سٹیشن کے بکنگ آفس میں جا کر ہم نے بمبئے جانے والی گاڑی کی سیکنڈ کلاس میں ایک سیٹ بک کرائی اور اس کے بعد سینما ہاؤس کی طرف روانہ ہو گئے۔ مجھے اگرچہ دلی جانا تھا مگر میں ہرپال کور کو دلی کا نہیں بتانا چاہتا تھا۔ کیونکہ میرا راز فاش ہو جانے کے بعد پولیس نے اس سے ضرور پوچھنا تھا کہ میں کس طرف گیا ہوں۔ اس لئے میں نے بمبئے کی سیٹ بک کرائی تھی مجھے راستے میں دلی اتر جانا تھا۔ جالندھر کی پولیس ہرپال کور کو میرے بارے میں کچھ نہ بھی بتاتی تب بھی اگلے روز اخباروں میں میری تصویر کا چھپ جانا یقینی تھا۔ اور ہرپال کور کے ہاں سارے اخبار آتے تھے۔

سینما ہاؤس میں کافی رش تھا۔ ہم نے ایک بکس لے لیا اور مزے سے جا کر بیٹھ گئے۔ اس دوران میں ہر طرف سے پوری طرح چوکس رہا۔ ہرپال کور کی گاڑی پر کوئی جھنڈا وغیرہ نہیں لگا تھا پھر بھی پولیس اس کی گاڑی کو دور سے پہچانتی تھی۔ راستے میں کئی جگہ پولیس کے سپاہیوں نے سیلوٹ بھی کیا۔ سینما ہاؤس کی پارکنگ لاٹ میں بھی فوراً دو سپاہی ڈبل مارچ کرتے آگئے اور سیلوٹ مار کر ادب سے کھڑے ہو گئے تھے ہرپال کور نے ان کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔

"گاڑی کا خیال رکھنا۔ اگر میری گاڑی کی ذرا سی چیز بھی چوری ہوئی تو تمہاری

وردیاں اتروا دوں گی"

سپاہی سلیوٹ مار کر ایک بار پھر ادب سے کھڑے ہو گئے تھے۔ انگریزی فلم مار دھاڑ سے بھرپور تھی۔ اس میں بعض بڑے فحش سین بھی تھے۔ انڈیا کا سنسر بورڈ بڑا فراخ دل اور عیاش واقع ہوا تھا۔ ایسا کوئی سین آتا تو ہرپال کور سمٹ کر میرے ساتھ لگ جاتی۔

رات کو دس سوا دس بجے ہم فلم دیکھ کر سینما ہاؤس سے نکلے۔ ہرپال کور کہنے لگی۔

"اشوکا ہوٹل میں چل کر کھانا کھاتے ہیں"

اشوکا ہوٹل جالندھر کا اس زمانے میں سب سے ماڈرن ہوٹل تھا۔ ہوٹل والے بھی ہرپال کور کو جانتے تھے۔ ملازم ہمارے آگے پیچھے پھرنے لگے۔ کونے میں ایک بڑی رومانٹک سیٹ تھی۔ دھیما سا ٹیبل لیمپ جل رہا تھا۔ گلدان میں گلاب کے پھول بھی سج رہے تھے۔ ہم وہاں جا کر بیٹھ گئے۔ ہرپال کور نے مینو میری طرف بڑھا کر کہا۔

"اپنی پسند کا کھانا منگواؤ۔ میں آج تمہاری پسند کا کھانا کھاؤں گی"

میں نے مرغ بریانی کا آرڈر دیا تو وہ خوش ہو کر بولی۔

"تمہاری ساری عادتیں مسلمانوں والی ہیں۔ جگدیش سچ سچ بتاؤ۔ کہیں تم مسلمان تو نہیں ہو"

میں نے ہنس کر کہا۔

"بالکل نہیں۔ میں ہندو ہوں۔ میرا نام جگدیش ہے۔"

وہ میری طرف جھک کر کہنے لگی۔

"واہگورو کی سونہہ! اگر تم کہہ دیتے ناں کہ ہاں ہرپال میں واقعی مسلمان ہوں تو میں تم پر صدقے واری ہو جاتی۔"

وہ تہہ کیا ہوا ہوٹل والوں کا رومال کھول کر اسے اپنے زانوں پر رکھتے ہوئے بولی۔

"میرا ایک مسلمان یار ہوا کرتا تھا۔ وہ میری ماں کا گانا سننے آیا کرتا تھا۔ اس نے میرے ساتھ تعلقات قائم کر لئے کیا بتاؤں۔ کیسا مرد آدمی تھا۔ ارے یہ دال کھانے والے ہندوؤں میں مسلمانوں والی طاقت کہاں سے آسکتی ہے۔"

میں کسی کسی وقت ہوٹل کے سارے فلور کا جائزہ لے لیتا تھا۔ وہاں کوئی مشکوک چہرہ مجھے نظر نہیں آرہا تھا۔ اس وقت رات کے گیارہ بجے کا وقت ہو گا۔ میرے خیال کے مطابق اس وقت اخباروں کے دفتروں میں پولیس کے اشتہار کے ساتھ یا پولیس والوں کی خبر کے ساتھ میری تصویر دھڑا دھڑ چھپ رہی ہو گی۔ یہ اخبار صبح کے وقت بازار میں آجانے تھے۔ یہ بھی خیال پریشان کر رہا تھا کہ یہ اخبار دلی تک میرا پیچھا کریں گے۔ اخبار ہوائی جہاز کے ذریعے جالندھر سے آگے دلی بمبئی پہنچ جاتے تھے۔ مجھے جالندھر سے دلی تک کا سفر بھی بے حد چوکنا اور ہر طرف سے ہوشیار رہ کر طے کرنا تھا۔ کسی بھی راستے میں کسی بھی سٹیشن پر کوئی مسافر اخبار میں چھپی ہوئی میری تصویر دیکھ سکتا تھا۔ کئی سٹیشنوں پر تو میں نے دن کے وقت پلیٹ فارم پر لڑکوں کو ایک ایک ڈبے کے پاس جا کر اخبار فروخت کرتے دیکھا تھا۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید وہ ان باتوں کا خیال نہ کرتا اور یہ کہہ کر اپنے دل کو تسلی دے دیتا کہ کہاں میری تصویر امرتسر سے آئے گی اور کہاں اخباروں میں چھپے گی۔ لیکن میں ایک پروفیشنل اور تربیت یافتہ کمانڈو تھا۔ مجھے پہلا سبق یہ دیا گیا تھا کہ دشمن کے ملک میں ایک لمحے کے لئے بھی غافل ہو کر نہیں بیٹھنا اور جس بات کا گمان بھی نہ ہو اس کے بارے میں یقین کرنا کہ وہ تمہارے ساتھ آسکتی ہے۔ چنانچہ میں کمانڈو ٹریننگ کے اس پہلے درس پر پوری طرح عمل کر رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے یقین کر لیا کہ صبح کے اخباروں میں میری تصویر اس خبر کے ساتھ ضرور آجائے گی کہ یہ ایک پاکستانی جاسوس کی تصویر ہے اور جو امرتسر کی جیل سے فرار ہو کر جالندھر دلی کی طرف بھاگا ہے۔ لوگ خبردار رہیں۔ جہاں اس شکل کا کوئی آدمی دیکھیں وہیں اسے پکڑ کر قابو کر لیں اور پولیس کے حوالے کر دیں۔

کھانا کھانے کے بعد ہم واپس آگئے۔ میں نے کوٹھی کے الگ بیڈ روم میں جا کر کپڑے بدلے اور پلنگ پر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہرپال کور آگئی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ ضرور آئے گی۔ اس نے ریشمی نائٹ پہن رکھی تھی۔ کہنے لگی۔

"میں تمہیں اتنی جلدی نہیں سونے دوں گی جگدیش جی! کل تو تم مجھ سے جدا ہو

رہے ہو۔ پتہ نہیں کب واپس آؤ۔ چلو میرے کمرے میں چل کر باتیں کرتے ہیں۔"

میں جانتا تھا وہ مجھ سے کس قسم کی باتیں کرنا چاہتی ہے۔ میں وہ باتیں نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے سردرد کا بہانہ بنایا تو وہ بولی۔

"لاؤ میں تمہارا سر دبا دیتی ہوں"

وہ میرے پلنگ پر آکر بیٹھ گئی اور میرا سر دبانے لگی۔ ریشمی نائٹی میں سے خوشبو کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ تھوڑی دیر سر دبانے کے بعد اس نے بازو سے پکڑ کر مجھے اٹھایا اور کہنے لگی۔

"نہیں نہیں۔ اس طرح نہیں۔ میرے کمرے میں چلو"

میں مجبور تھا۔ اس کے ساتھ دوسرے بیڈ روم میں چلا گیا۔ وہاں مئے لالہ نام کا سارا بندوبست پہلے سے کیا جا چکا تھا۔ میں اس بک بک میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے دوسری باتوں میں لگا دیا۔ مگر وہ دوسری باتوں میں لگنے والی نہیں تھی۔ میرے دل سے ایک آواز آئی۔

"گناہ نہ کرنا۔ ورنہ مارے جاؤ گے"

میں آپ کو گناہ اور ثواب کا فلسفہ نہیں سمجھاؤں گا۔ کیونکہ اس کا فلسفہ میں بھی نہیں سمجھتا۔ لیکن اتنا مجھے میرے تجربے نے بتایا ہے کہ گناہ کرنے سے آدمی کے اندر ایک آواز مسلسل آنا شروع ہو جاتی ہے جو گناہ کرنے والے کو ملامت کرتی رہتی ہے۔ آدمی اپنے کان بند بھی کر لے تو یہ ملامت کرنے والی آواز سنائی دیتی رہتی ہے۔ نجیب آباد کے جنگلوں میں مجھے ایک بزرگ نے بتایا تھا کہ انسان کے بعض ایسے فعل ہوتے ہیں جن سے اس کی زندگی میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور بعض ایسے فعل ہوتے ہیں جن پر عمل کرنے سے انسان کی عمر کم ہونا شروع ہو جاتی ہے یہ سارے تجربے یہ ساری باتیں مجھے میری آوارہ گردیوں اور ایڈونچر کی مہموں کے دوران ملے ہوئے اللہ کے نیک بندوں نے بتائی تھیں۔

مگر ہرپال کور کسی اور ہی مٹی کی بنی ہوئی تھی۔ میں اس کی مٹی کو پہچانتا تھا۔ چنانچہ

میں نے اس سے سکھ مذہب اور سکھ مت کے گرو صاحبان کے بارے میں باتیں شروع کر دیں۔ ان باتوں نے اس پر کافی اثر کیا۔ وہ گلاس میں مے گلفام انڈیلنے لگی تھی۔ اس نے میری باتیں سن کر بوتل ایک طرف رکھ دی۔ پھر اس کے دل میں ایسا گداز پیدا ہوا کہ وہ بے اختیار رونے لگی۔ اس نے مجھے اپنی زندگی کی ساری دردناک کہانی سنا دی کہ کس طرح وہ ایک شریف عورت بن کر شادی کر کے گھر بسانا چاہتی تھی۔ اپنے بچوں کی ماں بننا چاہتی تھی۔ اپنے بچوں کو لائق بنانا چاہتی تھی مگر جس ماحول میں وہ پروان چڑھ رہی تھی اس ماحول نے اور اس ماحول کے لوگوں نے اسے ایسی عورت نہ بننے دیا۔

"میں کمزور تھی۔ نیکی کے کام کرنے میں کمزور تھی۔ میں نے ہار مان لی۔"

ہم کافی دیر تک اس قسم کی باتیں کرتے رہے۔ ماحول بالکل ہی بدل گیا تھا۔ میں نے کہا۔

" ہرپال جی اب تم آرام کرو۔ میں بھی سونے کے لئے جاتا ہوں۔ صبح مجھے جلدی ٹرین پکڑنی ہے"

ہرپال کور نے پوچھا۔

"تم نے ٹائم پیس کا الارم لگا دیا ہوا ہے نا؟"

"ہاں یہ کام میں نے آتے ہی کر دیا تھا۔"

"اچھا اب تم آرام کرو"

میں ہرپال کور کے بیڈ روم سے نکل کر اپنے بیڈ روم میں آگیا۔ آپ نے بھی یہ ضرور تجربہ کیا ہو گا کہ آدمی کو نیکی کا کوئی کام کر کے نیکی کا کام نہ سہی، کسی گناہ سے اپنے آپ کو بچا لینے کے بعد جو روحانی خوشی ہوتی ہے اس کے سامنے دنیا کی ہر خوشی ہیچ لگتی ہے۔ اس وقت میں بھی اپنے اندر روحانی خوشی کی ایک سرور انگیز لہر کو جاری وساری محسوس کر رہا تھا۔

میں نے ٹیبل لیمپ بجھا دیا اور آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگا۔ اس وقت آدھی رات گزر چکی تھی۔ مگر نیند میری آنکھوں سے دور تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی

کہ مجھے بار بار اس اخبار کا خیال آرہا تھا جس میں صبح میری تصویر اور خبر چھپ کر آنے والی تھی۔ میں دیر تک پلنگ پر لیٹا یہی سوچتا رہا کہ صبح جس وقت میں بمبئی ایکسپریس میں سوار ہوں گا تو اس وقت تک شاید اخبار چھپ کر مارکیٹ میں آچکے ہوں گے۔ کہیں میں سٹیشن پر ہی نہ پکڑا جاؤں میں نے سوچ رکھا تھا کہ اگر جالندھر یا کسی دوسرے سٹیشن پر لوگوں نے مجھے پہچان لیا تو میں مقابلہ کروں گا اور اتنی آسانی سے ان کے قابو نہیں آؤں گا۔

میں نے اندھیرے میں گردن ایک طرف کر کے تپائی پر رکھے چھوٹے ٹائم پیس کو دیکھا۔ اس کی سنہری سوئیاں رات کا ڈیڑھ بجارہی تھیں۔ میں نے فیصلہ کرلیا کہ اب میں نہیں سوؤں گا۔ نیند تو پہلے بھی نہیں آرہی تھی۔ بہتر ہے کہ میں باقی کی رات جاگ کر گزاروں۔ چار بجے کے قریب تو مجھے وہاں سے نکل جانا تھا۔ میں پلنگ کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ پہلے خیال آیا کہ ٹیبل لیمپ روشن کر دوں۔ پھر سوچا کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ اسی طرح بیڈ روم کے اندھیرے میں بیٹھا سوچتا رہا کہ ہرپال کور کا ڈرائیور مجھے چار بجے یہاں سے سٹیشن پر لے جائے گا۔ ہرپال کور تو اس وقت گہری نیند سو رہی ہو گی حالانکہ اس نے کہا تھا کہ مجھے ضرور جگا دینا۔ میں تمہارے ساتھ ریلوے سٹیشن جاؤں گی مگر میں اسے نہیں جگانا چاہتا تھا۔ خدا جانے آگے کیا ہونے والا تھا۔ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو کم از کم میں ہرپال کور کے سامنے اپنا راز فاش ہوتے نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

مجھے ایک آواز آئی۔

اس آواز پر میں نے یقین نہ کیا۔ یہ کال بیل کی آواز تھی۔ کسی نے کوٹھی کے برآمدے والے دروازے کے باہر لگا گھنٹی کا بٹن دبایا تھا۔ مدھم گھنٹی بجنے کی آواز آئی۔ اس وقت کون آ سکتا ہے۔ گھنٹی کی آواز دوسری بار آئی تو میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ مجھے معاملہ گڑ بڑ لگنے لگا۔ میں پلنگ پر سے چھلانگ لگا کر نیچے اترا اور اندھیرے میں ادھر ادھر ہاتھ مارتا غسل خانے میں گیا۔ غسل خانے کی بتی روشن کر کے دروازہ اتنا بند کر دیا کہ غسل خانے کے بلب کی تھوڑی سی روشنی بیڈ روم میں آتی رہے۔ میں نے بیڈ رو

سیابند دروازے کے ساتھ کان لگا دیا۔ کیونکہ مجھے نوکرانی کی آواز آئی تھی۔ وہ ہرپال کور کے بیڈ روم کے بند دروازے پر آہستہ سے دستک دے کر کہہ رہی تھی۔

"بی بی جی۔ باہر کوئی آیا ہے"

بیڈ روم کے دروازہ کھلنے کے ساتھ ہی ہرپال کور کی نیند میں ڈوبی ہوئی گالی کی آواز آئی۔

"کون آیا ہے اس وقت"

خادمہ نے کہا۔

"بی بی جی بڑے تھانیدار صاحب آئے ہیں جی ساتھ پولیس کے سپاہی بھی ہیں"

"وہ کیا لینے آئے ہیں آدھی رات کو؟"

ہرپال کور نے بڑی گندی گالی نکال کر پوچھا۔

خادمہ کی آواز آئی۔

"بی بی جی وہ کہتے ہیں بڑا ضروری ملنا ہے شرمیتی جی سے۔"

ہرپال کور گالیاں نکالتی بڑ بڑ کرتی جیسے کوریڈور میں آگئی۔ میں نے ذرا سا دروازہ کھول کر دیکھا۔ بیڈ روم کے بالکل سامنے وہ دروازہ تھا جو ڈرائنگ روم میں کھلتا تھا۔ درمیان میں چھوٹی سی راہ داری یا کوریڈور تھا۔ میں نے ہرپال کور کو دیکھا۔ وہ سلیپنگ گاؤن کا فیتہ کمر کے گرد باندھتے ہوئے ڈرائنگ روم میں داخل ہو گئی۔ اس کے پیچھے خادمہ بھی داخل ہو گئی۔ اس نے دروازہ بند کر دیا تھا۔ میں دبے پاؤں اپنے بیڈروم سے نکلا اور ڈرائنگ روم والے دروازے کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے پہلے اپنا کان دروازے سے لگایا۔ پھر ذرا سا دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔ مگر دروازے نے معمولی سی آواز پیدا کی۔ میں نے ہاتھ وہیں روک لیا۔ اس طرح کرنے سے دروازے میں اوپر سے نیچے تک ایک درز پیدا ہو گئی تھی۔ میں نے اس درز میں سے دیکھا کہ سامنے صوفوں کے پاس ایک سکھ تھانیدار وردی میں بڑے ادب سے کھڑا تھا۔ پیچھے چار سپاہی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے تھے۔ انہوں نے رائفلیں نیچی کر رکھی تھیں۔

ہرپال کور جاتے ہی اس پر برس پڑی۔

"تم کون ہوتے ہو مجھے آدھی رات کو آکر پریشان کرنے والے؟ کیا میں کوئی چور ہوں میں نے کہیں ڈاکہ مارا ہے؟ میں صبح تم سب کی پیٹیاں اتروا کر لائن حاضر کرا دوں گی؟"

سکھ تھانیدار نے ہاتھ جوڑ دیئے اور بولا۔

"بہن جی! ہمیں آپ کی حفاظت کے لئے آنا پڑا ہے۔ ورنہ ہم کبھی آپ کو اس وقت تکلیف نہ دیتے۔"

"میری حفاظت کے لئے؟" ہرپال کور نے تعجب سے پوچھا۔ "مجھے کیا ہو گیا تھا؟"

سکھ تھانیدار نے ادب سے کہا۔

"بات یہ ہے بہن جی کہ ایک خطرناک پاکستانی جاسوس امرتسر جیل سے بھاگ کر جالندھر آگیا ہے۔ وہ امرتسر میں ایک خون بھی کر چکا ہے۔"

"تو پھر میں کیا کروں؟ تم پولیس والے کیا کرتے ہو۔ تم اسے پکڑو جا کر۔ میرے پاس کیوں آگئے ہو؟"

سکھ تھانیدار نے عاجزی کے ساتھ کہا۔

"بات یہ ہے بہن جی! ہمیں رات کے نو بجے خبر مل گئی تھی کہ پاکستانی جاسوس امرتسر جیل سے بھاگ کر ایک چوکیدار کا خون کر کے جالندھر کی طرف آیا ہے۔ ہم نے اسی وقت شہر کی ناکہ بندی کر کے تفتیش شروع کر دی تھی۔ ہم نے جی ٹی روڈ کے آس پاس کی ساری کالونیوں میں لوگوں سے پوچھ گچھ کی تو شاہ جی کے مزار کے ایک آدمی نے ہمیں بتایا کہ ایک آدمی اس کے پاس آیا تھا اور وہ آئی جی صاحب کی کوٹھی کا پتہ پوچھ رہا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر کی بات ہے۔ ہم اس وقت آپ کی طرف دوڑ پڑے کہ یہ خطرناک قاتل قسم کا پاکستانی جاسوس ہے کہیں آپ کو کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔ بس جی ہم آپ کی خیریت معلوم کرنے آئے تھے۔ آپ کے پاس اس قسم کا کوئی اجنبی آدمی تو نہیں آیا؟"

اس دوران ہرپال کور صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ اور سکھ تھانیدار کی باتیں بڑے غور

سے سن رہی تھی۔ جب تھانیدار نے اپنی بات ختم کی تو ہرپال کور بولی۔

"یہاں کوئی اجنبی شخص نہیں آیا۔ اگر آتا تو میرا چوکیدار اسے کبھی اندر نہ گھسنے دیتا۔"

تھانیدار اسی طرح ادب سے کھڑا تھا۔ کہنے لگا۔

"بہن جی! وہ جیل توڑ کر اور قتل کر کے بھاگا ہے۔ وہ دیوار پھاند کر بھی اندر آسکتا ہے۔"

ہرپال کور نے غصے میں آکر کہا۔

"اگر آتا تو میں نے کوئی چوڑیاں نہیں پہنی ہوئی۔ میں سنگھنی ہوں۔ میرے پاس بھرا ہوا پستول بھی ہے۔ میں اسے وہیں شوٹ کر دیتی۔ اب جاؤ اور شہر میں جا کر اپنے پاکستانی جاسوس کی تلاش کرو۔"

سکھ تھانیدار ایک قدم پیچھے ہٹ کر کہنے لگا۔

"میں آپ کی حفاظت کے لئے کوٹھی کے باہر دو سپاہی چھوڑے جاتا ہوں۔ یہ ہمارا فرض ہے جی۔"

ہرپال کور نے صوفے سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے تم اپنا فرض پورا کرتے جاؤ اور خبردار آئندہ مجھے اس طرح پریشان کیا تو میں تمہارا وہ حشر کراؤں گی کہ یاد رکھو گے۔ دفع ہو جاؤ۔"

سکھ تھانیدار نے اور اس کے پیچھے کھڑے چاروں سپاہیوں نے سلیوٹ کیا اور دروازے سے باہر نکل گئے۔ میں بھی دروازے سے ہٹ کر دبے پاؤں راہ داری سے گزرتا اپنے بیڈ روم میں آگیا۔ اب میں اس انتظار میں تھا کہ اگر ہرپال کور کو شک پڑ گیا ہوگا کہ امرتسر جیل سے بھاگا ہوا پاکستانی جاسوس میں ہی ہوں تو وہ ضرور میرے کمرے میں آئے گی۔ وہ بڑی صاف صاف بات کرنے والی عورت ہے۔ وہ آتے ہی مجھ سے پوچھے گی کہ کیا میں ہی پاکستانی جاسوس ہوں؟ میں اس کے جواب میں کیا کہوں گا؟ بس میں اسی الجھن میں پھنس گیا تھا۔ معاملہ خراب ہو چکا تھا۔ پولیس میری تلاش میں ہرپال کور کی

کوٹھی تک آگئی تھی۔ باہر دو مسلح کانسٹیبل بھی پہرہ دے رہے تھے۔ اب میری پر
صرف اسی میں تھی کہ خدا کرے ہرپال کور کو میرے بارے میں شک نہ پڑا ہو کہ میں
امرتسر جیل سے بھاگا ہوا پاکستانی جاسوس ہوں۔ جس طرح کی وہ باتیں سکھ تھانیدار سے
رہی تھی اس سے تو میں نے یہی اندازہ لگایا تھا کہ وہ مجھے پاکستانی جاسوس نہیں سمجھ رہی
لیکن یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ اندر سے سارا معاملہ سمجھ گئی ہو مگر مجھے پولیس کے حوالے
کروانا چاہتی ہو۔ بہرحال میں دونوں طرح سے پریشان تھا۔

بیڈ روم میں اندھیرا تھا۔ میں پلنگ پر ٹانگیں لٹکائے خاموش بیٹھا تھا۔ میرے اندر
ایک ہیجان سا مچا ہوا تھا۔ کسی وقت خیال آتا کہ ابھی یہاں سے فرار ہو جاؤں۔ پر سوچتا
اکیلا یہاں سے بھاگا تو باہر مسلح کانسٹیبل کھڑے ہیں۔ ہر طرف شور مچ جائے گا۔ میں ہمہ
گوش بھی تھا یعنی میں نے بیڈ روم میں اور باہر کوریڈور میں چھائی ہوئی خاموشی پر کان
لگائے ہوئے تھے کہ ابھی مجھے ہرپال کور کے قدموں کی آواز سنائی دے گی۔ وہ میرے
کمرے کی طرف آرہی ہوگی۔ وقت گزرتا چلا گیا۔ خاموشی اسی طرح چھائی رہی۔ ہرپال
کور نہ آئی۔ میری نیند پہلے ہی اڑ چکی تھی۔ اب مجھ سے آرام سے وہاں بیٹھا بھی
جارہا تھا۔ کسی بھی وقت کچھ ہو سکتا تھا۔ بہت ممکن تھا کہ سکھ تھانیدار نے کوٹھی کے
چاروں طرف کچھ دوسرے سپاہی بھی اندھیرے میں پھیلا دیئے ہوں جو کوٹھی کے آس
پاس کی نگرانی کر رہے ہوں۔ پولیس والے احمق نہیں ہوتے۔ میں حیران تھا کہ دا
شریف کے متولی نے تھانیدار کو یہ کیوں بتا دیا کہ ایک آدمی آئی جی پولیس کی کوٹھی کا
پوچھ رہا تھا۔ وہ مسلمان تھا۔ میں بھی مسلمان تھا۔ پھر خیال آیا کہ متولی کو جالندھر میں
تھا۔ وہ دریا میں رہ کر مگر مچھ سے بیر نہیں ڈال سکتا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ پولیس
کوئی اپنا آدمی وہاں متولی بنا کر رکھ چھوڑا ہو تاکہ اگر کوئی بھولا بھٹکا پاکستانی جاسوس اد
نکلے تو پولیس کو اطلاع مل جائے۔ کیونکہ یہ تو حقیقت ہے اور اس حقیقت سے انڈیا
پاکستان دونوں ملک باخبر ہیں کہ بھارت میں پاکستان کے جاسوس اور پاکستان میں بھارت
جاسوس کسی نہ کسی بھیس میں موجود رہتے ہیں۔ یہ ہر ملک کا حق ہوتا ہے اور اس

لئے باقاعدہ اصول اور ضوابط بنے ہوئے ہیں۔ کہ اگر کسی دوسرے ملک کا جاسوس پکڑا
جائے تو اس پر باقاعدہ مقدمہ چلتا ہے اور اسے سال دو سال کے لئے جیل میں ڈال دیا جاتا
ہے۔

میں عجیب کش مکش میں مبتلا ہو گیا تھا۔ کبھی پلنگ پر بیٹھتا۔ کبھی اٹھ کر اندھیرے
کمرے میں ادھر ادھر ٹہلنے لگ جاتا۔ گھڑی رات کے سوا دو بجا رہی تھی۔ پورے پونے
چار بجے کا میں نے الارم لگا کر رکھا تھا۔ یہ دھڑکا بھی لگا تھا کہ ابھی ہرپال کور آجائے گی اور
مجھ سے پوچھے گی کہ کیا میں واقعی پاکستانی ہوں؟ مجھے اور کچھ نہ سوجھا تو میں نے جلدی
جلدی پتلون قمیض اور جوتے پہن لئے۔ میں فرار ہونے کے لئے بالکل تیار ہو جانا چاہتا تھا
کہ اگر ہرپال کور کی نیت بدل بھی گئی تو میں اسے بڑی آسانی سے قابو کر لوں گا اور پلنگ
کے ساتھ چادر سے باندھ کر وہاں سے جس طرح بھی ہو سکا بھاگ جاؤں گا۔ بمبئی
ایکسپریس کا ٹکٹ میری جیب میں تھا۔ ایک پریشانی یہ بھی اپنی جگہ پر موجود تھی کہ جالندھر
پولیس ریلوے سٹیشن پر بھی موجود ہو گی۔ یہ خدا کا شکر تھا کہ سکھ تھانیدار کے پاس
امرتسر سے میری تصویر نہیں پہنچی تھی۔ اگر میری تصویر تھانے میں آگئی ہوتی تو سکھ
تھانیدار ضرور میری تصویر ساتھ لاتا اور ہرپال کور کو میری تصویر دکھا کر پوچھتا کہ یہ آدمی
تو کوٹھی میں نہیں آیا۔ اس حقیقت نے دوسری طرف مجھے ایک اطمینان بھی دلا دیا۔ اگر
تھانے میری تصویر ابھی تک نہیں پہنچی تھی تو ظاہر ہے جالندھر کے اخباروں کے دفتر میں
بھی میری تصویر نہیں آئی ہوگی۔ چنانچہ کم از کم جالندھر کے اخباروں میں صبح میری تصویر
نہیں چھپے گی۔ لیکن امرتسر کے اخباروں میں میری تصویر کا چھپنا یقینی امر تھا۔ اور امرتسر
کے اخبار جالندھر صبح نو دس بجے تک پہنچ سکتے تھے۔ ہرپال کور ابھی تک میرے بیڈ روم
میں نہیں آئی تھی۔

اب مجھے یقین ہونے لگا کہ اس کو مجھ پر بالکل شک نہیں پڑا۔ اس کا خیال میری
طرف نہیں گیا تھا۔ میں نے غسل خانے کی بتی روشن کر رکھی تھی۔ اس کا دروازہ تھوڑا
سا کھلا تھا۔ جسے میں نے راہ داری سے واپس آکر پورا بند کر دیا تھا۔ میں نے بیڈ روم کے

دروازے کی چٹخنی بھی لگا دی تھی۔ میرے ذہن میں یہ خیال بھی تھا کہ اگر ہرپال کور
باہر ہی سے شور مچانا شروع کر دیا کہ دروازہ کھولو۔ مجھے پتہ چل گیا ہے کہ تم ہی پاکستا
جاسوس ہو تو میں غسل خانے کی کھڑکی میں سے بھاگ جاؤں گا۔ دروازہ نہیں کھولوں گا
لیکن یہ سوچ کر مطمئن ہو جاتا کہ اگر ہرپال کور نے ایسا کرنا ہوتا تو وہ سکھ تھانیدار کو صاف
صاف بتا دیتی کہ ایک آدمی میرے پاس ضرور آیا ہوا ہے۔ مگر وہ اپنے آپ کو ہندو ظاہر
کرتا ہے۔ آپ لوگ اس سے پوچھ گچھ کر سکتے ہیں۔ مگر ہرپال کور نے ایسا نہیں کیا تھا۔

میرا ذہن اس وقت طرح طرح کے پریشان کر دینے والے الٹ پلٹ خیالات کی
آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ میں نے ٹائم پیس کا بٹن دبا دیا۔ تاکہ اس کا الارم نہ بجے۔ میں نہیں
چاہتا تھا کہ اس کا شور پیدا ہو۔ اس کی سیکنڈوں کی سوئی بڑی مدھم ٹک ٹک کے ساتھ
گردش کر رہی تھی۔ میں نے غسل خانے میں جا کر اپنے چہرے کو غور سے دیکھا۔ چہرہ
ٹھیک ٹھاک تھا۔ میں نے جیب سے کنگھی نکال کر بالوں میں پھیری۔ یہاں ایک کھڑکی
تھی۔ وہ بند تھی۔ میں نے اس خیال سے کہ ہو سکتا ہے مجھے اس طرف سے کود کر باہر
پڑے کھولا تو دیکھا کہ اس کی باہر کی جانب لوہے کی سلاخیں لگی تھیں۔ اس کا مطلب
کہ اب مجھے ہر حالت میں کوٹھی کے مین گیٹ کی طرف سے نکلنا تھا۔ میں اصل میں ہرپال
کور کو بتائے بغیر وہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔

میں نے ٹائم پیس کی طرف دیکھا تو سوا تین بج رہے تھے۔ میں آہستہ سے بیڈ روم
دروازہ کھول کر راہ داری میں آ گیا۔ سامنے ڈرائنگ روم والا دروازہ تھا۔ وہ کھلا تھا۔ میں
آہستہ آہستہ چلتا ڈرائنگ روم میں آیا۔ ڈرائنگ روم کا برآمدے کی طرف کھلنے وا
دروازہ بھی بند تھا۔ میں قالین پر چلتا دروازے تک گیا۔ کنڈی کھول کر آہستہ سے باہر
جانب دھکیلا۔ وہ کم بخت باہر سے بند تھا۔ شاید خادمہ نے سکھ تھانیدار اور سپاہیوں کے
جانے کے بعد باہر سے چٹخنی لگا دی تھی۔ اب میرے سامنے دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں
واپس اپنے بیڈ روم میں آ گیا اور اندھیرے میں ٹٹولتا ہوا پلنگ پر بیٹھ گیا۔ گھڑی پر نگاہ ڈالی
اس کی چمکتی ہوئی سوئیاں پونے چار بجا رہی تھیں۔ اگر میں نے اس کا بٹن دبایا نہ ہوتا

ں وقت اس کا الارم بج اٹھنا تھا۔ مجھے اب ریلوے سٹیشن کی طرف چل دینا چاہیے تھا۔
ں کی طرف جانے والی ٹرین منہ اندھیرے چلتی تھی۔ مگر میرے سارے دروازے بند
تھے۔

اتنے میں مجھے کسی دوسرے کمرے میں گھڑی کے الارم بجنے کی دبی ہوئی آواز سنائی
ی۔ شاید یہ آواز ہرپال کور کے بیڈ روم سے آ رہی تھی۔ ضرور اس نے بھی صبح کا الارم
یا ہو گا۔ پھر یہ آواز اچانک بند ہو گئی۔ جیسے کسی نے اس کا بٹن دبا دیا ہو۔ ہرپال کور
اگ پڑی تھی۔ میں ایک بار پھر غسل خانے میں گھس گیا۔ یہ میری اضطراری غیر شعوری
رکتیں تھیں۔ میں اس وقت ہرپال کور سے اس طرح بچ رہا تھا جیسے وہ پولیس آفیسر ہو اور
ھے گرفتار کرنے آ رہی ہو۔ مجھے اس کے بیڈ روم کے غسل خانے میں پانی گرنے کی آواز
نے لگی۔ پھر اس کے کھانسنے کی آواز آئی۔ وہ منہ ہاتھ دھو رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں وہ
رے کمرے میں آنے والی تھی۔ میں نے بغیر ارادے کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔
لیے سے منہ پونچھا اور غسل خانے سے نکل کر کمرے کی بتی روشن کر دی۔ مجھے ہرپال
ور کے بیڈ روم کا دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی۔ میں جلدی سے پلنگ پر بیٹھ
یا۔ مجھے اور کچھ نہ سوجھا۔ میں نے جوتے اتار دیئے۔ ایک پاؤں دوبارہ جوتے میں ڈالا
ور اس کے تسمے باندھنے لگا۔ دروازے پر ٹھک ٹھک ہوئی۔

"کون؟" میں نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"میں ہوں۔ ہرپال"

ہرپال کی آواز پر میں نے غور کیا۔ اس میں وہی اپنائیت تھی جو سکھ تھانیدار کے
نے سے پہلے تھی۔ مجھے کچھ حوصلہ ہوا۔ میں نے کہا۔

"دروازہ کھلا ہے ہرپال جی"

وہ دروازہ کھول کر اندر آ گئی۔ ایک لمحے کے لئے مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے سکھ
نیدار اندر آ گیا ہے۔ میرے ہاتھ سے جوتا چھوٹ گیا۔ میں نے جلدی سے جوتا اٹھایا اور
س میں دوسرا پاؤں ڈالتے ہوئے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا ہوا تم نے الارم لگایا ہوا تھا۔ میرا الارم بجا ہی نہیں۔ ویسے میری آنکھ ٹھیک وقت پر کھل گئی تھی"

میں اپنی جانب سے بڑی بے نیازی سے بات کر رہا تھا لیکن میری آنکھیں اس کے چہرے کا مسلسل جائزہ لے رہی تھیں۔ ہرپال کور کے چہرے پر ہلکی تھکی ہوئی نیم خوابید سی مسکراہٹ تھی۔ اس نے ساڑھی پہنی ہوئی تھی اور بالوں کو یونہی برش کیا ہوا تھا۔ تھوڑی سی لپ سٹک لگالی تھی۔ میرے پاس آکر اس نے جھک کر میری گردن پر پیار کیا۔ میری جان میں جان آئی۔

"جگدیش! جلدی واپس آنا۔ پہلے کی طرح نہ کرنا کہ واپس آنے کا نام ہی نہ لو"

میں نے اس کی کمر کے گرد بازو حائل کر دیا۔ یہ میری طرف سے انتہائی اطمینان اظہار تھا۔ میرے سر پر سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا تھا ہرپال کور کو مجھ پر ذرا سا بھی شک نہیں پڑا تھا۔ اگر اسے مجھ پر شک پڑ گیا ہوتا تو یقین کریں وہ ایسی عورت تھی کہ مجھے صاف صاف کہہ دیتی کہ تم نے میرے ساتھ جھوٹ کیوں بولا۔ مجھے پہلی ملاقات میں کیوں نہ بتا دیا کہ تم پاکستانی جاسوس ہو۔ میں تو پھر تم سے زیادہ پیار کرتی۔ کیونکہ مسلمان مرد بڑے اچھے لگتے ہیں۔ لیکن اس نے ایسی کوئی بات نہیں کہی تھی۔ کہنے لگی۔

"اچھا کیا تم تیار ہو کر بیٹھے ہو۔ اب آجاؤ۔ نہیں تو گاڑی نکل جائے گی"

میں نے کمرے پر ایک سرسری نگاہ ڈالی اور ہرپال کور کے پیچھے پیچھے بیڈ روم نکل کر ڈرائنگ روم میں آگیا۔ ہرپال کور نے ڈرائنگ روم کے تالے کو پتلی سی چابی لگا کھولا اور ہم برآمدے میں آگئے۔ دروازے کو باہر سے کسی نے چٹخنی نہیں لگائی تھی ہرپال کور نے ہی اسے لاک کیا ہوا تھا۔

باہر پچھلے پہر کی خنک ہوا چل رہی تھی۔

برآمدے کی بتی جل رہی تھی۔ پورچ میں گاڑی کھڑی تھی۔ بوڑھا سکھ ڈرائیور وجود نہیں تھا۔ ہرپال کور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ میں اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ انجن غرایا اور پھر گاڑی پورچ میں سے باہر نکل آئی۔ ہرپال کور نے ہلکا سا ہارن دیا۔ ؤکیدار نے دوڑ کر کوٹھی کا گیٹ کھول دیا۔ گیٹ کی دونوں جانب بتیاں روشن تھیں۔ میں نے گہری نگاہوں سے سامنے والے درختوں کی طرف دیکھا۔ وہاں مجھے کچھ انسانوں کے سائے نظر آئے۔ یہ پولیس کے سپاہی تھے جنہیں سکھ تھانے دار نے وہاں ہرپال کور کی فاظت کے لئے یا مجھے گرفتار کرنے کے لئے تعینات کیا ہوا تھا۔ گاڑی بڑے آرام سے باہر نکل کر کوٹھیوں کے درمیان والی چھوٹی سڑک سے ہوتی ہوئی بڑی سڑک پر آگئی۔ گاڑی کی رفتار تیز ہو گئی۔ جالندھر کی اس فیشن ایبل کالونی کی سڑکیں رات کے پچھلے پہر کی خاموشی میں خالی پڑی تھیں۔ میں نے ہرپال سے بالکل نہیں پوچھا تھا کہ رات کو کس نے گھنٹی بجائی تھی۔ میں نے یہ ظاہر کیا جیسے مجھے کچھ پتہ ہی نہیں ہے۔ کچھ دور چلنے کے بعد ہرپال کور نے خود ہی کہا۔

"تمہیں معلوم نہیں رات کو تھانیدار آیا تھا؟"

میں نے ان جان بن کر تعجب سے پوچھا۔

"تھانیدار آیا تھا؟ وہ کیوں؟ خیریت تو تھی؟"

ہرپال کور کہنے لگی۔

"کوئی پاکستانی جاسوس امرتسر کی جیل سے بھاگ گیا ہے۔ پولیس اس کی تلاش میں تھی۔ یہاں سے ایک مزار شریف ہے۔ پولیس سراغ رسانی کرتی وہاں پہنچی تو وہاں جو آدمی رہتا ہے اس نے بتایا کہ ایک آدمی میرے سردار خاوند کی کوٹھی کا پتہ پوچھ رہا تھا۔ پولیس کو شک پڑا کہیں یہ پاکستانی جاسوس ہی نہ ہو اور سردار جی کو قتل کرنا چاہتا ہو۔ تھانیدار آدھی رات کو میرے پاس آگیا۔ کہنے لگا جی یہاں کوئی مشکوک آدمی تو نہیں آیا۔ آپ کی حفاظت کے لئے بھی آئے ہیں۔ میں نے انہیں بہت گالیاں دیں۔ تم نے کوٹھی سے باہر نکلتے وقت دیکھا نہیں۔ سامنے پولیس کے سپاہی کھڑے تھے۔ یہ میری حفاظت کے لئے تھانیدار لگا گیا تھا۔

پھر وہ تھانیدار کو گالیاں دینے لگی۔

"میری نیند حرام کر گیا۔ میں تو پھر ٹھیک طرح سو بھی نہیں سکی۔ بھئی پاکستانی جاسوس بھاگ گیا ہے تو میں کیا کروں۔ تمہارے انڈین جاسوس بھی تو پاکستان میں جاسوسی کرتے پھرتے ہیں۔ دھماکے کرتے پھرتے ہیں۔ ان کا کوئی جاسوس یہاں آگیا ہے تو پھر کیا ہوا آنے دو اسے بھی۔"

میں نے کہا۔

"نہیں۔ مجھے بالکل پتہ نہیں چلا۔ میں سو رہا تھا۔"

"اچھا ہوا کہ تم سو رہے تھے۔ ورنہ میرے ساتھ تمہاری بھی نیند خراب ہوتی۔"

سڑکیں خالی پڑی تھیں۔ ہرپال کور نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ بڑی محبت بھرے انداز میں بولی۔

"مجھے وچن دو کہ تم بمبئی میں زیادہ دن نہیں ٹھہرو گے اور وہاں سے سیدھے میرے پاس آؤ گے۔"

میں نے کہا۔

"میں وچن دیتا ہوں کہ بمبئی سے سیدھا تمہارے پاس آؤں گا اور بڑی جلدی آؤں گا۔"

وہ خوش ہو کر کہنے لگی۔

"اب اس وچن پر مردوں کی طرح قائم رہنا۔ سردار کی تم فکر نہ کرو۔ وہ بڈھا کھوسٹ جالندھر والی کوٹھی میں کبھی کبھار ہی آتا ہے۔ آبھی گیا تو میں اسے بھگا دوں گی۔ اس کی کیا مجال ہے کہ میرے سامنے بولے۔"

گاڑی اب ریلوے سٹیشن کے سامنے آگئی تھی۔ سٹیشن کی بتیاں جگمگا رہی تھیں۔ مسافر گاڑیوں اور تانگوں رکشوں سے اتر کر اپنا اپنا سامان قلیوں سے اٹھوا رہے تھے۔ جالندھر کے سٹیشن میں بارہ برس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ ویسے کا ویسا ہی تھا۔ ہرپال کور نے گاڑی ایک طرف اندھیرے میں کھڑی کر دی۔ میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے کر دبایا۔ پھر انہیں چوما اور کہنے لگی۔

"لگتا ہے تم مجھ سے پھر بے وفائی کرو گے اب گئے ہو تو جانے کتنے سالوں بعد ملو گے۔"

میں نے کہا۔

"ہرپال جی! میں نے تمہیں وچن دیا ہے میں اپنا وچن پورا کروں گا۔ ماتا جی کی سمادھ پر پھول چڑھانے کے بعد فوراً بمبئی سے جالندھر روانہ ہو جاؤں گا"

اس نے پرس میں سے ایک لفافہ نکال کر میرے ہاتھوں میں تھما دیا اور بولی۔

"اسے میرے سامنے مت کھولنا۔ اسے میری محبت کی چھوٹی سی نشانی سمجھ کر سوئیکار کر لینا۔"

میں نے لفافہ قمیض کی جیب میں ڈال لیا اور کہا۔

"شکریہ ہرپال جی۔ اب میں جاتا ہوں"

"رب راکھا"

اس نے میری طرف مسکراتے ہوئے دیکھ کر کہا۔ میں گاڑی سے نکل کر تیز تیز قدموں سے سٹیشن کی لابی کی طرف چل پڑا۔ میں نے ایک لمحے کے لئے بھی مڑ کر پیچھے نہ دیکھا کہ ہرپال کور کی گاڑی وہاں کھڑی تھی یا نہیں۔ اب میری ساری توجہ آگے کی جانب

تھی۔ ریلوے پولیس کا کوئی آدمی ابھی تک مجھے دکھائی نہیں دیا تھا۔ لابی کے اندر آگے جا کر پلیٹ فارم کا گیٹ تھا جہاں ایک ٹی ٹی کرسی پر بیٹھا مزے سے سگریٹ پی رہا تھا۔ میں نے اس سے بمبئی ایکسپریس کا ٹائم پوچھا۔

اس نے بے نیازی سے کہا۔

"بس آنے والی ہے۔"

میں نے پوچھا۔

"لیٹ تو نہیں ہے مہاراج؟"

اس شخص نے کہا۔

"ہو سکتا ہے لیٹ ہو۔ امرتسر سے تو ٹھیک وقت پر چلی تھی۔"

میں ٹکٹ دکھا کر پلیٹ فارم پر آگیا۔ اگر ٹرین امرتسر کے سٹیشن سے چل پڑی تھی تو اس کا مطلب تھا کہ وہ جالندھر پہنچنے ہی والی تھی۔ بمبئی ایکسپریس رن تھرو گاڑی تھی اور آزادی ملنے اور پاکستان بن جانے کے بعد امرتسر سے نبار ہو کر بمبئی جایا کرتی تھی۔ پہلے یہ گاڑی پشاور سے بمبئی اور بمبئی سے پشاور تک جایا کرتی تھی۔ پلیٹ فارم پر کافی ہجوم تھا۔ بہت مسافر تھے۔ یہ میرے لئے اچھی بات تھی۔ میں سیدھا اخباروں والے سٹال کی طرف گیا۔ چند قدموں کے فاصلے پر کھڑے ہو کر دیکھا۔ سٹال پر کچھ اخبار اور رسالے پڑے تھے۔ آہستہ آہستہ قریب آگیا۔ مجھے ڈر تھا کہ اخبار آگیا ہو گا۔ اس میں اگر میری تصویر چھپی ہوئی ہو گی تو سٹال والے نے بھی ضرور دیکھ لی ہو گی۔ مگر بہت جلد مجھے معلوم ہو گیا کہ جالندھر کے اخبار ابھی سٹال پر نہیں آئے تھے۔ سٹال والے نے کہا کہ جالندھر کے اخبار ایک گھنٹے بعد چھپ کر آئیں گے۔ میں نے امرتسر کے اخباروں کے بارے میں پوچھا تو وہ بولا۔

"امرتسر کے اخبار جنتا ایکسپریس میں آتے ہیں جو بمبئی ایکسپریس کے ڈیڑھ گھنٹہ بعد آئے گی۔"

میں نے کہا۔

"امرتسر کے اخبار ہوائی جہاز سے نہیں آتے؟"

سٹال والا ہنس کر بولا۔

"مہاراج! ہوائی جہاز کا خرچہ بہت ہوتا ہے۔ پھر تو اخبار چار پانچ روپے کا بکنا چاہئے۔"

جب کہ اس زمانے میں اخبار کی قیمت انڈیا میں ایک آنہ ہوا کرتی تھی۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس کا مطلب تھا کہ جب یہاں اخبار آئیں گے تو میں جالندھر سے کافی دور نکل چکا ہوں گا اور جنتا ایکسپریس والے اخبار تو انبالہ اور لدھیانہ دلی وغیرہ کافی دیر بعد پہنچیں گے۔ مجھے یہ خیال نہیں آیا تھا کہ انبالے سے آگے اخبار بذریعہ ہوائی جہاز پہنچائے جاتے ہیں اور جب میری گاڑی میرٹھ پہنچے گی تو میری تصویر والے اخبار دلی بمبئی اور انبالہ لدھیانہ سب شہروں میں پہنچ چکے ہوں گے اور میں کسی بھی جگہ پہچانا جا سکوں گا۔

مجھے اس خطرے کے خلاف احتیاطی تدابیر اختیار کرنی تھیں۔ اور یہ تدابیر یہی ہو سکتی تھیں کہ میں ہر سٹیشن پر ڈبے سے اتر کر جائزہ لوں کہ حالات کیسے ہیں۔ اگر ہنگامی صورت حال پیدا ہو جائے تو بجائے اس کے کہ میں ڈبے میں بیٹھا بیٹھا پکڑ لیا جاؤں باہر ہی سے فرار ہو جاؤں۔

ابھی رات کا اندھیرا تھا۔ میں بمبئی ایکسپریس میں سوار ہو گیا۔ سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ تھا۔ یہ دو مسافروں کا کوپے تھا۔ ایک آدمی پہلے سے اپنی سیٹ پر بستر لگائے سو رہا تھا۔ میں دوسری سیٹ پر لیٹ گیا۔ ایکسپریس ٹرین تھی۔ جالندھر سے چلی تو چھوٹے سٹیشنوں کو چھوڑتی چلی گئی۔ لدھیانے میں صبح کی روشنی پھیلنے لگی تھی۔ میں ڈبے سے اتر کر سیدھا کتابوں رسالوں کے سٹال پر گیا۔ معلوم ہوا اس روز کا تازہ اخبار ابھی نہیں آیا تھا۔ میں مطمئن ہو کر واپس ڈبے میں آگیا۔

ڈبے میں جو دوسرا مسافر سفر کر رہا تھا وہ ایک بوڑھا ہندو کاروباری آدمی تھی۔ وہ بیمار تھا اور بیشتر وقت بستر پر ہی لیٹا رہا۔ اس نے مجھ سے صرف اتنا پوچھا کہ میں کہاں جا

رہا ہوں۔ اس کے بعد نیند کی گولی کھا کر سو گیا۔ انبالے کافی دن چڑھ آیا تھا۔ گاڑی رکی تو پلیٹ فارم پر اتر کر سیدھا بک سٹال پر گیا۔ ہندی انگریزی اور اردو کے تازہ اخبار آگئے ہوئے تھے۔ کچھ لوگ وہیں کھڑے خبریں دیکھ رہے تھے۔ امرتسر سے ایک اخبار گورکھی کا اور ایک ہندی کا چھپتا تھا۔ میں گورکھی تو نہیں جانتا تھا مگر ہندی پڑھ لیتا تھا۔ میں جلدی سے ہندی کا اخبار اٹھا کر دیکھنے لگا۔ میں ایک دم سنبھل گیا۔ اخبار کے پچھلے صفحے پر میری تصویر چھپی ہوئی تھی۔ یہ خبر نہیں تھی۔ چھوٹا سا اشتہار تھا۔ اس میں لکھا تھا کہ یہ تصویر ایک پاکستانی جاسوس کی ہے جو امرتسر جیل سے فرار ہو گیا ہے۔ اس نے ایک آدمی کا قتل بھی کیا ہے۔ یہ شخص جس کسی کو جہاں بھی دکھائی دے اسے پکڑ کر پولیس کے حوالے کر دیا جائے۔

ایک بات کی وضاحت میں یہاں ضروری سمجھتا ہوں۔ میں اب کوئی عام قسم کا نو آموز جاسوس نہیں تھا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ میں ادھر خود بارڈر کراس کر کے کشمیر کے جہاد میں شرکت کرنے انڈیا آیا تھا۔ مجھے کسی حکومت نے جاسوسی کرنے یا جہاد کشمیر میں حصہ لینے کے لئے نہیں بھیجا تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ میں ایک عرصے سے انڈیا میں مقیم تھا۔ مجھے یہاں کے شہروں سے اور یہاں کے لوگوں کی ذہنیت سے اور پولیس کے ہتھکنڈوں سے کافی واقفیت ہو گئی تھی۔ میں نے انڈیا میں ہی ایک مرد مومن سے کمانڈو کی سخت تربیت حاصل کی تھی اور میرے اندر سخت جانی کے علاوہ بہت زیادہ اعتماد پیدا ہو چکا تھا۔ اب تو میں نے عملی طور پر پولیس کا تشدد بھی دیکھ لیا تھا۔ میری وہ حالت نہیں تھی کہ ذرا سی بات پر یا کسی غیر معمولی بات پر گھبرا جاؤں۔ نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر میں کسی بھی وقت پکڑا جا سکتا ہوں تو فرار بھی ہو سکتا ہوں۔ یہ الگ بات تھی کہ پولیس کی بھاری نفری مجھے نرغے میں لے کر فائرنگ کر کے ہلاک کر دے۔ میں موت سے بھی نہیں ڈرتا تھا۔ میرے دل سے موت کا خوف اس وقت ہی نکل گیا تھا جب میں اپنے باپ کی آخری وصیت پر عمل کرتے ہوئے کشمیر کے جہاد میں شریک ہونے کے لئے انڈیا میں داخل ہوا تھا۔ موت کے خوف کی جگہ میرے دل میں صرف خدا کا خوف پیدا ہو

چکا تھا۔ میرا ایمان تھا اور آج بھی ہے کہ اسلام اور پاکستان کی راہ میں جان قربان کرنے والا شہید ہوتا ہے اور شہید کبھی نہیں مرتا۔ وہ مرنے کے بعد سیدھا جنت میں جاتا ہے۔

چنانچہ میں نے جب امرتسر میں چھپنے والے ہندی اخبار میں اپنی تصویر والا اشتہار دیکھا تو مجھ پر گھبراہٹ بالکل طاری نہیں ہوئی تھی۔ میں محتاط ضرور ہو گیا تھا۔ میں نے وہاں جو لوگ کھڑے تھے ان کا جائزہ لیا۔ ان میں سے ابھی تک شاید کسی نے میری تصویر والا اشتہار نہیں پڑھا تھا۔ لوگ مشرقی پنجاب کی سیاسی خبریں بڑے انہماک سے پڑھ رہے تھے۔ اشتہار میں میری وہ تصویر چھپی تھی جو امرتسر جیل کے حکام نے اتاری تھی۔ میں میلی قمیض میں تھا اور میری شیو بڑھی ہوئی تھی۔ تصویر اتنی صاف بھی نہیں تھی۔ پھر بھی میں پہچانا جاتا تھا۔ میں نے جالندھر کا ایک اخبار دیکھا۔ اس کے پچھلے صفحے پر بھی میری تصویر والا اشتہار چھپا ہوا تھا۔ میں خاموشی سے اپنے ڈبے میں آکر بیٹھ گیا۔ میرے لئے ضروری تھا کہ میں دلی پہنچنے تک کسی طرح اپنا حلیہ بدل لوں۔ میرے پاس حلیہ بدلنے کے لئے کوئی چیز نہیں تھی۔ میں نے صرف اتنا کیا کہ پتلون کی جیب سے رومال نکال کر اسے اپنے سر پر باندھ لیا اور نیچے والی سیٹ چھوڑ کر اوپر والی سیٹ پر جا کر لیٹ گیا۔

ٹرین انبالے سٹیشن پر دس پندرہ منٹ تک کھڑی رہی۔ یہاں سے چلی تو میرٹھ کینٹ کے سٹیشن پر جا کر رکی۔ میں اوپر والی برتھ سے ایک لمحے کے لئے بھی نیچے نہ اترا۔ میں کسی قسم کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ دلی تک میں ڈبے کی برتھ پر ہی لیٹا رہا۔ کبھی کبھی اپنے ساتھی ہندو مسافر پر یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ میں سو رہا ہوں خراٹے لینے لگتا تھا۔

خدا خدا کر کے دلی کا سٹیشن آیا۔ اگر مشرقی پنجاب کے اخباروں میں میری تصویر چھپی تھی تو یقینی بات تھی کہ کم از کم دلی کے اخباروں میں بھی ضرور چھپی ہو گی۔ ٹرین پلیٹ فارم میں داخل ہو کر آہستہ ہو گئی تھی۔ جب رکی تو میں برتھ سے نیچے آیا اور بڑے اطمینان سے ڈبے میں سے اتر کر کسی کی طرف دیکھے بغیر پیچھے کی طرف چل پڑا۔ مسافروں کے ہجوم میں سے جان بوجھ کر گزر رہا تھا۔ ٹرین کے پچھلے ڈبے کے پاس ریلوے پولیس کا آدمی گارڈ سے کوئی بات کر رہا تھا۔ میرے سر پر رومال بندھا ہوا تھا۔ میں نے ایسی اداکاری

شروع کر دی جیسے مجھے کسی آدمی کی تلاش ہے۔ میں ڈبے میں جھانک کر دیکھنے لگا۔ پھر
خاموشی سے پولیس کے سپاہی اور گارڈ کے قریب سے آگے نکل گیا۔

یہ ٹرین کا آخری ڈبہ تھا۔ آگے ریلوے لائن خالی تھی۔ میں لائن میں اتر گیا اور
دوسری لائن عبور کر کے دوسرے پلیٹ فارم پر آگیا۔ یہاں بہت کم لوگ تھے۔ دلی کے
ریلوے سٹیشن کے حدود اربعے سے میں واقف تھا۔ میں ریلوے گودام کی طرف چل پڑا۔
پلیٹ فارم کی ڈھلان آگئی۔ دائیں جانب جنگلے کے قریب ریلوے گودام کا پھاٹک تھا جو
آدھا کھلا تھا۔ میں گودام کے احاطے میں داخل ہونے لگا تو پیچھے سے کسی نے آواز دی۔

"ٹکٹ ہے تمہارے پاس؟"

میں نے مڑ کر دیکھا۔ ایک ریلوے ٹی ٹی کھڑا مجھے گھور کر دیکھ رہا تھا۔ میں نے جلدی
سے جیب سے سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ نکال کر اسے دکھایا۔ اس نے ٹکٹ دیکھ کر کہا۔

"یہ تو بمبئی کا ٹکٹ ہے۔"

سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ دیکھنے کے بعد ریلوے ٹی ٹی کا لہجہ نرم ہو گیا تھا۔ میں نے کہا۔

"بات یہ ہے کہ میں بمبئی ہی جا رہا ہوں لیکن یہاں میرا ایک رشتے دار پرشوتم داس
گودام میں ملازم ہے۔ سوچا اس سے ملتا چلوں۔"

ٹی ٹی نے مجھے ٹکٹ واپس کرتے ہوئے بڑے اخلاق کے ساتھ کہا۔

"زیادہ دیر نہ لگائیے گا۔ ٹرین یہاں زیادہ دیر نہیں رکے گی"

"بس میں ابھی آیا۔"

میں نے ٹکٹ لے کر جیب میں رکھا اور مال گودام کے احاطے میں اس طرف
پڑا جدھر مال گودام کے دفتر تھے۔ ان دفتروں کے عقب میں باہر جانے کا راستہ تھا۔
اس راستے سے باہر نکل گیا۔ باہر آتے ہی میں نے موٹر رکشا لیا اور سیدھا بستی نظام الدین
اولیا پہنچ گیا۔ خطرہ میرے سر پر برابر منڈلا رہا تھا کہ کہیں مجھے کوئی پہچان نہ لے۔ ر
میں نے اسی طرح سر پر باندھا ہوا تھا۔ میں مزار شریف کے گیٹ کے پاس پبلک ٹیلی
بوتھ پر گیا اور گل خان کا نمبر ڈائل کیا۔ ایک موہوم سی امید تھی کہ شاید وہ موجود

دوسری طرف گھنٹی بالکل نہ بجی۔ میں نے دوسری بار تیسری بار ڈائل پر نمبر گھمایا مگر ہر بار
دوسری طرف خاموشی چھائی رہی۔ میں سمجھ گیا کہ پیچھے معاملہ خراب ہو چکا ہے اور گل
خان روپوش ہو گیا ہے اور اس کا ٹیلی فون کٹ گیا ہے۔ یا اس نے خود کاٹ دیا ہے۔ میں
سوچنے لگا کہ گل خان کے پرانے مکان میں جاؤں یا نہ جاؤں؟ پروفیسر جمشید کا میرے پاس
فون نمبر نہیں تھا۔ وہ جس دفتر میں کام کرتا تھا اس دفتر کا مجھے علم تھا۔ وہاں ڈائریکٹری پڑی
ہوئی تھی۔ ڈائریکٹری میں سے پروفیسر جمشید کے دفتر کا نمبر مل گیا۔ میں نے وہ نمبر ڈائل
کیا۔ دوسری طرف سے کسی عورت کی آواز آئی۔ اس نے انگریزی میں پہلے اپنے آفس کا
نام لیا۔ پھر پوچھا کہ مجھے کس سے ملنا ہے۔ میں نے کہا۔

"مجھے پروفیسر جمشید سے ملنا ہے۔ کیا میں ان سے بات کر سکتا ہوں؟"

عورت نے کہا۔

"پلیز ہولڈ آن"

چند لمحوں کے بعد دوسری طرف سے پروفیسر جمشید کی آواز آئی۔

"ہیلو! میں پروفیسر جمشید بول رہا ہوں"

اس قسم کے حالات کے لئے ہم نے پہلے سے ایک منصوبہ بنا رکھا تھا کہ اگر ایسے
حالات پیدا ہو جائیں تو ہم ایک خاص جملہ بول کر اپنی شناخت کرائیں گے۔ میں نے کہا۔

"میں غازی آباد سے آپ کے لئے خالص گھی لے کر آیا ہوں۔ میرا نام مکھی داس
ہے۔"

یہ دونوں جملے یا جملہ ہمارا کوڈ تھا۔ پروفیسر جمشید فوراً سمجھ گیا کہ میں بول رہا ہوں۔
اس نے بڑی پرسکون آواز میں کہا۔

"مکھی داس جی گھی میرے مکان پر پہنچا دیں۔ میں اس وقت آپ سے نہیں مل
سکتا۔"

اس کا مطلب تھا کہ میں دفتر ٹائم کے بعد رات کو ملوں گا۔ مکان سے پروفیسر کی مراد
گل خان والا ویران مکان تھا۔ میں نے کہا۔

"اچھا جی! دھنواد"

میں نے فون بند کر دیا اور بوتھ سے نکل کر ارد گرد گہری نگاہ ڈالی۔ شام ہو چکی تھی۔ اندھیرا پھیل رہا تھا۔ مزار شریف اور بستی کی جانب روشنیاں ہو رہی تھیں۔ مزار شریف کی طرف سے قوالی کی آواز آ رہی تھی۔ میں چپکے سے اس کچی سڑک پر چل پڑا جو مغل شہزادے کی قبر والے احاطے کے قریب سے ہو کر گل خان کے ویران مکان کو چلی گئی تھی۔ اس مکان پر کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اگر خطرہ ہوتا تو پروفیسر جمشید کبھی یہ نہ کہتا کہ گھی میرے مکان پر پہنچا دو۔ خطرے کی صورت میں وہ مجھے صرف اتنا کہتا۔

"گھی واپس لے جاؤ۔ مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

میں نے مکان کے پاس پہنچ کر خفیہ جگہ سے چابی نکالی۔ دروازے کا تالا کھولا اور سیڑھیاں چڑھ کر دوسری منزل والے اکلوتے کمرے میں آ گیا۔ میں نے سر پر سے رومال کھول کر جیب میں رکھا اور کھڑکی ذرا سی کھول کر باہر دیکھنے لگا۔ باہر خاموشی اور ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ آپ کو معلوم ہی ہو گا کہ یہ کوارٹر نما چھوٹا سا مکان گل خان نے کسی زمانے میں خرید لیا تھا مگر وہ خود شہر کے اندر ایک محلے میں رہتا تھا۔ اس مکان میں ہماری خفیہ ملاقاتیں ہی ہوتی تھیں۔

میں نے نیچے جھک کر سگریٹ جلایا اور کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر اسے اس طرح پینے لگا کہ کش لگاتے وقت سگریٹ کے سرے کی سرخ روشنی باہر سے نظر نہ آئے۔ میں سوچنے لگا کہ گل خان کہاں روپوش ہوا ہو گا۔ کہیں پولیس اسے پکڑ کر نہ لے گئی ہو۔ اتنا مجھے معلوم تھا کہ گل خان بڑا دلیر کمانڈو اور اسلام کا فدائی ہے وہ پولیس کے تشدد سے مر جائے گا مگر زبان نہیں کھولے گا۔ یہی وجہ تھی کہ پروفیسر جمشید ابھی تک اپنے دفتر میں کام کر رہا تھا۔ اگر ایسی ویسی کوئی بات ہوتی تو گل خان کے ساتھ ہی پروفیسر جمشید بھی روپوش ہو چکا ہوتا۔ اب مجھے پروفیسر کا شدت سے انتظار تھا۔ کیونکہ وہی مجھے بتا سکتا تھا کہ دلی میں میری گرفتاری کے بعد حالات کیا صورت اختیار کر چکے ہیں۔ میں کھڑکی سے ہٹ کر چارپائی پر لیٹ گیا۔ مجھے چندریکا کی بدروح کا خیال آ گیا۔ یہ بدروح میری دشمن بن چکی

تھی اور کسی وقت بھی مجھے کسی مشکل میں پھنسا سکتی تھی۔ پہلے میں اس کا خیال کرتا تھا تو وہ آجایا کرتی تھی۔ لیکن یہ ان دنوں کی بات ہے جب وہ میری دشمن نہیں تھی اور اسے یقین تھا کہ میں اس کی بھارت ماتا کو نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ اس وقت وہ مجھ سے محبت بھی کرتی تھی اور اس نے کہا تھا کہ وہ مجھ سے شادی کرنے کے لئے جسمانی روپ میں بھی آجائے گی اور شادی کر کے میری موت تک میرے ساتھ زندگی گزارے گی اور میری موت کے بعد بقول اس کے وہ دوسرے جنم میں ہمیشہ کے لئے میرے پاس آجائے گی۔ لیکن دوارکا فورٹ کی تباہی کے بعد وہ میری دشمن بن گئی تھی۔ وہ کسی بھی وقت میری بربادی کا باعث بن سکتی تھی۔ اگرچہ میں اس کا مقابلہ کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتا تھا۔ پھر بھی وہ شیطانی مخلوق کا روپ اختیار کر چکی تھی۔ اور میرے لئے ایک مسلسل خطرہ بنی ہوئی تھی۔ میں اس سے جھوٹ موٹ کی محبت جتا کر اسے اپنا حمایتی بھی نہیں بنا سکتا تھا۔ کیونکہ وہ میرے دل کا حال معلوم کر لیتی تھی۔

اس کے ساتھ ہی مجھے مغل شہزادے کی پیش گوئی بھی کسی وقت پریشان کرتی تھی۔ مغل شہزادے کی روح نے مجھے کہا تھا کہ مجھ پر ایک بھاری مصیبت نازل ہونے والی ہے مجھے اس کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ خدا جانے یہ کون سی مصیبت تھی۔ مصیبتوں نے تو مجھے چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ اگر مجھے خدا کی ذات پر بھروسہ نہ ہوتا اور خدا کی مالکیت پر میرا پکا ایمان نہ ہوتا تو میں ہمت ہار سکتا تھا۔ لیکن میرے دل میں اسلام پاکستان اور کشمیر کے لئے جان قربان کر دینے اور دشمنوں سے زندگی کے آخری سانس تک کشمیر کے آزاد ہونے تک جنگ لڑنے کا جذبہ اتنا شدید تھا کہ میرے ارادے چٹان سے بھی زیادہ مضبوط ہو گئے ہوئے تھے۔ بلکہ اب یہ حال ہو گیا تھا کہ ہر مصیبت میرے اندر ایک عزم ایک نئی طاقت پیدا کر دیتی تھی۔

میں چارپائی پر دیر تک لیٹا انہی خیالات میں گم رہا۔ کھڑکی آدھی کھلی تھی۔ اس میں سے شروع سردیوں کی رات کی خنک ہوا اندر آ رہی تھی۔ میری جیب میں ہرپال کور کا دیا لفافہ اسی طرح موجود تھا۔ اس میں ہرپال کور نے سو سو کے سات نوٹ رکھ دیئے تھے۔

سات سو روپے بہت رقم تھی۔ 1960ء تک یہ خاصی رقم ہوا کرتی تھی۔ راستے میں میں
نے صرف انبالے میں کھانا کھایا تھا۔ رات کا اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ میں سوچنے لگا خدا
جانے پروفیسر جمشید کب آئے گا۔ کہیں میرے ٹیلی فون آنے کے بعد وہ بھی نہ پکڑا گیا ہو۔
طرح طرح کے وسوسے اور اندیشے میرے دل میں پیدا ہو رہے تھے۔ میں نے گھڑی
پر نگاہ ڈالی۔ رات کے 9 بج رہے تھے۔ میں اٹھ کر کھڑکی کے پاس آ کر نیچے دیکھنے لگا۔ مجھے
کچی سڑک پر ایک سایہ آتا دکھائی دیا۔ میں نے آنکھیں سکیڑ کر غور سے دیکھا۔ سایہ مکان
کی طرف آ رہا تھا۔ میں نے کھڑکی کا آدھا پٹ بھی بند کر دیا اور ذرا سا کھول کر باہر دیکھتا
رہا۔ سایہ مکان کے احاطے میں داخل ہو گیا۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ پروفیسر جمشید ہی
تھا۔ میں نے کھڑکی بند کر دی اور کمرے کی کنڈی کھول کر سیڑھیاں اتر کر نیچے آیا۔
ڈیوڑھی کا دروازہ میں نے بند کر کے چٹخنی لگا دی ہوئی تھی۔ دروازے پر آہستہ سے دستک
ہوئی۔ میں نے مخصوص کوڈ میں پوچھا۔

"بشیر سہارن پور سے ابھی نہیں آیا"

باہر سے کوڈ الفاظ میں ہی پروفیسر جمشید نے جواب دیا۔

"میں بشیر سے مل کر آ رہا ہوں"

میں نے دروازہ کھول دیا۔ پروفیسر نے آتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا کہ دروا
بند کر کے چٹخنی لگائی اور مجھ سے کہا۔

"جلدی سے اوپر آ جاؤ"

ہم اوپر والے کمرے میں آ کر بیٹھ گئے۔ وہاں اندھیرا تھا۔ میں نے احتیاطاً موم بتی
نہیں جلائی تھی۔ میں نے پروفیسر سے آتے ہی پوچھا۔

"گل خان کہاں ہے؟"

اس نے کہا۔

"اسے پولیس پکڑ کر لے گئی ہے۔ جب تم راشٹریہ سیوک سنگ کے ٹرینگ سنٹر
امرتسر کی طرف ٹرک میں روانہ ہوئے تھے تو لکشمی دیال اور کالی داس نے اسی وقت

کے پولیس بلوا لی تھی۔ چونکہ اسے تمہاری کہانی پر یقین نہیں آیا تھا کہ سارے ہندو
ب کار بارڈر پر رینجرز کے مقابلے میں مارے گئے اور صرف تم زندہ بچ گئے۔ اس لئے
نے تمہیں امرتسر جیل بھجوانے کے لئے یہ سارا ڈرامہ کھیلا تھا۔ اس نے تمہارے
تھ آدمی بھیجے تھے وہ بھی سفید کپڑوں میں پولیس کے آدمی تھے۔ یہ ساری باتیں ہمیں
یں معلوم ہوئیں۔ لکشمی دیال نے پولیس کو سب کچھ بتا دیا کہ تمہیں کس کے ذریعے
ں بھرتی کیا گیا تھا۔ پولیس نے کانگریسی مسلمان سے پوچھ گچھ کی تو اس نے کہا کہ گل
ن مرلی پرشاد کو لے کر میرے پاس آیا تھا۔ چنانچہ تمہارے امرتسر روانہ ہونے کے ایک
ٹے بعد ہی پولیس نے گل خان کے مکان پر چھاپہ مارا اور اسے گرفتار کر کے لے گئی۔"

میں نے کہا۔

"پولیس نے اسے کہاں رکھا ہوا ہے؟"

ہمیں ایک دوسرے کے اندھیرے میں دھندلے دھندلے خاکے نظر آ رہے تھے۔
فیسر اس وقت بھی رومال سے عینک کے شیشے صاف کر رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"یہ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ تم یہ بتاؤ کہ تم کیسے فرار ہوئے۔ یہاں سب
باروں میں تمہاری تصویر چھپ چکی ہے۔ تم اس وقت بہت بڑے خطرے کی زد میں
۔ میں تمہیں یہی مشورہ دوں گا کہ تم جس طرح بھی ہو کشمیر کی طرف نکل جاؤ۔ اس
ت کشمیری مجاہد کمانڈو شیروان اور کشمیری حریت پرستوں کو تمہاری ضرورت بھی ہے۔
ں انڈین فوج نے کشمیریوں پر ظلم و ستم کی انتہا کر دی ہے۔"

میں نے کہا۔

"لیکن میں سب سے پہلے اپنے کمانڈو ساتھی گل خان کو بھارتی پولیس کے چنگل سے
ڑانا چاہتا ہوں۔ مجھے بتاؤ کہ پولیس نے اسے کہاں رکھا ہوا ہے۔"

"میں نے اپنے ذرائع سے سارا پتہ کرایا ہے گل خان کو پولیس جموں لے گئی تھی۔
ں اسے نہر انٹروگیشن سنٹر میں رکھا گیا ہے۔ تمہارا راز کھل جانے کے بعد کہ تم
سلمان ہو پاکستانی کمانڈو ہو اور تمہاری سرگرمیوں کا مرکز کشمیر بھی ہے اس لئے پولیس

گل خان کو جموں لے گئی کہ وہاں اس پر ٹارچر کر کے اس سے مقبوضہ کشمیر اور جموں میں دوسرے پاکستانی جاسوسوں کی نشان دہی کرائی جائے۔ اگرچہ گل خان کبھی زبان نہیں کھولے گا۔ وہ ہر قسم کی اذیت برداشت کر سکتا ہے۔ وہ موت کو گلے لگا لے گا۔ لیکن زبان نہیں کھولے گا۔ اگر ایسی بات ہوتی تو میں اس کی گرفتاری کے فوراً بعد روپوش ہو گیا ہوتا۔"

نہرانٹروگیشن سنٹر میرے لئے ایک نیا نام تھا۔ میں نے پروفیسر سے پوچھا کہ یہ انٹروگیشن سنٹر کہاں پر ہے اور اس کا محل وقوع کیا ہے۔ وہ کہنے لگا۔

"یہ ٹارچر سیل بھارت کی تمام خفیہ ایجنسیوں کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ یہاں آرمی' بی ایس ایف' سی آر پی' سی آئی کے اور "را" کے اہلکار موجود ہوتے ہیں۔ اس ٹارچر سیل کے بارے میں بڑی خوفناک باتیں مشہور ہیں کہا جاتا ہے کہ یہاں جس حریت پرست کو لے جایا جاتا ہے پھر اس کی لاش بھی نہیں ملتی۔ جموں میں ایک نہر ہے جو دریا کے پہلو میں سے ہو کر شہر کے جنوب کی طرف جاتی ہے۔ مجھے اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ یہ ٹارچر سیل اسی نہر کے کنارے پر کہیں واقع ہے۔ اس کا نام بھی نہرانٹیروگیشن سنٹر اس لئے رکھا گیا ہے کہ یہ جموں کی نہر کے کنارے پر ہے۔ اگر تم کشمیر پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تو کمانڈو شیروان سے تمہیں اس انٹیروگیشن سنٹر کا پتہ معلوم ہو جائے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ تمہیں آج رات کو ہی یہاں سے نکل جانا چاہئے۔ کیونکہ تمہارے فرار کی خبر یہاں کے اخباروں میں تمہاری تصویر کے ساتھ چھپ چکی ہے۔ لوگوں نے بھی تمہاری شکل دیکھ لی ہے۔ تم کسی بھی وقت پکڑے جا سکتے ہو۔ کیا تمہارے پاس پیسے ہیں؟ نہیں تو میں تمہیں لا دیتا ہوں۔"

میں نے کہا۔

"پیسے میرے پاس بہت ہیں۔ ٹھیک ہے۔ میں آج رات کو ہی یہاں سے کشمیر کی طرف نکل جاتا ہوں۔"

پھر میں چارپائی کے سرہانے کے نیچے ہاتھ ڈال کر ٹٹولنے لگا۔ پروفیسر نے پوچھا۔

"کیا ڈھونڈھ رہے ہو؟"

میں نے کہا۔

"گل خان نے دھماکہ خیز محلول کی شیشی جو مجھے دی تھی اس میں سے آدھا محلول میں نے اٹاری کے بارڈر پر ہندو تخریب کاروں کو اڑانے میں استعمال کر لیا تھا۔ باقی میں نے سی جگہ سنبھال کر رکھا تھا۔"

پروفیسر اٹھتے ہوئے کہنے لگا۔

"میں نے وہ شیشی یہاں سے اٹھا کر پرانے مٹکے میں ڈال دی تھی۔"

وہ کونے میں گیا۔ وہاں ایک پرانا مٹکا پڑا تھا۔ اس میں ہاتھ ڈال کر پروفیسر نے دھماکہ یز محلول کی شیشی نکالی اور مجھے دے دی۔ میں نے اسے جیب میں رکھ لیا۔

"یہ میرے کام آئے گی۔"

"تمہارے پاس کوئی پستول وغیرہ تو نہیں ہے؟"

میں نے کہا۔

"بالکل نہیں۔ میں تو بڑی مشکل سے امرتسر جیل سے بھاگا ہوں۔ دو کپڑوں میں تھا۔ پڑے بھی فقیروں کے کپڑوں جیسے ہو رہے تھے۔ یہ تو جالندھر شہر میں ایک سخی دل سکھ ارت نے مجھے نئے کپڑے بھی خرید کر دیئے اور سات سو روپے بھی دیئے تھے۔"

پروفیسر کہنے لگا۔

"کیا وہ تمہیں جانتی تھی؟"

میں نے مختصراً کہا۔

"ایک زمانے میں میں ہندو سٹوڈنٹ بن کر اسے ملا تھا۔ تب سے وہ میری دوست بن ئی تھی۔ بہرحال یہ ایک لمبی داستان ہے تم مجھے یہ بتاؤ کہ مجھے کشمیر جانے کے لئے کون ا روٹ استعمال کرنا چاہئے۔ کیونکہ ان حالات میں میرا ریلوے سٹیشن پر جانا اپنے آپ کو پلیس کے حوالے کرنے کے برابر ہو گا۔"

پروفیسر جمشید نے میرے سوال کے جواب میں کہا۔

"روٹ اتنا اہم نہیں ہے۔ کیونکہ تم اس حلیے میں جس روٹ سے بھی جاؤ گے کسی

نہ کسی جگہ پکڑے جاؤ گے۔ تمہیں اپنا حلیہ تبدیل کرنا ہو گا۔ پھر تم چاہے جس طرف بھی جاؤ۔ کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

پروفیسر نے مجھے بڑا صحیح مشورہ دیا تھا۔ میں نے پوچھا۔

"تو پھر میں کیا حلیہ بنا کر جاؤں؟ میں اپنی شکل تو نہیں بدل سکتا"

"تمہیں شکل بدلنے کو کون کہہ رہا ہے؟"

ہم دونوں ایک لمحے کے لئے خاموش ہو گئے۔ میں بھی سوچنے لگا کہ مجھے کس قسم حلیہ بنانا چاہئے کہ ایک نظر میں مجھے کوئی پہچان نہ لے۔ ہندوستان میں ایک حلیہ بڑا عا ہے اور اس حلیے والے شخص کی طرف کوئی آدمی توجہ نہیں دیتا۔ اور یہ حلیہ سا سنیاسیوں کا ہے۔ میں نے کہا۔

"میرا خیال ہے میں سادھو سنیاسیوں والا حلیہ بنا لیتا ہوں"

"یہی ٹھیک رہے گا۔ تم سادھو جوگیوں والی باتیں بھی کر لیتے ہو اور تمہیں ہندی کے دوہے اور سنسکرت کے اشلوک بھی یاد ہیں۔ آج رات تمہیں انتظار کرنا ہو گا میں تمہارے واسطے سادھوؤں والا لباس لاؤں گا۔ مگر تم اس مکان سے ہرگز ہرگز باہر نہ نکلنا۔ کھڑکی بھی مت کھولنا۔"

آخر یہی طے پایا کہ میں جوگی بن کر دلی سے جموں کشمیر کی طرف جاؤں گا۔ پروفیسر اگلے روز شام کو آنے کا کہہ کر چلا گیا۔ دوسرا دن میں نے مکان کے اندر ہی بیٹھ گزارا۔ آٹا دال چاول وہاں موجود تھا۔ خود ہی چاول پکائے۔ دال پکائی اور کھائی۔ چا بھی بنا کر پیتا رہا۔ دھماکہ خیز محلول کی شیشی میں نے سنبھال کر رکھ لی تھی۔

شام کا اندھیرا پوری طرح چھا گیا ہوا تھا کہ پروفیسر جمشید آگیا۔ وہ میرے لئے کھد گیروے رنگ کا لمبا کرتہ اسی رنگ کی دھوتی اور کالے منکوں کی تین چار مالائیں اور ا لمبے بالوں والی وگ ساتھ لایا تھا۔ پلاسٹک کی ایک تھیلی میں راکھ اور سیندور بھی لایا میں نے پتلون قمیض اتار کر سادھوؤں والا لباس پہن لیا۔ منہ پر گردن تک راکھ مل سر پر لمبے بالوں کی وگ لگالی اور ماتھے پر سادھوؤں کی طرح سیندور کی تین چار لکیریں

لیں۔ چھ سوا چھ سو روپے کے انڈین کرنسی والے نوٹ میں نے کپڑے میں لپیٹ کر کمر کے ساتھ باندھ لئے۔ پاؤں میں کچھ نہ پہنا۔ تین مالائیں گردن میں ڈال لیں۔ ایک موٹے منکوں والی مالا ہاتھ میں پکڑ لی۔ پروفیسر جمشید نے کونے میں فرش پر موم بتی جلا دی تھی۔ اس نے مجھے چھوٹا سا آئینہ دے کر کہا۔

"اب اپنی شکل دیکھو۔ تم پہلے سے بہت بدل گئے ہو۔"

میں نے آئینے میں دیکھا۔ واقعی میں پہچانا نہیں جا رہا تھا۔

پروفیسر کہنے لگا۔

"اب تم ٹرین میں سفر کرنا۔ ٹرین میں ایک تو راستے میں زیادہ چیکنگ کا خطرہ نہیں ہوتا۔ دوسرے ٹرین میں ایک بار بیٹھ گئے تو سیدھا جموں پہنچ کر ہی اترو گے لاری بس میں گئے تو راستے میں چیکنگ کا بھی خطرہ ہے اور تمہیں کئی بسیں بدلنی بھی پڑیں گی۔ رات ہو گئی ہے۔ اب نکل جاؤ یاد رکھنا۔ جموں پہنچ کر وہاں سے سیدھا سری نگر کی طرف نکل جانا اور کمانڈو شیروان سے جا کر ملاقات کرنا۔ وہ تمہیں نہر انٹیروگیشن سنٹر کی طرف گائیڈ کرے گا جہاں گل خان کو کسی ٹارچر سیل میں رکھا گیا ہے۔"

میں نے کھڑکی میں سے ایک نگاہ باہر ڈالی۔ باہر اندھیرا کافی گہرا ہو گیا تھا۔ پروفیسر جمشید نے مجھ سے گرمجوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

"اللہ تمہارا نگہبان ہو۔ تم پہلے جاؤ گے۔ میں تمہارے کچھ دیر بعد یہاں سے نکلوں گا۔"

میں نے پروفیسر کو خدا حافظ کہا اور سیڑھیاں اتر گیا۔ مکان کے دروازے کی چٹخنی کھولی اور باہر نکل آیا۔ باہر آتے ہی میں نے بستی نظام الدین" اولیا والے چوک کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ ایک عرصے کے بعد زمین پر ننگے پاؤں چل رہا تھا۔ سڑک کے روڑے چبھنے لگے۔ مگر میں چلتا گیا۔ کیونکہ سادھو لوگ جوتے وغیرہ نہیں پہنتے۔ چوک والی سڑک پر کافی روشنی تھی۔ میں نے اپنا رخ ریلوے سٹیشن کی طرف کر لیا۔ پروفیسر جمشید نے مجھے بتا دیا تھا کہ جموں والی گاڑی شروع رات میں ہی دلی سٹیشن سے چھوٹتی ہے۔ ایک گاڑی صبح

صبح جاتی تھی۔ چوک سے ذرا آگے موڑ پر کچھ خالی رکشے کھڑے تھے۔ یہ موٹر رکشے تھے میں ایک خالی رکشے میں بیٹھ گیا اور ڈرائیور سے کہا۔

"بچہ سادھو سنتوں کو ریلوے سٹیشن پہنچا دے۔"

سادھو سنتوں کا انڈیا میں ہر جگہ بے حد احترام کیا جاتا ہے۔ اس احترام میں خوف کا عنصر زیادہ ہوتا ہے۔ کہ کہیں سادھو مہاراج کوئی بد دعا نہ دے دیں۔ انڈیا کے ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ سادھو کی بد دعا کبھی خالی نہیں جاتی۔ کوئی سادھو اگر شراپ یعنی بددعا دے دے تو وہ پوری ہو کر رہتی ہے۔ رکشا ڈرائیور نے فوراً کہا۔

"جو آگیا مہاراج"

اور رکشا دلی ریلوے سٹیشن کی طرف ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ میں نے سٹیشن پر پہنچ کر رکشا ڈرائیور سے یونہی پوچھا۔

"کیا کرایہ بنتا ہے بچہ؟"

مجھے معلوم تھا کہ وہ پیسے نہیں لے گا۔ ایسا ہی ہوا۔ میں سٹیشن کی لابی کی طرف سادھوؤں والی مست چال کے ساتھ چل دیا۔ میرے بائیں ہاتھ میں موٹے منکوں کی مالا تھی جسے میں آہستہ آہستہ پھیر رہا تھا۔ میں نے ضرورت سے زیادہ چالاکی دکھانے کی کوشش نہ کی۔ کیونکہ اس طرح میں لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جاتا اور پولیس کی نظروں میں آسکتا تھا۔ بس عام سادھو کی طرح میں قدم قدم چلتا لابی میں آگیا۔ لابی میں مسافروں کی کافی رونق تھی۔ یہ مجھے معلوم تھا کہ انڈیا کی ریلوے ٹرینوں میں جوگی سنیاسیوں اور نابیناؤں کو ٹکٹ لینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ جہاں چاہیں ریل میں بغیر ٹکٹ سفر کر سکتے ہیں۔ گیٹ پر ٹکٹ بابو موجود تھا۔ میں چہرے پر سادھوؤں والی مسکراہٹ طاری کئے "جے ماتا شیراں والی کی" کا ہلکی آواز میں نعرہ لگاتا اس کے قریب سے گزر گیا۔ پلیٹ فارم پر زیادہ مسافر نہیں تھے۔ سامنے والے پلیٹ فارم پر کافی رش تھا مگر کوئی ٹرین کھڑی نہیں تھی۔ میں نے سامنے سے آتے ہوئے ایک قلی کو روک کر پوچھا۔

"بچہ! ماتا شیراں والی کے جموں شہر کو کون سی ریل گاڑی جاتی ہے؟"

قلی نے سامنے والے پلیٹ فارم کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"مہاراج اس پلیٹ فارم سے گاڑی چلے گی۔ یہی کوئی ایک آدھ گھنٹے بعد۔"

"تیرا کلیان ہو بچہ!"

دوسرے پلیٹ فارم پر آکر میں نے بھرپور مگر خفیہ نگاہوں سے جائزہ لیا۔ وہاں ریلوے پولیس کے چار پانچ سپاہی ادھر ادھر کھڑے تھے۔ جموں توی جانے والی گاڑی پر سیکورٹی اور چیکنگ زیادہ ہوتی تھی۔ میں لوگوں کی نظروں میں آنے کے خیال سے ایک طرف ہو کر پلیٹ فارم کے فرش پر ہی بیٹھنے لگا تو ایک آدمی نے بنچ پر اپنی سیٹ خالی کرتے ہوئے کہا۔

"مہاراج! یہاں بیٹھئے۔ زمین پر کیوں بیٹھنے لگے؟"

میں نے کہا۔

"بچہ! آخر کو اس تن نے مٹی میں ہی سمانا ہے۔ راکھ بن کر اڑ جانا ہے۔"

ساتھ ہی میں بنچ پر بھی بیٹھ گیا۔ میں نے اب ایسی اداکاری شروع کر دی کہ سچ مچ کا سادھو لگوں۔ میں نے اس آدمی سے کہا۔

"جا بچہ سادھو سنت کو سگریٹ تمباکو لا کر پلا"

"مہاراج کون سا سگریٹ لاؤں؟"

"جیسا دل کرے لے آ بچہ۔ سادھوؤں کو سواد سے کیا کام۔ بس ذرا منہ کڑوا کرنا ہے"

مجھے معلوم تھا وہ اعلیٰ کوالٹی کا سگریٹ لائے گا۔ چنانچہ وہ اعلیٰ سگریٹ ہی لایا۔ مگر انڈیا کا اعلیٰ کوالٹی کا سگریٹ پاکستان کے سگرٹوں کا مقابلہ نہیں کرتا۔ انڈیا کے سگریٹ پھیکے اور بد مزا ہوتے ہیں۔ انڈیا کے لوگ پاکستان کے سگریٹ بڑے شوق سے زیادہ دام خرچ کر کے خرید لیتے ہیں۔ پاکستان سے یہ سگریٹ آنے جانے والے لوگ اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ پھر بھی سگریٹ سگریٹ ہی تھا۔ اس نے خود ماچس سے میرا سگریٹ سلگایا۔ میں لمبا کش لگا کر کہا۔

"بچہ تو نے سادھو سنتوں کی سیوا کی ہے بھگوان تیرا کلیان کرے گا۔ اب یہ بتا کہ ماتا شیراں والی کے شہر جموں جانے والی گاڑی کب آئے گی"

وہ ہاتھ باندھ کر بولا۔

"مہاراج گاڑی آدھ گھنٹے بعد آئے گی۔ گورو جی میں بھی ماتا شیراں والی کے درشن کو جا رہا ہوں۔"

میں نے اس آدمی کی طرف مسکرا کر دیکھا اور کہا۔

"تو دھن ہے۔ تیرے بھاگ دھن ہیں ماتا شیراں والی سب کا کلیان کرتی ہے۔ اب تو آرام سے بیٹھ جا اور مجھ سے زیادہ بات نہ کر۔ میں ماتا شیراں والی کے دھیان میں جاتا ہوں"

اور میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ مگر اس طرح بند کی تھیں کہ پلیٹ فارم کا سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ مسافروں کا کافی رش تھا۔ کچھ اور سادھو اور جوگی بھی وہاں پھر رہے تھے ان کے ہاتھوں میں تانبے کے ڈول اور کرمنڈل بھی تھے۔ میرے پاس اس قسم کی کوئی چیز نہیں تھی۔ بس یہی ایک کمی رہ گئی تھی۔

اتنے میں گاڑی کے انجن کی سیٹی سنائی دی۔ جس آدمی نے میرے لئے سیٹ خالی تھی اور مجھے سگریٹ بھی لا کر دیئے تھے۔ بولا۔

"مہاراج گاڑی آ گئی ہے۔"

میں نے بڑے سکون کے ساتھ آنکھیں پوری کھول کر کہا۔

"جے ہو شیراں والی ماتا کی جے ہو"

میں نے سوچا یہ آدمی آگے جا کر بھی میرے کام آ سکتا ہے اس کو اپنے ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہیے میں نے کہا۔

"بچہ کسی ڈبے میں اپنے لئے اور ہمارے لئے کوئی اچھی سی جگہ بنا کر آ۔ ہم یہیں بیٹھے ہیں۔"

رش اگر زیادہ تھا تو گاڑی کے ڈبے بھی بہت تھے۔ مسافر ڈبوں میں گھسنے لگے

پلیٹ فارم خالی ہو تا گیا۔ وہ آدمی دوڑتا ہوا میرے پاس آیا۔

"مہاراج چلئے۔ میں نے آپ کی سیٹ پر کپڑا بچھا دیا ہے۔"

"چلو بچہ!"

میں اس کے ساتھ چل پڑا۔ ٹرین کی سب سے آخری بوگی کے درمیانی ڈبے میں اس نے کھڑکی کے پاس میری جگہ بنائی تھی۔ وہاں اس نے کپڑا بچھا دیا ہوا تھا۔ میں وہاں بیٹھ گیا۔ ڈبے میں دوسرے مسافر بھی بیٹھے تھے جو شکل صورت سے ڈوگرے پہاڑیئے لگ رہے تھے۔ ان میں سکھ بھی جو شاید جالندھر وغیرہ جا رہے تھے۔ وہ آدمی میرے پاس ہی بیٹھ گیا۔ ڈبے کے دوسرے مسافروں نے مجھے کوئی زیادہ اہمیت نہ دی۔ بھارت میں سادھو عام پھرتے مل جاتے ہیں۔ سادھو لوگ وہاں کوئی عجوبہ نہیں ہوتے۔

میں نے اس آدمی کے کاندھے پر بڑی محبت سے ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

"بچہ تیرا نام کیا ہے؟"

اس نے کہا۔

"مہاراج میرا نام مکند لال ہے۔ میں جموں میں اپنے بھائی گردھاری لال سے ملنے جا رہا ہوں۔ وہ میرا بڑا بھائی ہے۔ جموں سری نگر جانے والی بس کا ڈرائیور ہے۔"

مکند لال کی عمر بیس پچیس سال کے قریب ہو گی مگر وہ کمزور سا تھا اور عمر سے زیادہ کم عمر لگتا تھا۔ میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے بچہ۔ ہم تم سے خوش ہیں"

"آپ کی کرپا ہے مہاراج"

وہ بڑا خوش ہوا۔ میں نے کھڑکی میں سے باہر پلیٹ فارم پر دیکھا۔ میرا منہ ریل کے انجن کی طرف تھا۔ پلیٹ فارم پر کہیں کہیں کوئی مسافر نظر آتا تھا۔ پولیس کے سپاہی ٹرین کے آگے گشت لگانے لگے تھے۔ رائفلیں انہوں نے ہاتھوں میں پکڑ رکھی تھیں۔ ایک سپاہی آہستہ آہستہ گشت لگاتا میرے قریب سے بھی گزرا۔ وہ سامنے سے آ رہا تھا۔ اس نے میرے قریب سے گزرتے ہوئے مجھے بڑے غور سے دیکھا۔ میں نے اسے بظاہر نظر

انداز کر دیا۔ لیکن دل میں خیال کیا کہ کہیں اس نے مجھے پہچان تو نہیں لیا۔ وہ پیچھے چلا گیا تھا۔ انجن نے وسل دیا۔ گارڈ نے سیٹی بجائی۔ انجن نے دوبارہ وسل دیا اور ٹرین پلیٹ فارم پر کھسکنے لگی۔ میں نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔ میں اس سپاہی کی جانب سے مطمئن ہونا چاہتا تھا جو مجھے گھور کر دیکھتا ہوا گزر گیا تھا۔ وہ ٹرین سے ہٹ کر ایک طرف کھڑا دوسرے سپاہی سے باتیں کر رہا تھا۔ یونہی مجھے اس کے بارے میں تشویش لگ گئی تھی کہ کہیں اس نے مجھے پہچان تو نہیں لیا۔ وہ پلیٹ فارم پر ہی رہ گیا تھا۔ مجھے اس قسم کے خطرات میں سے بہرحال گزر کر ہی جموں توی پہنچنا تھا۔

ٹرین رات کے وقت سفر کرتی رہی۔ سٹیشن پر سٹیشن آکر گزرتے گئے۔ کہیں ٹرین رک جاتی۔ کہیں کسی سٹیشن کو چھوڑ دیتی۔ مکند لال برابر میری خدمت میں لگا ہوا تھا۔ جب رات کافی ہوگئی تو سیٹ پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ بولا۔

"مہاراج آپ سو جائیں۔ میں ادھر دروازے کے پاس جا کر بیٹھ جاتا ہوں"

سونا تو بہت دور کی بات تھی میں ایک لمحے کے لئے جاگتے میں بھی غافل نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے کہا۔

"بچہ! ہم سادھو لوگ جاگ کر بھی سو جاتے ہیں۔ ہمیں دنیا والوں کی نیند سے کوئی کام نہیں۔ تم بے شک یہاں بیٹھے رہو۔"

مجھے نیند پر بھی کنٹرول حاصل تھا۔ یہاں تو ویسے بھی میں سو نہیں سکتا تھا اور اس خیال کے مارے بھی نیند کوسوں دور تھی کہ کسی جگہ میں پہچان نہ لیا جاؤں۔ رات گزر گئی۔ ٹرین کا سفر جاری رہا۔ دوپہر کے بعد گاڑی جموں پہنچی تو مکند لال کہنے لگا۔

"مہاراج! مجھے بھی ماتا شیراں والی کے درشنوں کو جانا ہے۔ میں آپ کے ساتھ ہی چلوں گا۔ اس وقت آپ ہمارے گھر چلئے۔ آپ کی سیوا کرنا چاہتا ہوں"

میں نے سوچا کہ اس کا بھائی جموں سری نگر کی بس چلاتا ہے وہاں سے سری نگر جا- کا محفوظ بندوبست ہو سکتا ہے۔ میں نے کہا۔

"اچھا بچہ۔ چلو۔ ہم تمہارے ساتھ چلتے ہیں۔"

وہ مجھے اپنے ساتھ اپنے بھائی کے گھر لے گیا۔ اس کے بھائی کا گھر جموں شہر کے پرانے محلے میں تھا۔ بھائی گھر پر ہی تھا۔ مکند لال نے اپنے بھائی سے کہا۔

"بھیا جی! سادھو مہاراج نے بڑی کرپا کی ہے جو میرے ساتھ تمہارے گھر آگئے ہیں"

گردھاری لال نے ہاتھ جوڑ کر مجھے پرنام کیا۔ اس کی بیوی اور بچوں نے بھی میرے پاؤں چھوئے۔ میری ٹہل سیوا شروع ہو گئی۔ میں نے مکند لال کے بڑے بھائی سے پوچھا۔

"گردھاری لال! ہم ماتا شیراں والی کے درشنوں کے بعد سری نگر جائیں گے۔ یہ بتاؤ وہاں لاری کس کس ٹائم کو جاتی ہے۔"

وہ بولا۔

"مہاراج! میں صبح صبح خود لاری لے کر سری نگر جاتا ہوں۔ شام کے بعد کوئی لاری نہیں جاتی۔"

مجھے ماتا شیراں والی کے درشنوں کو تو جانا ہی نہیں تھا۔ میں نے کچھ سوچ کر کہا۔

"ٹھیک ہے۔ ہم کل صبح تمہارے ساتھ ہی سری نگر جائیں گے۔ پہلے وہاں اپنے گورودیو کے درشن کریں گے۔ ان کے چرن چھوئیں گے۔ پھر ان کی آگیا لے کر ماتا جی کے درشنوں کو جائیں گے۔"

مکند لال میری طرف منہ کھولے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسے کہا۔

"مکند لال! ہم سری نگر سے واپسی پر تمہیں بھی ساتھ ماتا شیراں والی کے درشنوں کو لے چلیں گے۔"

وہ اتنے میں ہی خوش ہو گیا۔ رات میں نے ان لوگوں کے ہاں بسر کی۔ وہ مجھے بہت کھلاتے پلاتے رہے۔ بڑے آرام دہ بستر پر دو کمبل ڈال دیئے گئے۔ جموں میں رات کو سردی ہو جاتی تھی۔ دوسرے دن میں مکند لال اور گردھاری لال لاری اڈے کی طرف چل پڑے۔ جس محلے میں ان لوگوں کا گھر تھا وہ جموں کا ہندو علاقہ تھا۔ مندروں میں آرتی اتارنے کی گھنٹیوں اور کیرتن کی آوازیں آرہی تھیں۔ ایک سادھو کو گلی میں سے

گزرتے دیکھ کر کسی نے کوئی خاص توجہ نہ کی۔ میں یہی چاہتا تھا۔ گردھاری لال نے مجھے اپنی لاری کی اگلی سیٹ پر بٹھا دیا۔ مکند لال میرے لئے انگور لے آیا۔ انگور جموں سری نگر میں بڑا مہنگا پھل تھا۔

لاری سری نگر کی طرف چل پڑی۔ سفر خیریت سے گزر گیا۔ راستے میں بانہال کے مقام پر رات بھی بسر کرنی پڑی۔ بانہال کی رات بھی خیریت سے گزر گئی۔ سادھوؤں کے بہروپ نے مجھے کافی فائدہ پہنچایا تھا۔ دوسرے دن کی سہ پہر کو ہم سری نگر میں تھے۔ میں گردھاری لال سے جدا ہو گیا۔ اب مجھے کشمیری حریت پرست مجاہد اور کمانڈو شیروان کی خفیہ کمین گاہ میں پہنچنا تھا۔ یہ کشمیر کی پہاڑیوں میں جس مقام پر تھی وہ میں آپ کو نہیں بتاؤں گا۔ یہی سمجھ لیں کہ میں ان پہاڑیوں میں پہنچ گیا۔ اس وقت سورج گلمرگ کی پہاڑیوں پر جھکنے لگا تھا۔ میں دو ٹیلوں کے درمیان سے گزر کر ایک ٹیلے کی چڑھائی چڑھ کر دوسری طرف چشمے کے قریب سے ہوتا ہوا چیڑھ کے درختوں کے جھنڈ میں آ گیا۔ وہ چٹانی ٹیلا میرے سامنے تھا جس کی سرنگ یا غار میں کمانڈو شیروان کا خفیہ ہائیڈ آؤٹ تھا۔ میں ابھی تک سادھوؤں کے بھیس میں ہی تھا۔ اچانک ایک طرف سے دو حریت پرست سٹین گنیں لئے نکل آئے۔ سٹین گنوں کا رخ میری طرف تھا۔

"کون ہو؟ کدھر جا رہے ہو؟"

دونوں حریت پرست مجاہدوں نے سیاہ کپڑے سے منہ ڈھانپ رکھے تھے۔ یہ کوئی نئے مجاہد تھے۔ ورنہ کمانڈو شیروان کے گروہ کے سارے مجاہد مجھے جانتے تھے۔ میں نے کہا۔

"مجھے کمانڈو مجاہد شیروان سے ملنا ہے۔ میرا نام۔"

درختوں میں سے تین مزید حریت پرست مجاہد نکل آئے۔ انہوں نے مجھے پکڑ کر وہیں بٹھا دیا اور کشمیری میں آپس میں باتیں کرنے لگے۔ میں نے کہا۔

"دوستو! میں شیروان کا دوست ہوں۔ میں پہلے بھی یہاں آ چکا ہوں۔ اگر کما

شیروان ہائیڈ آؤٹ میں موجود ہے تو اسے جا کر میرا نام بتاؤ۔"

ایک مجاہد چٹانی ٹیلے کی طرف چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اس طرح واپس آیا کہ سٹین گن اس نے سینے سے لگا رکھی تھی اور فوجیوں کی طرح چل رہا تھا۔ پیچھے کمانڈو شیروان اپنی کمانڈو وردی میں ملبوس مسکراتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ اس نے دور ہی سے مجھے دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ جن مجاہدوں نے مجھے اپنی حراست میں لے رکھا تھا۔ وہ پیچھے ہٹ گئے۔ کمانڈو شیروان نے مجھے گلے لگا لیا۔

"مجھے تمہارے آنے کی اطلاع مل گئی تھی۔ بہت دنوں کے بعد ملاقات ہوئی ہے۔ چلو اندر بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔"

حریت پرست لیڈر کمانڈو شیروان کی کمین گاہ جو چٹان کے غار میں تھی بالکل ویسی ہی تھی جیسی میں چھوڑ گیا تھا۔ زمین پر صف بچھی تھی۔ دیوار کے ساتھ تکیہ لگا تھا۔ ایک ساوار اور کچھ پیالیاں پڑی تھیں۔ ہم صف پر بیٹھ گئے۔ کمانڈو شیروان نے ایک مجاہد سے کشمیری چائے لانے کو کہا۔ وہ یس سر کہہ کر باہر نکل گیا۔ شیروان کہنے لگا۔

"تم نے اچھا کیا کہ اس حلیے میں سفر کیا۔ تمہاری تصویر یہاں کے اخباروں میں بھی چھپ گئی ہے۔ پروفیسر جمشید نے مجھے وائرلیس پر تمہارے کشمیر کی طرف آنے اور گل خان کے پکڑے جانے کی خبر دی تھی۔ تم نے دوارکا فورٹ اور بھوپال کے قریب کشمیری مجاہدین کے خلاف استعمال ہونے والے اسلحہ اور گولہ بارود کے ذخیرے کو اڑا کر بہت بڑا کام کیا ہے۔ یہ چیزیں ہماری تحریک آزادی کو تقویت پہنچاتی ہیں۔ مجھے راجستھان والے ایٹمی ریسرچ سنٹر کی تباہی کی خبر بھی مل گئی تھی یہ کام تمہارے ایسا اعلیٰ تربیت یافتہ کمانڈو ہی کر سکتا تھا۔"

ہم کشمیر میں بھارتی فوجی یونٹوں کے وحشیانہ مظالم کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ کمانڈو شیروان کہنے لگا۔

"آزادی ایک دن میں حاصل نہیں ہو جاتی۔ اس کے لئے قوموں کو بڑی قربانیاں

دینی پڑتی ہیں اور ہماری کشمیری قوم بیدار ہو چکی ہے۔ ہماری قوم کا بچہ بچہ جہاد میں شریک ہو گیا ہوا ہے۔ جب قوموں میں یہ جذبہ پیدا ہو جاتا ہے تو اس کی منزل آزادی قریب آجاتی ہے۔"

کشمیری مجاہد چائے لے آیا۔ ساتھ باقرخانیاں بھی تھیں۔

میں نے کمانڈو شیروان سے کہا۔

"میرا سب سے پہلا مشن اپنے ماسٹر سپائی گل خان کو جموں کے نہر انٹیروگیشن سنٹر ے نکالنا ہے۔ اس انٹیروگیشن کے بارے میں مجھے معلومات چاہئیں۔ کیا تم اس سلسلے میں یری مدد کر سکتے ہو؟"

کمانڈو شیروان کہنے لگا۔

"یہ اطلاع مجھ کو بھی مل گئی ہے کہ گل خان کو بھارتی انٹیلی جینس جموں کے نہر ٹیروگیشن سنٹر میں لے آئی ہے۔ مجھے خود اس کے بارے میں تشویش تھی مگر ہم لوگ پنے محاذ پر دشمن کے خلاف جنگ لڑنے میں مصروف ہیں یہ بہت اچھا ہوا کہ تم آگئے ہو۔ اس انٹیروگیشن سنٹر کے بارے میں مجھے زیادہ تفصیل معلوم نہیں ہے۔ ہمارے مجاہدین جو پکڑے جاتے ہیں انہیں سری نگر کے انٹیروگیشن سنٹر میں ہی رکھا جاتا ہے۔ یا پھر انہیں کشمیر سے باہر بھارت کے کسی دوسرے شہر میں لے جاتے ہیں۔ مگر میں تمہیں معلومات ہیا کر سکتا ہوں۔ مجھے اتنا معلوم ہے کہ یہ انڈیا کا سب سے بڑا انٹیروگیشن سنٹر ہے اور ہاں "را" اور دوسری خفیہ ایجنسیوں کے علاوہ ملٹری انٹیلی جینس کے تجربہ کار افسر بھی وجود ہوتے ہیں اور یہاں کے ٹارچر سیل میں اذیت دینے اور تشدد کے جدید آلات رکھے گئے ہیں۔ تم یہاں آرام کرو اور میرا خیال ہے اپنا حلیہ تبدیل کر لو۔ میں ایک آدمی کی یوٹی لگاتا ہوں۔ وہ ساری معلومات حاصل کر کے لے آئے گا۔"

میں نے کہا۔

"دوست! آرام تو میں نے اسی وقت اپنے اوپر حرام کرلیا تھا جب میں نے جہاد کشمیر میں شرکت کی غرض سے انڈیا کا بارڈر کراس کیا تھا۔ تم اپنے آدمی کو انٹیروگیشن سنٹر کی تفصیلات معلوم کرنے کے لئے ضرور بھیجو لیکن میں اتنی دیر کشمیر کے محاذ پر دشمن سے لڑنا اپنا فرض سمجھتا ہوں"

میں نے اس سے پوچھا کہ آئندہ ان کا کیا پروگرام ہے اور کیا وہ کسی خاص مشن کی تیاری کر رہے ہیں۔ کمانڈو شیروان بولا۔

"کوئی دن خالی نہیں جاتا جب ہم کسی نہ کسی کمانڈو مشن پر نہیں جاتے۔ ہم تو میدان جنگ میں بیٹھے ہیں۔ بھارتی فوجی ساری وادی کشمیر میں ظلم و بربریت کی ہولی کھیل رہے ہیں اور ہم جہاں موقع ملتا ہے ہر روز انہیں جہنم میں پہنچاتے رہتے ہیں۔ آج کل ڈوگرہ رجمنٹ کا ایک بریگیڈیئر سری نگر کے فوجی ہیڈ کوارٹر میں آیا ہوا ہے۔ یہ شخص بنارس کا بامن ہندو ہے اور مسلمانوں کا جانی دشمن ہے۔ کشمیر کی وادی میں مجاہدین کے خلاف آپریشن کی کمان اس نے سنبھال رکھی ہے۔ ہر روز اس کی ہدایات کے مطابق سری نگر کے آس پاس کے دیہات اور سری نگر شہر میں مسلمانوں کے گھروں کی تلاشی لی جاتی ہے۔ خواتین کی بے عزتی کی جاتی ہے۔ جہاں ذرا شک پڑتا ہے اس گھر کے مردوں کو گولیاں مار کر ہلاک کر دیا جاتا ہے اور عورتوں کو پکڑ کر لے جاتے ہیں۔ اس بریگیڈیئر کا نام بریگیڈیئر رام اوتار ہے۔ یہ شخص پچھلے ایک ماہ سے کشمیری مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیل رہا ہے۔ ہم اس کے یونٹ کے کئی فوجیوں کو ہلاک کر چکے ہیں۔ مگر ان کی جگہ تازہ نفری آجاتی ہے۔ اب ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ مدعا ہی ختم کیا جائے اور بریگیڈیئر رام اوتار کو ہلاک کر دیا جائے۔ یہ شخص اتنا ظالم ہے کہ جو مجاہد اس کے شکنجے میں آجاتا ہے اس پر خود تشدد کرتا ہے اور انہیں بجلی کے جھٹکوں سے شہید کر دیتا ہے۔ کئی مجاہدین کے اس بھیڑیئے نے اپنے ہاتھ سے گلے کاٹے ہیں"

میں نے کہا۔

"ایسے درندے کو تو بہت پہلے ہلاک کر دینا چاہیے تھا۔"

شیروان کہنے لگا۔

"تم تو جانتے ہو کہ ہم کئی محاذوں پر آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ ہمارے مقابلے میں ہم سے دس گنا زیادہ تعداد میں باقاعدہ پیشہ ور فوج ہے۔ دوسرے یہ بریگیڈیئر ہر وقت اپنے آگے پیچھے کمانڈو باڈی گارڈ کی پوری پلاٹون رکھتا ہے۔ اس کے باوجود اب ہم نے اس کا کام تمام کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے"

میں نے پوچھا۔

"تم لوگوں نے آپریشن سکیم کس طرح بنائی ہے؟"

کمانڈو شیروان نے چمڑے کے تھیلے میں سے سری نگر شہر کا نقشہ نکال کر صف پر پھیلا دیا۔ دیوار پر سے لالٹین اتار کر قریب رکھ لی۔ ہم دونوں نقشہ کو غور سے دیکھنے لگے۔ کمانڈو شیروان نے ایک جگہ انگلی رکھ کر کہا۔

"یہ ڈوگرہ رجمنٹ کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ اور یہ جہاں سیاہ نشان لگا ہے یہ پارک ہے۔ اس پارک کے اوپر جو ٹیلہ ہے وہاں بریگیڈیئر رام اوتار کا بنگلہ ہے۔ بنگلے کے گیٹ پر بھی چوبیس گھنٹے فوجی پہرہ دیتے ہیں اور بنگلے کے اوپر ٹیلے پر تین مشین گن پوسٹیں ہیں۔ یہاں سے ہمارا اٹیک کامیاب نہیں ہو سکتا۔ بریگیڈیئر روز صبح نو بجے فوجی گاڑی کی بجائے اپنی سیاہ رنگ کی کار میں بنگلے سے نکل کر ہیڈ کوارٹر کو جاتا ہے۔ اس کی گاڑی کے شیشے بلٹ پروف ہیں۔ اس کے آگے اور پیچھے ایک ایک جیپ ہوتی ہے جس میں اسلحہ بردار کمانڈو باڈی گارڈ کھڑے ہوتے ہیں۔ اس شخص نے اپنی حفاظت کا اتنا بندوبست اس لئے کیا ہے کہ اسے معلوم ہے کہ کشمیری حریت پرست اسے ہلاک کر کے اپنے شہید مجاہدوں کے خون کا بدلہ بھی لینا چاہتے ہیں اور اس کی بربریت سے وادی کشمیر کو نجات بھی دلانا چاہتے ہیں۔"

میں نے ایک ٹیڑھی لکیر نقشے پر دیکھی۔ میں نے پوچھا۔

"یہ لکیر کیا ہے؟"

کمانڈو شیروان لکیر پر انگلی چلاتے ہوئے بولا۔

"یہ وہ راستہ ہے جہاں سے گزر کر یہ درندہ بریگیڈیئر اپنے ہیڈ کوارٹر جاتا ہے ہمیں جو کچھ کرنا ہے اس سڑک پر ہی کسی جگہ سے کر سکتے ہیں۔ نہ اسے اس کے بنگلے میں جہنم رسید کر سکتے ہیں اور نہ اس وقت اس پر وار کر سکتے ہیں جب یہ فوجی ہیڈ کوارٹر میں داخل ہو جاتا ہے۔"

میں غور سے نقشے پر لگے ہوئے نشانوں کو دیکھ رہا تھا۔ کمانڈو شیروان نے ایک جگہ انگلی رکھی اور کہا۔

"یہ ایک مشن ہسپتال کی عمارت ہے۔ ہم نے کمانڈو آپریشن کی جو سکیم تیار کی ہے اس کے مطابق ہمارا ایک مجاہد دو روز پہلے جھوٹ موٹ کسی بیماری کا بہانہ بنا کر اس ہسپتال میں داخل ہو جائے گا اور جس وقت بریگیڈیئر رام اوتار کی گاڑی ہسپتال سے گزرنے والی ہو گی تو ہمارا مجاہد وہیل چیئر پر گھٹنوں پر کمبل ڈالے ہسپتال کے باہر بیٹھا ہو گا۔ کمبل کے نیچے بھری ہوئی سٹین گن ہو گی۔ دوسرا مجاہد ہسپتال سے سو دو سو قدم کے فاصلے پر سڑک سے ہٹ کر ایک جگہ مزدور کے بھیس میں بیٹھا درانتی سے گھاس کاٹ رہا ہو گا۔ اس کی سٹین گن پاس ہی جھاڑیوں میں چھپی ہوئی ہو گی۔ اس کے علاوہ اس کے پاس تین ہینڈ گرنیڈ بھی ہوں گے۔ پہلا مجاہد کار ٹائروں اور پٹرول کی ٹینکی کو نشانہ بنائے گا۔ اگر نشانہ چوک جاتا ہے اور گاڑی آگے نکل جاتی ہے تو دوسرا مجاہد جو گھاس کاٹ رہا ہو گا وہ سٹین گن کے برسٹ فائر کرے گا۔ اور ساتھ ہی دستی بم بھی پھینک دے گا۔ ہم صرف دو جگہوں سے ہی اٹیک کر سکتے ہیں۔ ہم وہاں زیادہ نفری بھی نہیں لے جا سکتے۔ کیونکہ اردگرد فوجی یونٹوں کی پوسٹیں پھیلی ہوئی ہیں ہمارے مجاہد گھیرے میں آ کر ہلاک ہو سکتے ہیں۔"

میں نے کمانڈو شیروان سے کہا۔

"اگر فرض کر لیا اس کے باوجود بریگیڈیئر بچ جاتا ہے تو پھر ہم کیا کریں گے؟"

وہ بولا۔

"دو حملوں سے اس کا بچنا مشکل ہو گا گرنیڈ اس کی گاڑی کو اڑا دیں گے۔ لیکن اگر

پھر بھی وہ زندہ رہا یا زخمی ہو گیا تو پھر ہم اسے ہلاک کرنے کی کوئی دوسری سکیم تیار کریں گے۔ یہ بات بھی ہمیں پیش نظر رکھنی ہے کہ بریگیڈیئر رام اوتار جس وقت اپنے بنگلے سے ہیڈ کوارٹر جاتا ہے تو سارے راستے میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر مسلح بھارتی فوجی تعینات ہوتے ہیں۔ اور پھر اس کے باڈی گارڈ ذرا سا شک پڑنے پر فائر کھول سکتے ہیں۔"

میں نے کچھ لمحے غور کرنے کے بعد کہا۔

"شیروان دوست! میرے خیال میں اس سکیم میں کئی ایک خامیاں ہیں۔ اس کا کامیاب ہونا یقینی نہیں ہے۔ میرے حساب کے مطابق جہاں اس ہندو بھیڑیئے بریگیڈیئر پر دستی بم پھینکے جائیں گے وہاں سامنے کی جانب ہمارے مزید دو کمانڈو دستی بموں اور سٹین گنوں کے ساتھ موجود ہونے چاہئیں تاکہ ٹھیک اس وقت وہ بھی فائر کھول دیں اور فائر کھول کر سب سے پہلے اگلی جیپ کے باڈی گارڈز کو ختم کر دیں۔"

کمانڈو شیروان کہنے لگا۔

"سامنے کی جانب ٹیلے کی ڈھلان ہے اور وہاں اوپر مشین گنوں کی پوسٹیں۔ وہاں جانا اپنے آپ کو بے فائدہ موت کے حوالے کرنا ہے۔"

تب میں نے اپنی کمر کے گرد بندھا ہوا رومال کھولا۔ اس میں سے دھماکہ خیز محلول کی شیشی نکال کر کمانڈو شیروان کو دکھائی اور اسے اس کے سارے ہلاکت خیز خواص سمجھائے۔ وہ اس بارے میں پہلے سے جانتا تھا مگر اس نے دھماکہ خیز ٹیبلٹ دیکھی تھیں۔ شیشی کو لالٹین کے سامنے رکھ کر اس نے ہلایا۔ اس کے اندر پانی کی طرح کا دھماکہ خیز مواد آدھا رہ گیا ہوا تھا۔ میں نے کہا۔

"اس کا صرف ایک قطرہ اگر اس مسلم دشمن بریگیڈیئر رام اوتار کے معدے میں کسی طرح پہنچا دیا جائے تو اس کے زندہ بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں نے چار آدمیوں کو اس محلول کا ایک ایک قطرہ پی لینے کے بعد دھماکے سے اڑتے دیکھا ہے۔"

کمانڈو شیروان نے شیشی صف پر رکھ دی اور بولا۔

"اس کا مطلب ہے کہ ہمیں ساری سکیم بدلنی ہو گی۔ کوئی نیا منصوبہ بنانا ہو گا"

میں نے اس کے خیال کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

"اس منصوبے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہو گا کہ بریگیڈیئر کی موت اور وہ بھی اذیت ناک موت یقینی ہو گی۔ تمہاری جو پہلی سکیم ہے اس میں دو اندیشے ہیں پہلا یہ کہ ہو سکتا ہے سٹین گن کے فائر چلتی گاڑی کے پہیوں یا پٹرول کی ٹینکی پر نہ لگیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ بریگیڈیئر کی گاڑی پر پہلے فائر کے ساتھ ہی اس کے باڈی گارڈ اندھا دھند گولیاں برسانا شروع کر دیں گے اور پھر وہیل چیئر پر بیٹھے ہوئے اور گھاس کاٹتے ہوئے ہمارے مجاہدوں میں سے کوئی بھی زندہ سلامت نہیں رہے گا۔ میں نے جو سکیم تجویز کی ہے اس سے ہمارے کسی مجاہد کی جان کو خطرہ نہیں ہو گا اور بریگیڈیئر کی موت بھی یقینی ہو گی"

"بشرطیکہ اس شیشی میں سے محلول کا ایک قطرہ بریگیڈیئر پی لے۔ یہ بلی کے گلے میں گھنٹی باندھنے والی بات ہو گی۔"

میں نے کہا۔

"یہ گھنٹی میں باندھوں گا"

کمانڈو شیروان میری طرف کچھ دیر خاموشی سے تکتا رہا۔ پھر شیشی کو اٹھاتے ہوئے بولا۔

"تم یہ کام کیسے کرو گے؟ کیا تمہارے ذہن میں کوئی منصوبہ ہے؟"

میں نے اپنے سادھوؤں والے لمبے بالوں کی وگ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"یہ حلیہ یہاں بھی کام آسکتا ہے"

"یعنی؟"

کمانڈو شیروان نے استفسار کیا۔

میں نے کہا۔

"مجھے سوچنے کے لئے آج کی رات دے دو ابھی میرے ذہن میں منصوبے کی شکل واضح نہیں ہوئی۔"

کمانڈو شیروان نے مسکراتے ہوئے سری نگر شہر کا نقشہ لپیٹ کر تھیلے میں ڈال دیا او

چائے کی چینک پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"چائے تو بالکل ٹھنڈی ہو گئی ہے"

اس نے اپنے آدمی کو آواز دے کر بلایا اور اسے کہا کہ چائے کو گرم کر کے لے آئے۔ میں نے شیروان سے کہا۔

"میں چاہتا ہوں کہ اس دوران تم اپنے آدمی کو جموں کی طرف روانہ کر دو۔ تا کہ وہ نہرانٹیروگیشن سنٹر کے بارے میں جتنی بھی تفصیلات میسر آسکتی ہیں لا کر مجھے دے۔"

کمانڈو شیروان پہلو بدلتے ہوئے بولا۔

"اس کی تم فکر نہ کرو۔ جموں شہر میں ہمارا ایک ایسا آدمی موجود ہے جو میرے بھیجے ہوئے آدمی کو پوری تفصیل بتا دے گا۔ اب تم ایسا کرو کہ منہ ہاتھ دھو کر چہرے پر ملی ہوئی راکھ صاف کرو اور وگ بھی بے شک اتار کر دیوار پر لٹکا دو۔ کپڑے بدلنے ہیں تو دوسرے کپڑے مل جائیں گے۔"

میں نے کہا۔

"وگ اتاروں گا۔ منہ ہاتھ دھولوں گا باقی لباس ابھی یہی رہنے دو۔ ہو سکتا ہے مجھے اس کی آگے چل کر ضرورت پڑ جائے۔ بہرحال میں تمہیں آج رات سوچ کر بتاؤں گا کہ بریگیڈیئر رام اوتار کو موت کے فرشتے کے حوالے کرنے کے لئے میں کیا کر سکتا ہوں۔"

میں نے سر پر لگی ہوئی لمبے بالوں کی وگ اتار کر دیوار کی کیل کے ساتھ لٹکا دی۔ ہائیڈ آؤٹ کی سرنگ سے باہر آکر ساتھ ہی بہتے چھوٹے سے چشمے پر منہ ہاتھ دھویا۔ کمانڈو شیروان کچھ فاصلے پر درختوں کے نیچے دو مجاہدین کے پاس کھڑا ان سے باتیں کر رہا تھا۔ میں منہ ہاتھ دھو کر اس کے پاس گیا تو شیروان نے میرا ان مجاہدین سے تعارف کرایا۔ ان میں ایک نوجوان اور خوبصورت مجاہد کا نام قمرالدین بٹ تھا۔ میں نے شیروان سے پہلے حریت پسندوں کے بارے میں پوچھا تو اس نے مجھے بتایا کہ ان میں سے اکثر کمانڈو آپریشن کے دوران شہید ہو گئے تھے۔ قمرالدین بٹ نے سر پر سبز رومال باندھا ہوا تھا۔ رنگ گورا اور نقش تیکھے تھے۔ آنکھوں میں چیتے کی آنکھوں ایسی چمک تھی۔

رات کو ہم نے سرنگ کے اندر ہی بیٹھ کر کھانا کھایا۔ قمرالدین بٹ بھی ہمارے ساتھ ہی تھا۔ کمانڈو شیروان نے کہا کہ قمرالدین بٹ نہرانیروگیشن سنٹر کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے جموں جا رہا ہے۔ میں نے قمرالدین بٹ سے کہا۔

"دوست! وہاں سے یہ ضرور معلوم کرنے کی کوشش کرنا کہ رات کے وقت انیر گیشن سنٹر کے آس پاس ڈیوٹی پہرے کا کیا انتظام ہوتا ہے"

قمرالدین بٹ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"انشاء اللہ! آپ کو ایک ایک تفصیل مل جائے گی۔"

کھانے کے بعد قمرالدین بٹ باہر چلا گیا۔ میں اور کمانڈو شیروان کچھ دیر بیٹھے بریگیڈئیر رام اوتار کو ٹھکانے لگانے کے پروگرام کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ میں نے کہا۔

"رات کو تو میں غور کروں گا ہی۔ کیا تم مجھے بتا سکتے ہو کہ بریگیڈئیر رام اوتار اپنی شامیں کہاں گزارتا ہے اور کیا وہ پینے پلانے والا فوجی افسر ہے؟؟"

شیروان کہنے لگا۔

"وہ پینے پلانے والا آدمی ہے۔ اس کی شامیں سری نگر فوجی ہیڈ کوارٹرز کے آفیسر میس (O. Mess) میں ہی گزرتی ہیں۔ اس کے ساتھ روز کے پینے پلانے والے تین چار فوجی افسر ہوتے ہیں۔ اور وہ فوجی میس میں ہی رات کے دس گیارہ بجے تک بیٹھے مے نوشی کرتے ہیں اور پھر وہیں کھانا کھا کر اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو جاتے ہیں۔"

"کیا بریگیڈئیر شادی شدہ ہے؟"

"شادی شدہ ہے مگر اس کے بیوی بچے پیچھے بنارس میں ہی ہیں۔ یہاں وہ بنگلے میں اکیلا رہتا ہے۔"

میں نے پوچھا۔

"ضرور اس کی عورتیں بھی دوست ہوں گی۔ اس قسم کا آدمی دوسرے افسروں کی بیویوں سے بھی تعلقات قائم کر لیتا ہے۔ بھارتی فوجی افسروں میں میں نے یہ بات عام طور

پر دیکھی ہے۔"

کمانڈو شیروان کہنے لگا۔

"اس بارے میں میں پتہ کر کے بتا سکتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ اب میں سونے جاتا ہوں۔ میرا خیال ہے میرے سونے کا بندوبست اسی پرانے لکڑی کے ڈبہ نما کمرے میں کیا ہو گا۔"

کمانڈو شیروان نے مسکرا کر کہا۔

"تم نے بالکل ٹھیک اندازہ لگایا ہے۔"

سرنگ کے دہانے کے بائیں طرف درختوں میں جہاں چشمہ بہتا تھا جھاڑیوں کے پیچھے لکڑی کا ایک چھوٹا سا کیبن بنا ہوا تھا۔ پہلے بھی میں اسی جگہ راتیں بسر کرتا تھا۔ اب بھی میرا بستر وہیں لگا دیا گیا تھا۔ میں رات کو وہاں جا کر لیٹ گیا۔ گرمیوں کی آمد آمد تھی۔ کشمیر کی وادی میں راتیں بڑی خوشگوار ہو گئی تھیں۔ کچھ دیر تک بستر پر لیٹا میں بریگیڈئیر رام اوتار کو ٹھکانے لگانے کی ترکیبوں پر غور کرتا رہا۔ ابھی تک کوئی منصوبہ حتمی شکل میں واضح ہو کر میرے ذہن میں نہیں آ رہا تھا۔ میں سو گیا۔

دوسرے دن صبح کی نماز ہم سب مجاہدین نے درختوں کے نیچے اکٹھی پڑھی۔ شیروان کہنے لگا۔

"دوست! ایک بات اپنے ذہن میں ضرور رکھنا کہ جموں کشمیر کے بعض اخباروں میں بھی پاکستانی جاسوس کی حیثیت سے تمہاری تصویر شائع ہو چکی ہے۔"

ہم سرنگ کے باہر چیڑھ کے درختوں کے نیچے بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ میں نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے۔ اس لئے میں نے سر کے اور ڈاڑھی مونچھوں کے بال بڑھانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ وگ کسی وقت بھی مجھے کسی مصیبت میں پھنسا سکتی ہے۔"

"اچھا فیصلہ کیا ہے تم نے۔ مگر اس وقت تک تمہیں وگ لگائے بغیر باہر نہیں جانا ہو گا۔"

"میں اگر گیا بھی تو سادھوؤں والے حلیے میں ہی جاؤں گا۔"

سارا دن شیروان کی خفیہ کمین گاہ میں اپنے نئے کمانڈو مشن کے بارے میں باتیں کرتے گزر گیا۔ قمرالدین بٹ منہ اندھیرے کسی وقت نہرانٹیروگیشن سنٹر کے بارے میں سراغ رسانی کرنے جموں کی طرف نکل گیا تھا۔ کمانڈو شیروان نے ایک اپنے ایک خاص آدمی کو بریگیڈیئر رام اوتار کے بارے میں تمام معلومات حاصل کرنے کے لئے بھی سری نگر شہر کی طرف روانہ کر دیا تھا۔ یہ آدمی شام کو واپس آیا۔ بریگیڈیئر رام اوتار کے بارے میں وہ جو معلومات فراہم کر کے لایا ان کے مطابق بریگیڈیئر رام اوتار اپنی کوٹھی میں ایک اردلی اور تین ملازموں کے ساتھ بالکل اکیلا رہتا تھا۔ وہ اپنی ڈیوٹی کا سخت پابند تھا۔ سوائے ہفتے کی رات کے اس کی تمام شامیں فوجی میس میں اپنے دو تین فوجی افسر دوستوں کے ساتھ پینے پلانے میں گزرتی تھیں۔ وہ فوجی میس کی عقبی بالکونی میں شراب کی محفل سجاتے تھے۔ فوجی میس میں ایک بھی ملازم مسلمان نہیں تھا۔ کسی مسلمان کو فوجی میس کے بار روم میں داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ چھوٹا موٹا سامان خورد ونوش سپلائی کرنے والے دیہاتی کشمیری مسلمانوں کو فوجی میس کے گیٹ سے اندر نہیں جانے دیا جاتا تھا۔ وہ بلانوش نہیں تھا۔ شام کو سکاچ وسکی کے صرف چار ڈبل پیگ پیتا تھا۔ چونکہ کشمیر میں ان کے لئے حالات مخدوش تھے اس لئے صرف ایک سکھ بیرا بھوپندر سنگھ بریگیڈیئر اور اس کے فوجی افسر دوستوں کے لئے شراب لے کر بالکونی میں جاتا تھا۔ یہ سکھ بیرا بریگیڈیئر کا خاص بیرا تھا اور وہ ہمیشہ سروس میں اس کے ساتھ رہتا تھا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ بریگیڈیئر کی یہ عادت ہے کہ وہ صبح کو اٹھ کر ہینگ اوور دور کرنے کے لئے وسکی کا ایک پیگ ضرور پیتا ہے۔ اس کے بعد ناشتہ کرتا ہے۔ اس مقصد کے لئے وسکی کی ایک بوتل اس کے بیڈ روم کی الماری میں ہروقت موجود رہتی ہے۔ ایک بوتل ختم ہو جاتی ہے تو اس کی جگہ دوسری بوتل آجاتی ہے۔ اپنے آدمی نے یہ بھی معلوم کیا کہ اس کی کوٹھی میں کوئی پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔

میں اور کمانڈو شیروان اپنے آدمی کے پاس ہی بیٹھے اس کی باتیں سن رہے تھے۔

اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آگیا۔ میں نے اپنے آدمی سے پوچھا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ پینے پلانے والا فوجی افسر گھر سے دور بھی ہو اور پھر اکیلا بھی ہے۔ کیا اس کے کسی ہندو سکھ عورت سے تعلقات نہیں ہیں؟ کیا وہ خود کبھی کسی عورت کے پاس نہیں جاتا؟"

وہ آدمی کہنے لگا۔

"یہ میں آپ کو کل پتہ کر کے بتا دوں گا۔"

بات وہیں ختم ہو گئی۔ اپنا آدمی چلا گیا۔ شیروان کہنے لگا۔

"اگر اس کے کسی عورت سے تعلقات بھی ہوں گے تو تمہیں اس سے کیا حاصل ہو جائے گا؟"

میں نے ہنس کر کہا۔

"کمانڈو شیروان! تم ایک پاکباز مجاہد کمانڈو ہو۔ میں نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے میں جانتا ہوں کہ عورت مرد کی سب سے بڑی کمزوری ہوتی ہے۔ وہ کہیں مار نہیں کھاتا مگر عورت سے مار کھا جاتا ہے۔ باقی میں تمہیں اپنے آدمی کی رپورٹ مل جانے کے بعد بتاؤں گا۔"

کمانڈو شیروان زیر لب مسکرانے لگا۔ میں نے کہا۔

"شیروان! ایک بات ابھی تک طے ہے کہ ہم فوجی میس میں بریگیڈیئر کی ہلاکت کی کمانڈو کارروائی نہیں کر سکتے۔ اس کے خاص بیرے بھوپندر سنگھ کو بھی اتنی جلدی اپنے ساتھ نہیں ملا سکتے۔ وہاں ہم کوئی بم بھی پلانٹ نہیں کر سکتے۔ تم نے خود مجھے بتایا تھا کہ فوجی میس کے باہر پوری فوجی پلاٹون پہرے پر موجود رہتی ہے۔ اور پھر یہ کوئی اتنا بڑا مشن بھی نہیں ہے۔ اگر یہاں گولہ بارود اور اسلحہ کا ذخیرہ اڑانا ہوتا تو ہم ہر قسم کا خطرہ مول لے کر بھی اسے اڑا سکتے تھے۔ صرف ایک آدمی کو ہلاک کرنا ہے جو ہمارے قابو میں نہیں آرہا۔ میرے دماغ میں ایک منصوبہ آگیا ہے۔ اپنے سراغ رساں کو مطلوبہ سراغ رسانی کر کے آلینے دو۔ دوسری یہ بات بھی ہمیں کبھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ ہم صرف ایک

آدمی کو ہلاک کرنے کی کوشش میں اپنے مجاہدین کی زندگیاں خطرے میں نہیں ڈال سکتے۔ تم فکر نہ کرو۔ تمہارے اس کمینے بریگیڈیئر اوتار رام یا رام اوتار کے لئے میں اکیلا ہی کافی ہوں۔"

وہ رات اور دوسرا دن بھی گزر گیا۔ دوسرے دن رات کے دس بجے کے قریب جب میں اور کمانڈو شیروان عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد غار کے اندر بیٹھے سبز چائے پیتے ہوئے باتیں کر رہے تھے کہ ایک مجاہد نے آکر خبر دی کہ اپنا آدمی آگیا ہے۔ کمانڈو شیروان نے اسے اندر بلالیا۔ وہ السلام علیکم کہہ کر ہمارے پاس صف پر بیٹھ گیا۔ کہنے لگا۔

"بریگیڈیئر رام اوتار کو ہفتے کی رات کو ایک عورت ملنے آتی ہے۔ بلکہ لائی جاتی ہے۔ یہ عورت ہفتے کی رات اس کے پاس رہتی ہے اور صبح ہونے سے پہلے اسے گاڑی میں بٹھا کر واپس بھیج دیا جاتا ہے۔ اس عورت کا نام پدماوتی ہے۔ یہ سری نگر کے شمال میں ایک بستی میں رہتی ہے۔ اس عورت کے خاوند کا لکڑی کا ٹال ہے۔ عورت بڑی فیشن ایبل ہے۔ اس کی شادی کو بارہ سال ہو گئے ہیں مگر اولاد سے محروم ہے وہ مندروں اور مسلمان بزرگوں کے مزاروں پر بھی جا کر اولاد کے لئے چڑھاوے چڑھاتی ہے اور منتیں مانتی ہے۔ خاوند زیادہ عمر کا ہے عورت جوان ہے اور اسے نئے نئے فیشن کرنے کا شوق ہے۔ اسی وجہ سے بریگیڈیئر رام اوتار سے اس کے تعلقات ہو گئے ہیں بریگیڈیئر کی ایک گاڑی خفیہ طور پر رات کے دس گیارہ بجے قصبے کے باہر جا کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ پدماوتی چادر لپیٹے آتی ہے اور گاڑی میں بیٹھ جاتی ہے۔ اسی طرح پچھلے پہر بھی گاڑی پدماوتی کو بریگیڈیئر کے بنگلے سے اندھیرے میں لے کر واپس اس کے گھر پر چھوڑ آتی ہے بستی والوں کو اس کی خبر ہے مگر بریگیڈیئر کے ڈر کے مارے کوئی زبان نہیں کھولتا۔ پدماوتی کے بوڑھے خاوند کو بھی پتہ ہے مگر وہ خاموش ہو گیا ہے وہ بھی بھارتی فوجی افسر سے ڈرتا ہے اور کچھ بول نہیں سکتا۔"

میں نے اپنے جاسوس کا ایک ایک لفظ بڑے غور سے سنا۔ جب وہ اپنی بات ختم کر چکا تو میں نے اس سے پوچھا۔

"کیا تم نے پدماوتی کا مکان دیکھا ہے؟"

وہ بولا۔

"ہاں۔ میں اس کا مکان دیکھ کر آیا ہوں"

میں نے شیروان سے کہا۔

"مجھے کاغذ کا ٹکڑا اور بال پوائنٹ پنسل دینا۔"

کمانڈو شیروان نے صندوقچی میں سے بال پوائنٹ پنسل اور کاپی نکال کر میری طرف بڑھائی۔ ہنس کر بولا۔

"کیا کوئی جادو ٹونا کرنے کا ارادہ ہے؟"

میں نے بھی مسکراتے ہوئے کہا۔

"یہاں جادو ٹونے سے ہی کام چلے گا"

میں نے کاپی میں سے سفید کاغذ کا ٹکڑا کاٹا اور اس پر ہندی میں تین بار اوم اوم اوم لکھا۔ پھر نیچے ہندی میں ہی "کالی کالی کالی" کے الفاظ لکھ کر اسے تعویذ کی طرح تہہ کیا اور اپنے جاسوس سے پوچھا۔

"کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ تم یہ کاغذ کا ٹکڑا پدماوتی کے مکان کے اندر یا چھت پر کسی جگہ چھپا کر یا دبا کر رکھ دو؟"

اپنے جاسوس نے کاغذ کا ٹکڑا لے کر صدری میں ڈال لیا اور بولا۔

"میں یہ کام کل رات کے وقت ہی کر سکوں گا۔ کیونکہ اس وقت بستی میں اندھیرا ہوتا ہے"

میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ ہم تمہارا انتظار کریں گے مجھے آکر بتا دینا کہ تم نے یہ تعویذ پدماوتی کے مکان میں کس جگہ چھپایا ہے۔"

اپنا آدمی سلام کر کے اور تعویذ لے کر واپس چلا گیا۔ کمانڈو شیروان کے لبوں پر ہلکی مسکراہٹ تھی۔ کہنے لگا۔

"تمہاری سکیم کچھ کچھ میری سمجھ میں آگئی ہے۔"

میں نے کہا۔

"جہاں طاقت سے کام نہ چل سکے وہاں حکمت عملی سے کام لینا پڑتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہم اپنا ٹارگٹ مار لیں گے۔"

دوسرا دن اور دوسری رات بھی گزر گئی۔ تیسرے روز اپنا جاسوس صبح صبح آگیا۔ کہنے لگا

"میں نے آپ کا دیا ہوا تعویذ پدماوتی کے مکان کی چھت پر مرغیوں کے ڈربے کی بائیں جانب پرانی اینٹوں کے نیچے چھپا دیا ہے۔ اس کے اوپر ایک اینٹ بھی رکھ دی ہے۔"

میں نے خوش کر کہا۔

"شاباش! اب مجھے اس عورت کے خاوند کا نام اور اس کے ٹال کا پتہ بتا دو۔ باقی کام میں خود کر لوں گا۔"

اس نے مجھے بتایا کہ پدماوتی کے خاوند کا نام جیا لعل ہے اور اس کا ٹال بستی کے کونے پر ہے۔ اب آگے میرا کام شروع ہونے والا تھا۔ میں نے ایک بار پھر اپنا سادھوؤں والا بنا لیا۔ اس دفعہ میں نے لمبی ڈاڑھی بھی لگا لی تاکہ بعد میں پدماوتی اور اس کا خاوند بھی میری شناخت نہ کر سکے۔ ابھی دھماکہ خیز دوائی والی شیشی ساتھ لے جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے موٹے منکوں کی مالائیں گلے میں ڈالیں۔ ایک مالا اپنے ہاتھ میں پکڑ لی۔ کمانڈو شیروان نے ایک مجاہد میرے ساتھ کر دیا۔ جو مجھے جنگل کے راستوں سے گزار کر اس سڑک پر چھوڑ گیا جو شہر کی اس بستی کو جاتی تھی جہاں پدماوتی کا گھر اور اس کے خاوند کا لکڑی کا ٹال تھا۔

یہ بستی زیادہ دور نہیں تھی۔ میں سڑک کے کنارے کنارے چلتا بستی میں پہنچ گیا۔ میں نے پاؤں میں وان کی بنی ہوئی چپل پہن رکھی تھی جو کشمیری مزدور پہنا کرتے ہیں۔ آرام دہ بھی ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے پاؤں میں کنکریں اور پتھر نہیں چبھتے۔ میں

اوم ہری اوم کا جاپ کرتا بستی کے شمال کی طرف آگیا۔ میں نے دور سے ایک ٹال دیکھا جس کے باہر چھوٹے سے تخت پوش پر ایک دبلا پتلا کمزور سا آدمی بیٹھا کاپی پر کچھ لکھ رہا تھا۔ ایک کشمیری مزدور چیری ہوئی لکڑیوں کو ایک طرف لگا رہا تھا۔ یہ پدماوتی کا خاوند جیا لعل ہی ہو سکتا تھا۔ میں نے اس کے سامنے جا کر ایک بازو اٹھا کر ہری اوم ست کا نعرہ لگایا اور کہا۔

"بچہ! سادھو سنتوں کی سیوا کر۔ تیرا کلیان ہو گا۔"

مسلمان تو پھر بھی بھیک مانگنے والے فقیروں کو جھڑک دیتے ہیں مگر ہندو انتہائی ضعیف الاعتقاد قوم ہے۔ وہ ایسا کبھی نہیں کرتے۔ ان کے پاس کوئی فراڈیا سادھو سنت بھی چلا جائے تو ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جیا لعل نے بھی ایسا ہی کیا۔ وہ ہاتھ باندھ کر بولا۔

"مہاراج! میں آپ کی کیا سیوا کر سکتا ہوں"

میں نے کہا۔

"بچہ! ہمیں چائے پلاؤ۔ ساتھ کیک بسکٹ بھی کھلاؤ۔"

جیا لعل نے لوہے کی کرسی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"پدھاریئے مہاراج۔ ابھی چائے بسکٹ آجاتے ہیں۔"

میں ہری اوم ہری اوم کا جاپ کرتا کرسی پر بیٹھ گیا۔ جیا لعل نے کشمیری مزدور سے کشمیری زبان میں کچھ کہا۔ میں اتنی زیادہ کشمیری زبان نہیں سمجھتا تھا۔ ضرور اس نے گھر سے چائے منگائی ہو گی۔ مزدور چلا گیا۔

میں نے جیا لعل کی طرف گھور کر دیکھا اور سادھو جس طرح حاکمانہ انداز میں بات کرتے ہیں اسی انداز میں کہا۔

"جیا لعل! تیرے سکھ کا ستارہ چمکنے والا ہے۔ مجھے اپنا ہاتھ دکھا تو نے ہم سادھو سنتوں کی عزت کی ہے۔ ہم تمہیں تقدیر کا سچا سچا حال بتائیں گے۔"

جیا لعل نے جلدی سے اپنا ہاتھ آگے کر دیا۔ اس کے میلے ہاتھ پر لکیریں بنی ہوئی

تھیں جس طرح ہر ہاتھ پر ہوتی ہیں۔ میری جانے بلا یہ لکیریں اپنے اندر کوئی مفہوم رکھتی تھیں یا نہیں رکھتی تھیں۔ میرے لئے یہ بے کار لکیریں تھیں۔ مجھے ان سے کوئی دلچسپی بھی نہیں تھی۔ میں تو اداکاری کر رہا تھا۔ میں نے جھک کر جیا لعل کے میلے کچیلے ہاتھ کو دیکھا۔ پھر ہاتھ کو پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"رام رام رام رام!"

میرے چہرے پر تفکر کے اثرات دیکھ کر جیا لعل پریشان ہو گیا۔ اس نے پوچھا۔

"مہاراج! کیا کوئی خراب بات ہے؟"

میں نے کہا۔

"جیا لعل! تیری قسمت کا ستارہ چمکنے والا ضرور ہے۔ مگر تمہاری قسمت کی ریکھا بدقسمتی کے بادلوں میں چھپ گئی ہے میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے ہاں ایک بیٹا پیدا ہونے والا ہے۔ مگر کیتو اور راہو دونوں ستارے تمہارے دشمن بن گئے ہیں۔"

جیا لعل خوش بھی ہوا اور پریشان بھی زیادہ ہو گیا۔ ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"مہاراج! مجھے کوئی اپائے بتایئے۔ کسی طرح راہو کیتو کو دور کر دیں۔ میں ساری زندگی آپ کی سیوا کروں گا۔"

میں نے کہا۔

"بچہ! تمہیں کچھ بتائیں گے۔ ایسی بات بتائیں گے کہ تم حیران رہ جاؤ گے۔ چلو۔ ہمیں اپنے گھر لے کر چلو۔ یہ کام وہیں ہو گا"

جیا لعل نے ٹال دوسرے مزدور کے حوالے کیا اور مجھے لے کر اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔ بستی کی ایک گلی میں اس کا پرانا بوسیدہ سا مکان تھا۔ مگر جس کمرے میں اس نے مجھے بٹھایا اس میں دری بچھی ہوئی تھی اور ایک پرانا صوفہ سیٹ بھی پڑا تھا۔ دیوار پر ایک خوبصورت عورت کی رنگین فوٹو لگی تھی جس میں وہ کسی ہیروئین کی طرح ایک طرف مسکرا کر دیکھ رہی تھی۔ جیا لعل نے آواز دی۔

"پدماوتی! یہاں آؤ۔ دیکھو۔ چیونٹی کے گھر میں نارائن آ گئے ہیں۔"

ایک گوری چٹی جوان عورت اندر آ گئی۔ ساڑھی کے پلو کو کمر کے گرد باندھتے ہوئے اس نے اپنے خاوند کے ساتھ ایک جٹا دھاری سادھو کو دیکھا تو فوراً جھک کر میرے قدموں کو چھوا اور ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو گئی۔ کہنے لگی۔

"مہاراج! میں تو آپ کے لئے چائے بنا کر بھیجنے والی تھی"

جیا لعل نے چارپائی پر سے میلے کپڑے اٹھاتے ہوئے کہا۔

"ہمارے بھاگ اچھے ہیں پدماوتی کہ سادھو مہاراج خود چل کر یہاں آ گئے ہیں۔ جلدی سے چائے بنا کر لے آؤ"

"ابھی لاتی ہوں جی"

وہ واپس چلی گئی۔ اس کی شکل بتا رہی تھی کہ یہ کھیلنے کھلانے والی عورت ہے۔ اس نے گھر میں بھی اپنے ہونٹوں پر سرخی لگا رکھی تھی۔ جسم کافی صحت مند تھا۔ بریگیڈیئر رام اوتار یونہی اس پر لٹو نہیں ہو گیا تھا۔

"یہاں بیٹھئے مہاراج"

جیا لعل نے چارپائی پر میرے لئے نئی چادر بچھا دی تھی۔ میں چارپائی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ جیا لعل نے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

"مہاراج! میرے ہاں بچہ کب پیدا ہو گا کرپا کر کے یہ بتا دیجئے۔"

میں نے ہاتھ کو دیکھ کر کہا۔

"جیا لعل! جب تک راہو کیتو تیرے راستے میں کھڑے ہیں تب تک تیرے ہاں اولاد نہیں ہو گی۔ جب یہ دونوں دشمن میں نے بھگا دیئے تو تیرے گھر لڑکا پیدا ہو گا۔ اور سن۔"

میں نے اس کی مردانہ جذبات کی تسکین کی خاطر کہا۔

"بچہ تمہاری طرح بڑا خوبصورت اور طاقت ور ہو گا"

جیا لعل خوشی سے جھوم اٹھا اور میرے گھٹنے بار بار چھونے لگا۔ اتنے میں پدماوتی چائے اور بسکٹ لے کر آ گئی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔

"پدماوتی! یہاں سامنے آکر بیٹھ جا"

وہ ساڑھی لپیٹتی ہوئی میرے سامنے مونڈھے پر خاوند کے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔ میں نے تھوڑی دیر کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔ تین چار بار ہری اوم ہری اوم کہا۔ اور پھر آنکھیں کھول کر چھت کی طرف دیکھا۔ اور کہا۔

"جیا لعل! تم دونوں پر کسی نے جادو ٹونا کیا ہوا ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ اوپر مرغیوں کے ڈربے کے پاس اینٹوں کے ڈھیر میں تمہارے دشمن نے ایک تعویذ دبایا ہوا ہے۔ چل میرے ساتھ اوپر چل"

وہ دونوں میرے ساتھ چھت پر آگئے۔ وہاں مرغیوں کے ڈربے کے پاس واقعی ایک طرف اینٹوں کا ڈھیر لگا تھا۔ مرغیاں ڈربے میں شور مچانے لگیں۔ میں نے دل میں انہیں گالی دے کر کہا۔ تم کیوں شور مچانے لگی ہو؟۔ میں نے جیا لعل سے کہا۔

"ان اینٹوں کو ہٹا کر دیکھو۔ تعویذ یہیں کہیں ہو گا۔"

جیا لعل اور پدماوتی اینٹوں کو ادھر ادھر ہٹانے لگے۔ ایک اینٹ کے نیچے سے میرے جاسوس کا دبایا ہوا اور میرے ہاتھ کا لکھا ہوا تعویذ نکل آیا۔ وہ دونوں حیران رہ گئے۔ میں نے کہا۔

"اسے کھول کر دیکھو اور پڑھو اس پر کیا لکھا ہے"

جیا لعل نے تعویذ کھول کر پڑھا۔ اور خوف کے مارے کانپنے لگا۔

"مہاراج! یہ تو کالی دیوی کا ٹونا ہے۔ میں تو برباد ہو جاؤں گا مہاراج!"

میں نے تعویذ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

"جیا لعل! ہم کس لئے یہاں آئے ہیں؟ ہم تمہیں برباد نہیں ہونے دیں گے۔ نیچے آجاؤ۔"

پدماوتی بھی پریشان تھی۔ ہم نیچے کمرے میں آکر بیٹھ گئے۔ میں نے پدماوتی سے کہا۔

"پدماوتی! میرے لئے چائے بناؤ"

فوراً اس نے میری پیالی میں سبز چائے ڈالی اور مجھے پیش کی۔ جیا لعل نے بسکٹوں کی

تھالی آگے کر دی۔ میں نے ایک بسکٹ کھایا۔ چائے کے دو گھونٹ پیئے اور پیالی رکھ دی۔

"جیا لعل! ماچس منگواؤ"

اس نے پدماوتی سے کہا۔

"جلدی سے ماچس لے آؤ"

وہ دوڑ کر گئی اور ماچس لے آئی۔ میں نے ایک ہاتھ میں تعویذ والا کاغذ پکڑ لیا اور جیا لعل سے کہا۔

"اپنے ہاتھ سے ماچس جلا کر اس کاغذ کو آگ لگا دو"

جیا لعل نے تیلی جلا کر کاغذ کے کونے کو آگ لگا دی۔ میں نے جلتا ہوا کاغذ خالی تھالی میں رکھ دیا۔ جب سارا کاغذ جل گیا تو میں نے پدماوتی کی کمر کو تھپتھپا کر کہا

"پدماوتی! خوش ہو جا۔ بھگوان نے تم پر کرپا کر دی۔ تیرے گھر کی ساری بلائیں جل کر راکھ ہو گئی ہیں۔ اب تیرے ہاں ایک چندرماں ایسا بچہ پیدا ہو گا۔"

پدماوتی کے لئے یہ دو خوش خبریاں تھیں۔ وہ تو خوشی سے نہال ہو گئی اور میرے قدموں پر سر رکھ کر فرط مسرت سے رونے لگ پڑی۔ میں نے ایک بار پھر اس کی کمر پر ہاتھ پھیرا اور کہا۔

"تمہیں تو خوش ہونا چاہئے پگلی تیرے سارے دکھ دلدر دور ہو گئے ہیں۔"

میں نے اس کی کمر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے محسوس کیا کہ اس نے بلاؤز کے نیچے کچھ نہیں پہنا ہوا تھا۔ ایک بار پھر میرے دل میں خیال آگیا کہ بریگیڈیئر رام او تار یونہی اس عورت پر لٹو نہیں ہوا۔ میں نے اپنا سکہ ان دونوں پر بٹھا دیا تھا۔ اب مجھے اپنے حقیقی مشن کو آگے بڑھانا تھا۔ میں نے پدماوتی سے کہا۔

"تم تھوڑی دیر کے لئے باہر جاؤ۔ مجھے تمہارے پتی دیو سے کچھ باتیں کرنی ہیں جاؤ۔"

وہ جلدی سے اٹھ کر کمرے سے نکل گئی۔ میں نے جیا لعل سے کہا۔

"جیا لعل! تیری پتنی کا ستارہ چمکنے لگا ہے۔ راہو کیتو راستے سے ہٹ گئے ہیں۔ اب

ایسا کرنا کہ اپنی پتنی کو گھر سے باہر جانے سے کبھی نہ روکنا۔ وہ جتنا گھر سے باہر رہے گی ستاروں کی کرنیں اس پر پڑیں گی اور اس کے پیٹ میں جو تمہارا بچہ پل رہا ہے اس کو طاقت ملے گی۔ سمجھ گئے؟"

بے چارہ جیا لعل۔ کہنے لگا۔

"مہاراج! میں نے تو پدما کو کبھی کہیں جانے سے نہیں روکا۔ دن ہو چاہے رات وہ جہاں جانا چاہتی ہے میں اسے کبھی نہیں روکتا"

"بس اس پر عمل کرتے رہنا۔ اب یہ بات پدماوتی کو مت بتانا۔"

"کبھی نہیں بتاؤں گا۔ جی کبھی نہیں۔ ہے بھگوان تیری کرپا ہے۔"

میں نے جیا لعل سے کہا۔

"اب تو دوسرے کمرے میں چلا جا اور اپنی پتنی کو اندر بھیج دے۔ مجھے اس کے ساتھ ایک ضروری بات کرنی ہے۔ جا۔ چلا جا۔"

جیا لعل ہاتھ جوڑتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ دوسرے لمحے اس کی پتنی پدماوتی اندر آگئی۔ اس نے بھی ہاتھ باندھے ہوئے تھے۔ میں نے کہا۔

"یہاں میرے پاس آکر بیٹھ جا ناری!"

میں بالکل ہندوؤں کے سادھوؤں کی طرح حاکمانہ انداز میں بول رہا تھا۔ اگر اس طرح نہ بولا جائے تو ان لوگوں پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ پدماوتی چارپائی پر میرے بالکل ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔ اس کا گرم گداز جسم بالکل میرے ساتھ لگا ہوا تھا۔ میں پدماوتی کے اس طرح ساتھ لگ کر بیٹھنے سے سمجھ گیا کہ وہ اس بات کے لئے بالکل تیار ہے جو میرے اصول کے خلاف تھی۔ اور جسے میں پسند نہیں کرتا تھا۔ لیکن میرے جذبات میں ہلچل ضرور پیدا ہوگئی تھی۔ میں نے اپنی داستان سناتے وقت کہہ دیا تھا کہ میں جھوٹ کہیں نہیں بولوں گا۔ ہر واقعہ ہر بات اور اپنے دل کی تمام کیفیات آپ کو سچ سچ بیان کرتا جاؤں گا۔ اس وقت میرے اندر ایک زبردست کشمکش شروع ہوگئی۔ میں جوان تھا۔ صحت مند تھا۔ میرے اندر جذباتی ہیجان کا پیدا ہو جانا قدرتی بات تھی۔ مگر میں آپ کو یہاں ایک

بات ضرور بتا دینا چاہتا ہوں۔ چاہے آپ اس پر یقین کریں چاہے نہ کریں۔ چاہے آپ میری یہ بات سن کر مجھے بیوقوف کہیں چاہے میری بات نہ مانیں۔ مگر میں آپ کو یہ ضرور کہوں گا کہ جب مرد پر ایسا مقام آتا ہے تو اس کی مردانگی یہ نہیں کہ وہ جذبات کی رو میں بہہ جائے۔ اس کی مردانگی یہ ہے کہ وہ اس وقت چٹان بن جائے۔ جذبات کی طوفانی لہریں میں چٹان سے ٹکرا ٹکرا کر سر پھوڑ دیں مگر مرد پر اس کا اثر نہ ہو اور وہ اپنی جگہ پر قائم رہے۔ آپ میری اس بات پر ہنسیں گے اور کہیں گے کہ یہ کیسا احمق مرد ہے کہ ہمیں ایک قدرتی عمل سے روک رہا ہے۔ میں کہوں گا کہ آپ غلط سوچ رہے ہیں۔ یہ قدرتی عمل ضرور ہے مگر قدرت نے اس عمل کا ہمیں اختیار دے کر ہم پر کچھ ذمے داریاں بھی عائد کر دی ہیں۔ انسانوں پر یہ قدرتی عمل اس وقت بنتا ہے جب ہم اس عمل کے بعد پیدا ہونے والے نتیجے کی ذمے داری قبول کرنے کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ جانوروں پر یہ بات اس لئے عائد نہیں ہوتی کہ انہیں جنسی جذبات پر عمل کرنے کا اختیار نہیں دیا گیا۔ ان کو ایک خاص موسم دے دیا گیا ہے جب ان کے اندر جنسی جذبات از خود پیدا ہو جاتے ہیں۔ ہمیں یہ اختیار دیا گیا ہے کہ ہم جس وقت چاہیں اپنے اوپر جنسی ہیجان طاری کر سکتے ہیں۔ مرد وہ ہے جو اس اختیار کا ناجائز فائدہ نہ اٹھائے اور جنسی عمل کو ایک ضابطہ اخلاق کا پابند بنا کر رکھے۔ قدرت نے انسان کو اختیار دے کر اس کو اس اصول اور ضابطے کا پابند بنانے کی کوشش کی ہے جو اس ساری کائنات میں جاری و ساری ہے۔ ہمیں اختیار دے کر ہمارے جبر کو آزمایا گیا ہے۔ ہمیں امتحان میں ڈالا گیا ہے۔ جو اس امتحان میں کامیاب رہتا ہے وہی اس کائنات کی مشینری کا ایک اہم پرزہ بنتا ہے اور قدرت کے منشا کو پورا کرنے' اسے آگے بڑھانے میں قدرت کی مدد کرتا ہے۔ یہ کوئی فلسفہ نہیں ہے۔ یہ حقیقت حقیقی ہے جس کا مظاہرہ ہم اپنی زندگی میں روز دیکھتے ہیں مگر ہمیں پتہ نہیں چلتا۔ ہمیں اس کا پتہ لگانا چاہئے۔ ہمیں غافل بن کر زندگی بسر نہیں کرنی چاہئے۔ غفلت اس کائنات میں موت کا دوسرا نام ہے۔

معاف کر دینا۔ میں کبھی کبھی اپنی کہانی بیان کرتے کرتے دوسری طرف نکل جاتا

ہوں۔ یہ مت سمجھیں کہ میں کوئی نصیحتیں کرنے لگتا ہوں یا آپ کو سمجھانے کی غرض سے ایسی باتیں شروع کر دیتا ہوں۔ نہیں ایسی بات بالکل نہیں ہے۔ میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ کوئی کسی کو سمجھا نہیں سکتا کوئی کسی کی بات سمجھنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ میں تو اپنا نشہ پورا کرنے کے لئے ایسی باتیں شروع کر دیتا ہوں۔ یقین کریں۔ مجھے ان باتوں کا نشہ ہو گیا ہے۔ بس ایک کیفیت مجھ پر طاری ہو جاتی ہے اور میں ایسی باتیں شروع کر دیتا ہوں۔ آپ میری باتیں سمجھنے کی کوشش ہرگز نہ کریں۔ میری باتیں آپ کی سمجھ میں بھی آ گئیں تو آپ انہیں نہیں سمجھیں گے۔ بس خدا سے دعا کریں کہ آپ پر بھی میری طرح ان باتوں کا نشہ چڑھ جائے۔ پھر آپ بھی میری طرح ان باتوں کو سننے کی بجائے انہیں ساری کائنات میں چلتے پھرتے' اپنا کام کرتے' اپنی ڈیوٹی ادا کرتے دیکھیں گے۔

پدماوتی کے گداز بدن نے میرے جذبات میں جو ہیجان پیدا کیا تھا اسے میں نے اپنی طاقت سے فتح کر لیا۔ یاد رکھیں۔ دوسروں کو فتح کرنے والا فاتح ہوتا ہے۔ مگر اپنے آپ کو فتح کرنے والا انسان عظیم ہوتا ہے۔ میں نے پدماوتی کو بالکل نہ کہا کہ پرے ہٹ کر بیٹھو۔ اب اس کی ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ مجھ پر اس وقت جو حملہ ہوا تھا اس کو میں نے جوابی حملے سے پسپا کر دیا تھا۔ میں نے پدماوتی کا جسم اپنے جسم کے ساتھ لگا رہنے دیا اور اس کو مخاطب کرتے ہوئے اپنے ٹارگٹ پر اٹیک کیا۔

"پدماوتی! میری بات غور سے سن!"

پدماوتی نے ہاتھ جوڑ دیئے۔ میں نے کہا۔

"تیری کوکھ سے بہت جلد ایک چندر ماں ایسا بچہ پیدا ہو گا۔ دیوتاؤں نے تمہیں یہ خوش خبری دینے کے لئے مجھے بھیجا ہے"

پدماوتی یہ سن کر اتنی خوش ہوئی کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اٹھ کر میرے قدموں میں بیٹھ گئی۔ پھر میری طرف دیکھ کر بولی۔

"مگر مہاراج! میرا خاوند مرد نہیں رہا"

میں نے مسکرا کر اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"مورکھ ناری! یہ بچہ تیرے خاوند سے نہیں بلکہ اس مرد سے پیدا ہو گا جس کے پاس تو ہر شنی وار کی رات کو جاتی ہے"

پدماوتی نے شرم کے مارے گردن نیچی کر لی۔ دونوں ہاتھوں سے میرے پاؤں پکڑ لئے اور رو کر کہا۔

"مہاراج مجھے شما کر دیں۔ مجھے شما کر دیں"

میں نے کہا۔

"مورکھ ناری! بھگوان کی مرضی سے ایسا ہو رہا ہے۔ دیوتاؤں کی یہی مرضی ہے کہ تیرا بچہ رام اوتار سے ہو لیکن اس کے لئے تجھے ایک شرط پوری کرنی ہو گی۔ بول! کیا دیوتاؤں کی شرط پوری کرنے کے لئے تیار ہے؟"

پدماوتی نے کہا۔

"مہاراج آپ حکم کریں۔ کونسی شرط ہے۔ میں اپنے بچے کی خاطر ہر شرط پوری کرنے کے واسطے تیار ہوں"

اب میرا راستہ صاف ہو گیا تھا۔ میں نے کہا۔

"تجھے دیوتاؤں کے مان سرور لایا ہوا جل رام اوتار کو پلانا ہو گا۔ اسے یہ جل پلاؤ گی تو تیرے بطن سے چاند ایسا بچہ جنم لے گا۔ اس کے بغیر چاہے تو ساری عمر دنیا کے سارے مردوں سے ملتی رہو گی تیر کوکھ ہری نہیں ہو گی۔"

پدماوتی بولی۔

"مہاراج مجھے یہ پوتر جل کہاں سے ملے گا؟ میں چاہے کچھ ہو جائے یہ جل لا کر رام اوتار کو پلاؤں گی۔"

میں نے کہا۔

"تو بڑی خوش قسمت ہے پدماوتی۔ دیوتاؤں کے مان سرودر کا یہ جل میرے پاس موجود ہے۔ میں کل اسی وقت یہ جل لا کر تمہیں دے دوں گا۔ مگر ایک اور شرط بھی ہے۔"

"وہ کیا مہاراج؟"

میں نے کہا۔

"اس کا ذکر کسی سے مت کرنا۔ اپنے خاوند اور بریگیڈیئر رام او تار سے بھی نہ کرنا اگر تو نے کسی سے ذکر کر دیا تو گنگا جل کا سارا اثر ختم ہو جائے گا اور تو بانجھ کی بانجھ رہے گی"

اس نے ہاتھ باندھ کر کہا۔

"مہاراج! میری زبان جل جائے اگر میں کسی سے اس کا ذکر کروں۔ مجھے آج ہی یہ جل لا دیجئے۔ میں ساری عمر کے لئے آپ کی داسی بن کر رہوں گی۔"

میرے پاس اس وقت دھماکہ خیز محلول کی شیشی موجود نہ تھی مگر پھر میں پدماوتی کے اشتیاق کو مزید تیز بھی کرنا چاہتا تھا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اور کہا۔

"اب ہم جاتے ہیں۔ جیا لعل کو کہہ دینا ہم کل اسی وقت آئیں گے۔"

میں نے جیا لعل اس کے خاوند کا بھی انتظار نہ کیا اور سادھوؤں والی اداؤں سے کام لیتے ہوئے اولکھ زنجن کا نعرہ لگا کر مکان سے باہر نکل گیا۔

واپس آکر میں نے کمانڈو شیروان کو سارا قصہ سنایا۔ وہ کہنے لگا۔

"کیا وہ عورت یہ کام کر سکے گی؟"

میں نے کہا۔

"وہ کہاں کرے گی۔ میں اس سے یہ کام کرواؤں گا جب توپ کے پیچھے توپچی موجود ہو تو توپ چل جاتی ہے۔ توپچی کے بغیر توپ نہیں چلتی۔"

اگلے روز میں نے جس وقت آنے کو کہا تھا اس وقت پدماوتی کے گھر پہنچ گیا۔ وہ میرا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔ آج اس نے نہا دھو کر بال بنائے ہوئے تھے اور سرخی بھی خوب لگائی ہوئی تھی۔ شاید وہ مجھے خوش کرنا چاہتی تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ میں اس خوشی کا محتاج نہیں تھا جو خوشی وہ مجھے دینا چاہتی تھی۔ اس نے اپنے خاوند کو بھی گھر سے باہر بھیج دیا ہوا تھا۔ ہندوؤں کے گھر میں سادھو داخل ہوتا دیکھ کر کوئی ہندو شک نہیں

کرتا کہ گھر میں اکیلی عورت ہے یہ کیوں گیا ہے۔ ہندو لوگ کسی سادھو کے گھر میں داخل ہونے کو بڑا مبارک سمجھتے ہیں۔ اس نے چارپائی پر نئی چادر بچھائی ہوئی تھی۔ میرے قدم چھو کر وہ نوکروں کی طرح میرے سامنے کھڑی ہو گئی۔ میں بڑی شان سے چارپائی پر چوکڑی مار کر بیٹھ گیا تھا۔ میں نے اسے اشارے سے اپنے قریب بلایا۔

پدماوتی سدھائے ہوئے جانور کی طرح جلدی سے میرے قریب آکر میرے قدموں میں زمین پر بچھی ہوئی دری پر اس طرح بیٹھ گئی کہ اس نے اپنے دونوں ہاتھ میرے گھٹنوں پر رکھ کر سر بھی میرے گھٹنوں سے لگا دیا۔ میں نے کہا۔

"پدماوتی! سر اوپر اٹھا۔ اور ہم تجھے جو کچھ کہیں اسے غور سے سن اور ہم جس طرح کہیں اسی طرح کرنا۔ کیا تو تیار ہے؟"

اس نے سر اٹھا لیا اور بولی۔

"مہاراج آپ حکم کریں۔ کیا آپ پوتر گنگا جل لائے ہیں؟"

میں نے قمیض کے اندر ہاتھ ڈال کر دھماکہ خیز محلول کی شیشی نکال کر اسے دکھائی۔

"یہ ہے پوتر مان سروور کا گنگا جل جو دیوتاؤں نے مجھے دیا تھا۔ اب تو ایسا کر کہ کوئی شیشی لا۔"

وہ دوڑ کر اندر گئی اور ایک شیشی لے آئی۔ میں نے دھماکہ خیز محلول والی شیشی کا ڈھکنا کھول کر اس کی شیشی کو غور سے دیکھا۔ اور کہا۔

"پدماوتی! تو بڑی بھاگیہ وان ہے کہ دیوتاؤں کا دیا ہوا پوتر جل تجھے مل رہا ہے۔ یاد رکھ۔ اس جل میں تیرے کوکھ سے جنم لینے والا بچہ موجود ہے۔"

وہ خوشی سے جھوم رہی تھی۔ میں نے خالی شیشی میں اپنی شیشی میں سے دھماکہ خیز محلول کے چند قطرے انڈیلے اور شیشی اچھی طرح سے بند کر کے اسے دے دی۔

"اس پوتر جل کو سنبھال کر رکھنا۔ یہ بتا کہ تو رام او تار بریگیڈیئر سے ملنے کب جا رہی ہے؟"

پدماوتی نے شرماتے ہوئے کہا۔

"مہاراج کل شنی وار ہے۔ کل رات کو جاؤں گی"

میں نے کہا۔

"اب میں تمہیں بتاتا ہوں کہ تمہیں کیا کرنا ہوگا۔"

وہ ہمہ تن گوش ہوگئی۔ میں نے کہا۔

"پہلے یہ بتا کہ تو کس وقت رام اوتار کی کوٹھی سے واپس آتی ہے؟"

بات اصل میں یہ تھی کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ بریگیڈیئر رام اوتار کے ساتھ یہ بے گناہ عورت بھی ماری جائے۔ میں اس ہندو کا دشمن تھا اور وہ ہندو میرا دشمن تھا جو مسلمانوں پر ظلم وستم کر رہا تھا۔ جس نے کئی کشمیری مجاہدین کو اذیتیں دے دے کر شہید کر دیا تھا۔ یہ ہندو ظلم وستم کر رہا تھا۔ جس نے کئی کشمیری مجاہدین کو اذیتیں دے دے کر شہید کر دیا تھا۔ یہ ہندو عورت بے گناہ تھی۔ یہ میری دشمن نہیں تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ جس وقت بریگیڈیئر رام اوتار کے معدے میں یہ محلول چلا جائے گا تو اس کے ٹھیک دس منٹ بعد اس کا جسم دھماکے سے پھٹ جائے گا اور اس کے پاس جو کوئی بھی بیٹھا یا لیٹا ہوا ہوگا وہ بھی دھماکے میں ختم ہو جائے گا۔ اسی لئے میں نے پدماوتی سے یہ سوال پوچھا تھا کہ وہ کس وقت بریگیڈیئر کی کوٹھی سے واپس آتی ہے۔ میں چاہتا تھا کہ بریگیڈیئر کو یہ محلول پلانے کے دس منٹ کے اندر اندر پدماوتی وہاں سے جا چکی ہو۔

رے آگے پدماوتی کی شرم کافی حد تک دور ہوگئی تھی۔ کہنے لگی۔

"مہاراج دن نکلنے سے پہلے پہلے میں بریگیڈیئر صاحب کے بنگلے سے واپس آجاتی ں"

میں نے جھوٹ موٹ کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"تمہارے بریگیڈیئر کو بھی پتہ نہیں چلنا چاہئے کہ تم نے اسے دیوتاؤں کا پوتر جل ا ہے۔ اگر اسے معلوم ہو گیا تو تیرے حمل نہیں ٹھہرے گا۔ تیرے ہاں بچہ جنم نہیں ،گا"

وہ ہاتھ باندھ کر بولی۔

"مہاراج میں اسے بالکل نہیں بتاؤں گی۔ کبھی نہیں بتاؤں گی۔ میں چپکے سے پانی میں ر اسے پلا دوں گی"

میں آہستہ آہستہ راستہ صاف کرتا ہوا اپنے ٹارگٹ پر پہنچ رہا تھا۔ اصل میں میں اس ت کی جان بچانا چاہتا تھا۔ میں نے نفی میں سر ہلا کر کہا۔

"نہیں۔ نہیں۔ نہیں"

وہ ڈر گئی۔ بولی۔

"کیا ہوا مہاراج! کیا مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی ہے؟"

میں نے جلال میں آکر کہا۔

"یہ جل پانی میں تم اسے پلاؤ گی تو اس کا اثر آدھا رہ جائے گا۔ یہ بتاؤ کیا بریگیڈیئر

سوم رس پیتا ہے؟ سوم رس جو دیوتا بھی پیتے ہیں"

پدماوتی سوم رس کو نہ سمجھ سکی۔ میں نے فوراً کہا۔

"کیا بریگیڈیئر رام اوتار شراب پیتا ہے؟"

وہ ڈر کر بولی۔

"ہاں مہاراج وہ شراب رات کو بھی پیتا ہے اور صبح اٹھ کر بھی پیتا ہے۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ میں صبح اٹھنے کے بعد بھی تھوڑی سی پی لیتا ہوں"

میں نے کڑک کر کہا۔

"بس یہ ٹھیک ہے۔ مورکھ ناری! دیوتا تم سے خوش ہیں۔ بہت خوش ہیں انہوں نے تیرے لئے پہلے سے سارا انتظام کر رکھا ہے۔ اب میری بات غور سے سن۔ رات کو جب شراب پینے کے بعد بریگیڈیئر سو جائے تو تم نے اٹھ کر اس بوتل میں یہ گنگا جل کے قطرے ملا دینے ہیں جس میں سے رام اوتار نے صبح اٹھ کر تھوڑی سی شراب پینی ہے۔ بس وہ صبح اٹھے گا۔ بوتل میں سے شراب کے دو گھونٹ پیئے گا اور دیوتاؤں کی مرضی پوری ہو جائے گی اور اگلے برس تیری گود میں چاند ایسا بچہ کھیل رہا ہو گا۔"

پدماوتی نے میرے زانوؤں پر سر رکھ دیا اور آہستہ آہستہ سسک سسک کر رونے لگی۔ بے چاری عورت۔ عورت واقعی ماں کے روپ میں اپنی تمام طاقتوں کے ساتھ اپنی تمام محبتوں اور شفقتوں کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے۔ ماتا کا جوہر اس کے خون میں گردش کرتا ہے۔

میں نے اس کا سر اٹھایا اور کہا۔

"اب رونا دھونا بند کر اور خوش ہو جا تیری گود دیوتاؤں نے ہری کر دی ہے۔ جا شیشی کو سنبھال کر رکھ۔ کل جب تو بریگیڈیئر کے بنگلے پر جائے گی تو اس کو سنبھال کر کر اپنے ساتھ لے جانا اور رات کو جب رام اوتار سو رہا ہو گہری نیند میں تو اٹھ کر اس شراب کی بوتل میں یہ سارا پوتر گنگا جل انڈیل دینا پھر بھگوان کا کرشمہ دیکھنا۔ اب خوش ہو جا۔ بھگوان نے تیری نسل جاری کر دی ہے۔"

خدا جانے پدماوتی کو کیا ہوا کہ وہ میرے قدموں سے چمٹ کر ایسا رونے لگی کہ نہ اس کے آنسو تھمتے تھے۔ نہ وہ میرے پاؤں سے الگ ہوتی تھی۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے الگ کیا اور چارپائی سے اٹھ کر کہا۔

"پدماوتی! اگر تو زیادہ رونا دھونا کرے گی تو سارا کام خراب ہو جائے گا۔"

وہ جلدی سے اپنے آنسوؤں کو پونچھ کر بولی۔

"نہیں نہیں مہاراج! میں اب کبھی نہیں روؤں گی۔"

میں دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ میرے پیچھے پیچھے چلی آ رہی تھی۔ میں دروازے کے پاس رک گیا۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"یاد رکھنا۔ اس کا ذکر نہ اپنے پتی سے کرنا نہ رام اوتار سے کرنا۔ اگر تو نے پوری ہوشیاری سے کام لیا تو بہت جلد ایک بیٹے کی ماں بن جائے گی۔"

پدماوتی کہنے لگی۔

"مہاراج ایسا ہی ہو گا۔ ایسا ہی ہو گا میں اس راز کو راز ہی رکھوں گی۔ یہاں میرے ہونے والے بچے کا جیون ہے۔"

"شاباش! اب تو آرام کر۔ ہم بھی جاتے ہیں ہم پرسوں تیرے پاس آئیں گے۔ اور یہ معلوم کریں گے کہ کیا تم نے ساری شرطیں پوری کرتے ہوئے رام اوتار کو گنگا جل پلا دیا ہے۔ اولکھ نرنجن!"

اور میں پدماوتی کے مکان سے نکل کر گلی میں آ گیا۔ پرسوں میرے پدماوتی کے گھر میں آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں دل میں یہ دعا مانگ رہا تھا کہ خدا کرے جس وقت مسلمان کش اور کشمیریوں کا دشمن قصاب بریگیڈیئر رام اوتار کا جسم دھماکے سے پھٹے اس وقت یہ عورت وہاں موجود نہ ہو۔ ایک بات یقینی تھی کہ اگر یہ عورت بریگیڈیئر رام اوتار کے بنگلے سے واپس آ بھی جاتی ہے تو رام اوتار کی اذیت ناک موت کے بعد انٹلی جنیس والے اسے ضرور پکڑ کر لے جائیں گے اور اس سے زبردست پوچھ گچھ کریں گے کیونکہ رات کو یہی عورت بریگیڈیئر کے بیڈ روم میں موجود تھی اور فوجی گاڑی

اسے لے کر آتی اور واپس لے جاتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ پدماوتی کی جان بچ جائے گی مگر وہ ملٹری انٹیلی جینس کو یہ ضرور بتا دے گی کہ اس کو ایک سادھو نے گنگا جل دیا تھا کہ اس کو رام اوتار کی شراب کی بوتل میں ملا کر پلا دینا تیرے ہاں بچہ پیدا ہو گا۔ ملٹری انٹیلی جینس والے اس عورت سے ذرا سے تشدد کے بعد یہ راز اگلوا لیں گے۔ اس کے ساتھ ہی رام اوتار کی بوتل میں پڑی ہوئی شراب کا کیمیکل تجزیہ شروع ہو جائے گا۔ لیکن گل خان نے یہ محلول کچھ ایسے فارمولے کی راہ نمائی میں تیار کیا تھا کہ اگر اس کا تجزیہ امریکہ کی جدید ترین لیبارٹری میں ہو تو ممکن تھا کہ کچھ سراغ مل جائے لیکن سری نگر کی فوجی لیبارٹری میں یہ پتہ نہیں چل سکتا تھا کہ شراب میں دھماکہ خیز مواد شامل ہے۔ یہ گل خان کا کمال فن تھا۔

میں بستی سے نکل کر کھیتوں کے ساتھ ساتھ اس طرف چل پڑا جدھر پہاڑیاں اور درخت تھے۔ یہاں گھاٹیوں میں اتر گیا۔ میں ان راستوں پر ہو کر چل رہا تھا جن راستوں سے مجھے اپنا آدمی لے کر باہر آیا تھا۔ کمانڈو شیروان نے مجھے دیکھا تو تیز تیز قدموں چلتا میرے پاس آیا۔

"کیا ہوا؟"

میں نے کہا۔

"بتی کو آگ لگا دی ہے۔ اب دیکھیں دھماکہ ہوتا ہے یا نہیں۔"

ہم وہیں درختوں کی اوٹ میں چارپائی پر بیٹھ گئے۔ میں نے اسے سارا واقعہ بیان

وہ کہنے لگا۔

"کل رات کو ہم اپنے ایک آدمی کی ڈیوٹی لگا دیں گے۔ وہ بریگیڈیئر کے بنگلے کچھ فاصلے پر چھپ کر بیٹھ جائے گا۔ کیا تمہیں یقین ہے کہ یہ محلول کام دکھائے گا؟"

میں نے کہا۔

"میں اس کا تجربہ کر کے دیکھ چکا ہوں شرط صرف یہ ہے کہ پدماوتی اس بریگیڈیئر کی بوتل میں محلول کے قطرے ڈال دے اور بریگیڈیئر اس بوتل میں سے

ی بھی لے۔ اگر ایسا ہو گیا تو پھر ایسا دھماکہ ہو گا کہ آدھا بنگلہ رام اوتار کے ساتھ ہی اڑ جائے گا۔"

میں خود جانا چاہتا تھا مگر کمانڈو شیروان نے یہ کہہ کر مجھے روک دیا کہ وہاں آس پاس ملٹری پولیس اور انٹیلی جینس کے آدمی چھپے ہوتے ہیں۔ تم پہاڑی علاقے سے واقف نہیں ہو کہیں پھنس نہ جاؤ۔ ہمارا آدمی دھماکے کے بعد نکل آئے گا۔ ہفتے کی رات آ گئی۔ یروان نے اپنے آدمی کو ہدایات دے کر بریگیڈیئر کے بنگلے کے قریب کسی جگہ چھپ کر بیٹھنے کے لئے بھیج دیا تھا۔ میں اور شیروان رات کے بارہ ایک بجے تک اپنے اگلے مشن یعنی گل خان کو بھارتی انٹیروگیشن سنٹر سے فرار کروانے کے بارے میں غور کرتے رہے۔ وں سے اپنا جاسوس نہر انٹیروگیشن کی تفصیلات معلوم کر کے ابھی تک نہیں آیا تھا۔ ن کے آنے کے بعد ہی ہم کوئی منصوبہ تیار کر سکتے تھے۔ رات ایک بجے کے بعد شیروان ونے کی تیاریاں کرنے لگا۔

"تم بھی سو جاؤ۔ جو ہونا ہے وہ صبح ہی ہو گا۔ ہمارا آدمی آ کر خبر کر دے گا۔"

وہ بھی سو گیا۔ کچھ دیر بستر پر پہلو بدلنے کے بعد میں بھی سو گیا۔ صبح کی اذان کے ت ہمیں اٹھا دیا گیا۔ میں نے اور کمانڈو شیروان اور دوسرے حریت پسند مجاہدوں نے ٹھے صبح کی نماز پڑھی۔ دھماکے کا وقت قریب آ رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اولاد کی خاطر ماوتی ویسے ہی کرے گی جس طرح میں نے اسے ہدایت کی ہے۔ وہ چالاک اور تجربہ کار رت تھی۔ اس نے اب تک ضرور شراب کی بوتل میں دھماکہ خیز محلول جس کو وہ گنگا کا ز جل سمجھ رہی تھی۔ ملا دیا ہو گا۔ صبح ہو گئی۔ ہم نے ناشتہ کیا اور اپنی اپنی سٹین گنیں لے کر ان کی صفائی کرنے بیٹھ گئے۔ شیروان کہنے لگا۔

"تمہارا کیا خیال ہے بریگیڈیئر ابھی تک زندہ ہو گا؟"

میں نے کہا۔

"میرے حساب کے مطابق تو اس وقت تک وہ ختم ہو گیا ہو گا۔ اس کے جسم کے ے اڑ گئے ہوں گے۔ آگے جو اللہ کو منظور ہے وہی ہو گا۔"

دن کے دس بجے کے قریب اپنا آدمی آ گیا۔ اس کا سانس پھول رہا تھا۔ اس نے آتے ہی اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا اور بتایا کہ بریگیڈیئر رام او تار ختم ہو گیا ہے۔ کمانڈو شیروان نے مجھے گلے لگا لیا۔ دوسرے حریت پسند مجاہد کمانڈوز بھی وہاں آ گئے۔

جو مجاہد یہ خوش خبری لایا تھا وہ کہنے لگا۔

"میں بنگلے سے تھوڑی دور ایک اونچی جگہ پر درختوں میں چھپ کر بیٹھا بنگلے کو دیکھ رہا تھا۔ بریگیڈیئر کی فوجی گاڑی برآمدے کے سامنے کھڑی تھی۔ ٹھیک نو بجے اس کی گاڑی کے آگے پیچھے چلنے والی دوسری گاڑیاں بھی آ گئیں۔ ان میں فوجی باڈی گارڈ اور کمانڈوز بیٹھے تھے۔ بنگلے پر خاموشی چھائی تھی۔ میں نے سوچا کہ کچھ نہیں ہوگا۔ مجھے کچھ ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ پھر اچانک ایک دھماکہ ہوا اور میں نے بنگلے کے ایک حصے کی چھت کو اوپر اڑتے اور پھر ٹکڑے ٹکڑے ہوتے دیکھا۔ بنگلے کو آگ لگ گئی تھی۔ آگ کے شعلوں اور دھوئیں نے سارے بنگلے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ فوجی ایک انتشار کے عالم میں گھبرائے ہوئے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ کیونکہ مجھے یقین تھا کہ کشمیری مسلمانوں کے بدترین دشمن رام او تار کے پرخچے اڑ گئے ہوں گے۔ میں فوراً پہاڑی کی دوسری طرف اترا اور بھاگتا ہوا یہاں تک آپ کو یہ خوش خبری سنانے آیا ہوں۔"

میں نے اس مجاہد کو گلے لگا لیا اور شیروان کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا۔ شیروان نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"اللہ نے ہمارے مشن کو کامیابی عطا کی ہے دوست! مگر اب ہمیں یہ جگہ چھوڑنی ہو گی۔ خواہ کچھ وقت کے لئے ہی سہی"

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

کمانڈو شیروان کہنے لگا۔

بریگیڈیئر کی موت کے ساتھ ہی علاقے کی ملٹری پولیس اور خفیہ ایجنسیاں الرٹ ہو گئی ہوں گی اور ممکن ہے کہ وہ اس علاقے کو بھی گھیرے میں لے لیں۔"

کمانڈو شیروان نے ہاتھ بلند کر کے کشمیری زبان میں مجاہدین سے کچھ کہا۔ اس کے ساتھ ہی وہاں ایک ہل چل سی مچ گئی۔ ضروری سامان باندھا جانے لگا۔ کہیں سے چھ سات خچر آ گئے سامان ان پر لادا گیا۔ میں اور کمانڈو شیروان خچروں پر سوار ہو گئے اور دن کی روشنی میں ہمارا یہ مختصر سا قافلہ پہاڑی ڈھلانوں، گہری گھاٹیوں اور درختوں پر گھرے ہوئے پر پیچ راستوں سے ہوتا ہوا اپنے دوسرے ہائیڈ آؤٹ کی طرف چل پڑا۔ دوسرا ہائیڈ آؤٹ جنوب کی جانب پہاڑیوں کے اندر ایک غار میں تھا۔

دوسری طرف بریگیڈیئر رام او تار کی عبرت ناک موت پر آزادی کشمیر کی تمام تنظیموں اور مجاہدین میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ان کے عزائم اور حوصلے بلند ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی بھارتی فوجی یونٹیں بھی حرکت میں آ گئیں۔ انہوں نے تلاشی کے بہانے مسلمان کشمیریوں کے گھروں کو آگ لگائی اور ذرا سی مزاحمت پر کشمیری جوانوں پر اندھا دھند گولیاں برسانی شروع کر دیں۔ یہ سارا ملٹری آپریشن سری نگر کی ملٹری انٹیلی جینس کے چیف کیپٹن چوپڑہ کی قیادت میں ہو رہا تھا۔ وہ خود کشمیریوں کے گھروں میں گھس جاتا۔ عورتوں کی بے حرمتی کرتا اور جو نوجوان کشمیری سامنے آتا اس کو پستول کے فائر سے شہید کر دیتا۔ کیپٹن چوپڑہ نے مسلم کش بریگیڈیئر رام او تار کو بھی ظلم و ستم میں پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ جب یہ اطلاعات ہمیں ملیں تو میں نے کمانڈو شیروان سے کہا۔

"چاہے کچھ ہو جائے میں اس درندے کیپٹن چوپڑہ کو نہیں چھوڑوں گا۔"

کمانڈو شیروان خود انتہائی غیض و غضب کے عالم میں تھا۔ اس نے دیوار سے لٹکی ہوئی اپنی سٹین گن اتاری اور غار سے باہر جاتے ہوئے کہا۔

"میرے ساتھ آؤ"

میں نے بھی اپنی سٹین گن اٹھا لی تھی۔ اس وقت دوپہر کا ایک بج رہا تھا۔ ہم دونوں کمانڈو وردیوں میں تھے۔ ہم نے ایک کوٹھڑی میں گھس کر کشمیری مزدوروں والا لباس پہنا۔ سٹین گنیں اپنی لمبی عباؤں کے اندر چھپا لیں۔ اور خفیہ پہاڑی راستوں میں چل پڑے۔ میں نے شیروان سے پوچھا۔

"اس وقت کیپٹن چوپڑہ تمہارے خیال میں کہاں ہو گا؟"

شیروان نے کہا۔

"وہ جہاں بھی ہو گا آج ہم اسے موت کے گھاٹ اتار کر ہی آئیں گے۔"

پہاڑی علاقے سے نکلنے کے بعد ہم ایک چھوٹی سی بستی کی طرف کھیتوں میں چلنے لگے۔ کمانڈو شیروان کو معلوم تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ بستی کے باہر کھیت میں ایک کشمیری کسان کام کرتا نظر آیا۔ شیروان اس کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ میں اس کے پہلو میں موجود تھا۔ کشمیری کسان نے کمانڈو شیروان کو پہچان لیا تھا۔ شیروان نے کشمیری زبان میں اس سے کچھ باتیں کیں اور مجھے لے کر بستی سے ہٹ کر ایک طرف چل پڑا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"کیا باتیں ہوئی تھیں؟"

وہ بولا۔

"اس وقت کیپٹن چوپڑہ شہر کے ایک محلے میں مسلمانوں کے گھروں کی تلاشیاں لے رہا ہے۔"

کمانڈو شیروان سری نگر شہر کا رہنے والا تھا۔ اسے شہر کی ایک ایک گلی' ایک ایک مکان کا علم تھا۔ ایک جگہ سے ہم نے دریا کا پل عبور کیا۔ اوپر دائیں جانب کچھ فاصلے پر ہمیں فوجی جیپ اور تین فوجی کھڑے نظر آئے۔ شیروان رک گیا۔

"یہاں مولوی اسلام الدین کا گھر ہے۔ مولوی صاحب کشمیری مجاہدین کے زبردست حامی ہیں کیپٹن چوپڑہ ضرور ان کے گھر میں تلاشی لے رہا ہو گا۔ وہ مولوی صاحب کو اور اس اہل خانہ کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ میرے ساتھ آؤ۔"

ہم کشمیری مزدوروں کے بھیس میں تھے۔ ایسے مزدور سری نگر شہر کے اندر اور باہر ہر جگہ محنت مشقت کرتے نظر آجاتے تھے۔ شیروان اوپر سے ہو کر ایک گلی میں گھس گیا۔ میں اس کے ساتھ تھا۔ ہم ایک مکان کے پاس آکر ٹھہر گئے۔ شیروان نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک بزرگ کشمیری نے دروازہ کھول کر شیروان کو دیکھا تو فوراً پہچان گیا اور ہم دونوں کو

اندر لے گیا۔

شیروان اس بزرگ سے بھی کشمیری زبان میں گفتگو کرنے لگا۔ مختصر سی گفتگو کے بعد ہم سیڑھیاں چڑھ کر مکان کی دوسری منزل کی عقبی گیلری میں آگئے۔ یہاں سے دوسرے اور پھر تیسرے مکان کی گیلری میں اتر گئے۔ نیچے برساتی نالہ بہہ رہا تھا۔ ہم لکڑی کے پل پر ایک طرف سے اتر گئے اور نالہ پار کر کے ایک اور تنگ گلی میں پہنچ گئے۔ اسی گلی میں ہمیں کچھ بھارتی فوجی ایک مکان کے باہر کھڑے نظر آئے شیروان نے مجھے آہستہ سے کہا۔

"یہ مولوی اسلام الدین کا مکان ہے۔ ہمیں جو کچھ کرنا ہے اسی جگہ کرنا ہے۔ کیا تم مرنے کے لئے تیار ہو؟ کیونکہ مجھے نہیں یقین کہ ہم کشمیریوں کے دشمن بھیڑیئے کیپٹن چوپڑہ کو ہلاک کرنے کے بعد یہاں سے زندہ بچ کر نکل سکیں گے۔"

میں نے کہا۔

"شیروان! شہادت کی موت تو اللہ کسی کسی کو نصیب کرتا ہے۔ ایسی بات پھر نہ کہنا"

ہم نے کوئی سکیم نہیں بنائی تھی۔ کوئی منصوبہ نہیں بنایا تھا۔ کوئی کمانڈو آپریشن تیار نہیں کیا تھا۔ کشمیری مسلمانوں پر کیئے جانے والے مظالم کے خلاف سینہ تان کر جنگ کرنے کا ایک جذبہ تھا جو ہم دونوں کو خفیہ کمیں گاہ سے اٹھا کر یہاں کھلے میدان میں لے آیا تھا۔ ہم دشمن کے آمنے سامنے آگئے تھے۔ کوئی دوسرا کمانڈو اگر اس وقت ہمیں دیکھتا تو یہی کہتا کہ ہم بے عقل لوگ ہیں۔ ہم یقیناً مارے جائیں گے۔ لیکن ہمیں معلوم تھا کہ ہر جگہ عقل استعمال نہیں کی جاتی۔ کفار کے خلاف جہاد کرتے وقت عقل نہیں جذبہ کام آتا ہے۔ عقل تو حیران رہ جاتی ہے۔

کمانڈو شیروان نے وہی کیا جو میں چاہتا تھا۔ وہ مولوی صاحب کے گھر کے سامنے آگیا میں بھی اس کے ساتھ تھا۔ ساتھ والے مکان کے باہر تھڑے پر ایک بوڑھا کشمیری بیٹھا تھا۔ شیروان نے اس سے کوئی بات کی تو بوڑھا کشمیری جواب دینے کی بجائے گھر کے اندر چلا گیا۔ وہاں تین بھارتی فوجی رائفلیں لئے کھڑے تھے۔ مکان کے اندر سے عورتوں اور مردوں کے اونچی اونچی بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ پھر اچانک عورتوں کی چیخوں کی

آوازیں بلند ہوئیں۔ مجھے ایسے لگا جیسے یہ عورتیں محمد بن قاسم کو آواز دے رہی ہیں کہ اے اسلام کے زندہ جاوید مجاہد! کفار تمہاری مسلمان ماں بہنوں کی بے حرمتی کر رہے ہیں۔ کیا تو ہماری مدد کو نہیں پہنچے گا؟ میں نے بڑے دھماکے کئے تھے۔ یہ سارے دھماکے باہر ہوئے تھے۔ میرے اندر کوئی دھماکہ نہیں ہوا تھا۔ اس وقت کشمیری عورتوں کی چیخیں سن کر میرے اندر ایک دھماکہ ہوا۔ ایسا ہی دھماکہ کمانڈو شیروان کے اندر بھی ہوا تھا۔ ایک سیکنڈ کے لئے ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ عین اس وقت مکان کے آگے جو تین بھارتی فوجی کھڑے تھے ان میں سے ایک نے مجھے دھکا دے کر کہا۔

"تم ادھر کیوں کھڑا ہے۔"

میں نے اپنے گریبان کے اندر ہاتھ ڈال کر سٹین گن نکالی۔ اور برسٹ مار کر بھارتی فوجی کو گرا دیا۔ اس دوران کمانڈو شیروان کی سٹین گن کا برسٹ شعلے اگلتا دوسرے دو بھارتی فوجیوں کے جسموں کو چھلنی کر گیا۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی آناً فاناً ہو گیا کہ تینوں میں سے کسی ایک انڈین فوجی کو سنبھلنے کا موقع نہ مل سکا۔

فائرنگ کی آواز پر اندر سے دو فوجی دوڑتے ہوئے باہر نکلے۔ ہم ایک طرف اوٹ میں ہو گئے تھے۔ جیسے ہی وہ مکان کے باہر آئے ہم نے فائرنگ شروع کر دی۔ دونوں فوجی دوہرے ہو کر گر پڑے۔ ہم فائرنگ کرتے مکان کے اندر داخل ہو گئے۔ ہم نے اندر جاتے ہی اللہ اکبر کا فلک شگاف نعرہ بلند کیا۔ اندر مکان کے صحن میں ایک فوجی اور ایک کیپٹن ششدر سے ہو کر کھڑے تھے۔ فوجی سپاہی نے ایک عورت کو بالوں سے پکڑ رکھا تھا اور کیپٹن پستول ہاتھ میں لئے کھڑا تھا۔

یہ مکالمے بولنے، کسی سے کچھ پوچھنے، کسی کو للکارنے، کسی کو موت کی دھمکی دینے کا وقت نہیں تھا۔ ہم فائرنگ کرتے، گولیوں کے برسٹ بارش کی طرح برساتے صحن میں آ گئے۔ صحن میں آتے ہی میں نے چھلانگ لگا کر بھارتی کیپٹن کو جو یقیناً کیپٹن چوپڑہ ہی ہو سکتا تھا، نیچے گرا لیا۔ اس کے پستول سے دو گولیاں فائر ہوئیں۔ اس اثنا میں شیروان کی سٹین گن کا برسٹ اس بھارتی فوجی کے سینے میں سے گزر گیا تھا جس نے کشمیری خاتون کو

بالوں سے پکڑ رکھا تھا۔ وہ خون میں لت پت نیچے گرا پڑا تھا۔ کیپٹن چوپڑہ کے پستول نے میرے ساتھ فرش پر گرتے ہوئے پستول کے جو دو فائر کئے تھے۔ ان میں سے ایک فائر کی گولی میرے بازو کے قریب سے اور دوسری ذرا اوپر سے ہو کر نکل گئی تھی۔ یہ دونوں فائر کیپٹن چوپڑہ کی زندگی کے آخری فائر تھے۔ اس کے بعد اس کی گردن کی ہنسلی ٹوٹ چکی تھی اور وہ بے جان ہو کر صحن میں پڑا تھا۔ عورتیں خوف زدہ بھی تھیں اور آزادی کشمیر کے پرجوش نعرے بھی لگا رہی تھیں۔

کمانڈو شیروان نے مجھ سے کہا۔

"گلی میں جاؤ۔ باہر جیپ کے پاس جو بھارتی فوجی کھڑے تھے وہ ضرور اندر آئیں گے۔"

میں دوڑ کر گلی میں آ گیا۔ سامنے گلی میں مجھے دونوں فوجی بھاگتے ہوئے اپنی طرف آتے نظر آئے۔ میں نے سٹین گن اپنے لمبے کرتے کے اندر چھپا لی تھی اور میرا ہاتھ اپنے کرتے کے گریبان میں سے سٹین گن پر تھا۔ جیسے ہی بھارتی فوجی قریب آئے۔ میں نے سٹین گن باہر نکالی اور ان پر برسٹ فائر کرنے شروع کر دیئے۔ ان کے پاس رائفلیں تھیں۔ انہیں رائفلیں فائر کرنے کی موت نے مہلت نہ دی۔ گھروں سے کشمیری نوجوان باہر نکل آئے۔ کمانڈو شیروان بھی وہاں آ گیا۔ سب نے مل کر بھارتی فوجیوں کی لاشوں کو گھسیٹ کر ایک جگہ اکٹھا کر دیا۔ ان میں کیپٹن چوپڑہ کی لاش بھی تھی۔ کشمیری نوجوان انتہائی جوش کے عالم میں تھے اور اللہ اکبر، پاکستان زندہ باد، آزادی کشمیر زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے۔ کمانڈو شیروان نے کشمیری زبان میں انہیں کچھ سمجھایا اور ایک کشمیری نوجوان گھر میں سے پٹرول کا ڈبہ لے آیا۔ انہوں نے مرے ہوئے بھارتی فوجیوں کا اسلحہ اور میگزین اپنے قبضے میں کر لیا اور لاشوں پر پٹرول چھڑک کر آگ لگا دی۔ شیروان نے کہا۔

"یہاں سے نکلو چلو۔"

ہم نے سٹین گنیں دوبارہ اپنے لمبے کرتوں کے اندر چھپا لیں اور تیز تیز قدم چلتے گلی

سے باہر آگئے۔ ہم نے کئی آدمیوں اور نوجوان کشمیریوں کو گلی کی طرف جاتے دیکھا۔ گلی کے باہر فوجی جیپ اسی طرح کھڑی تھی۔ شیروان چھلانگ لگا کر جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ میں اس کے ساتھ والی سیٹ پر آگیا۔ اس نے جیپ سٹارٹ کی۔ اسے تیزی سے گھما کر واپس موڑا اور جیپ بستی کے مکانوں کے ساتھ ساتھ جاتی سڑک پر ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ راستے میں کچھ لوگوں نے ہمیں حیرانی کی نظروں سے دیکھا کہ دو کشمیری مزدور فوجی جیپ چلا رہے ہیں اور وہ بھی اتنی تیز۔ میں نے شیروان سے کہا۔

"ہمیں یہ جیپ چھوڑ دینی چاہئے؟"

اس نے کہا۔

"ابھی نہیں"

جیپ سری نگر شہر سے جب کافی باہر نکل آئی اور کھیت شروع ہو گئے تو شیروان نے اسے ایک میدان میں ڈال دیا۔ جیپ اچھلتی رہی اور میدان سے نکل گئی۔ آگے ایک کچی سڑک آگئی جس کی دونوں جانب چناروں کے اونچے اونچے درخت تھے۔ کافی دور تک جیپ کچے راستے پر دوڑتی اور گرد اڑاتی بھاگتی گئی۔ ہمارے آس پاس کوئی آبادی کوئی بستی نہیں تھی۔ شیروان نے رفتار آہستہ کر دی اور اسے گھما کر ایک جگہ نشیب میں اتار دیا۔ اس نے جیپ کی پٹرول کی ٹنکی کا ڈھکن کھول کر اپنا رومال اس کے اندر ڈال کر پٹرول سے تر کیا اور اس کا فیتہ بنا کر اس کے سرے کو آگ لگا دی اور بولا۔

"بھاگو"

ہم دوڑ کر گڑھے سے باہر نکل آئے۔ اس کے ساتھ ہی دھماکہ ہوا اور جیپ آگ کے شعلوں میں دھڑا دھڑ جل رہی تھی۔

"ہم اس طرف جائیں گے"

شیروان ایک طرف تیز تیز چلنے لگا۔ میں اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ ہم سیبوں کے ایک باغ میں سے گزرے جن کے درختوں پر پھول آرہے تھے۔ اس کے آگے زعفران کے کھیت آگئے۔ ہم ان میں سے بھی گزر گئے۔ ہم کشمیری کسان مزدوروں والے بھیس

میں تھے۔ ہماری طرف کسی نے توجہ نہ دی۔ کچھ دیر میدانوں کھیتوں اور اونچی نیچی گھاٹیوں میں چلتے رہنے کے بعد نیم پہاڑی سلسلہ شروع ہو گیا۔ میں نے شیروان سے پوچھا۔

"ان لوگوں نے بھارتی فوجیوں کی لاشوں کو آگ لگا دی تھی۔ انہیں چاہئے تھا کہ لاشوں کو گڑھے کھود کر دبا دیتے۔"

شیروان بولا۔

"دور سے آگ دیکھ کر ادھر سے گزرتے ہوئے بھارتی فوجی یہی سمجھیں گے کہ کشمیریوں کے مکان جل رہے ہیں۔ یہاں اس طرح آگیں لگتی ہی رہتی ہیں"

"میرا خیال ہے ہم اپنے نئے ہائیڈ آؤٹ سے کافی دور آگئے ہوئے ہیں"

"میں جان بوجھ کر لمبے راستے سے آیا ہوں۔"

کمانڈو شیروان نے سامنے والے ٹیلے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ہم اس ٹیلے کے پہلو سے نکل کر جھاڑیوں میں سے گزر رہے تھے کہ اچانک ہمیں کسی عورت کے رونے کی آواز سنائی دی۔ ہم رک گئے۔ آواز جھاڑیوں کے پیچھے سے آرہی تھی۔ میں نے شیروان سے کہا۔

"یہ عورت کیوں رو رہی ہے؟"

"ابھی معلوم کرتے ہیں"

ہم جدھر سے رونے کی آواز آرہی تھی اس طرف جھاڑیاں ہٹا کر چلے۔ جھاڑیوں کی دوسری جانب ہم نے ایک آٹھ دس سال کے لڑکے کو ایک جگہ زمین پر بیٹھے روتے دیکھا۔ وہ سسکیاں بھر کر رو رہا تھا۔ ہم اسے عورت سمجھے تھے۔ شیروان اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا اس نے کشمیری زبان میں اس سے پوچھا کہ وہ کیوں رو رہا ہے۔ لڑکے نے اپنے سامنے دو کشمیری کسانوں کو دیکھا تو روتے ہوئے ایک طرف اشارہ کر کے کشمیری زبان میں کچھ کہنے لگا۔ شیروان اس کو سوال کرتا اور وہ روتے ہوئے اسی جانب اشارہ کرتا۔ میں نے شیروان سے پوچھا۔

"کیا بات ہے کمانڈر؟ یہ لڑکا رو کیوں رہا ہے؟"

کمانڈو شیروان اٹھ کر مجھ سے بولا۔

"لگتا ہے قدرت آج ہم سے بہت کام لینا چاہتی ہے۔"

اس نے کشمیری لڑکے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کشمیری زبان میں کچھ کہا۔ لڑکے نے رونا بند کر دیا اور جس طرف سے ہم آ رہے تھے اس طرف دوڑ کر جھاڑیوں میں ہماری نظروں سے اوجھل گیا۔ میں نے شیروان سے پوچھا۔

"بات کیا ہے دوست؟"

اس نے اپنے کرتے کے اندر سے سٹین گن نکال لی اور اس کے میگزین کو چیک کرتے ہوئے بولا۔

"تم گن کو چیک کرو۔ میری گن میں تو شاید ایک ہی راؤنڈ رہ گیا ہے۔"

میں نے اپنی گن کا میگزین چیک کیا۔ میرا میگزین چیمبر خالی ہو چکا تھا۔ میں نے کہا۔

"میری گن تو خالی ہے"

کمانڈو شیروان بولا۔

"میری گن میں ایک راؤنڈ ہے۔ میرے ساتھ آؤ۔ ہمیں ان درختوں کی طرف جانا ہے"

معلوم ہوا کہ آگے ناشپاتیوں کا ایک باغ تھا۔ یہ لڑکا اپنی جوان بہن کے ساتھ باغ میں سے گزر رہا تھا کہ دو بھارتی فوجی وہاں کسی طرف سے نکل آئے۔ انہوں نے لڑکے کو مار پیٹ کر بھگا دیا اور خود اس کی بہن کو اٹھا کر لے گئے۔ میں نے کہا۔

"وہ لڑکی کو کہاں لے گئے ہوں گے؟"

"باغ کے آس پاس ہی کہیں ہوں گے ہمیں جلدی کرنی چاہیے"

ہم نے دوڑنا شروع کر دیا۔ ناشپاتیوں کا باغ آ گیا باغ کی دوسری طرف آئے تو کچھ فاصلے پر ایک کوٹھڑی دکھائی دی۔ یہ لکڑی کی کوٹھڑی تھی جس کی ڈھلوان چھت پر گھاس پھوس ڈال دیا گیا تھا۔ شیروان نے کوٹھڑی کو گھور کر دیکھتے ہوئے کہا۔

"بھارتی درندے لڑکی کو ضرور اس کوٹھڑی میں لے گئے ہوں گے۔ میں اس طرف

سے جاتا ہوں۔ تم دوسری طرف سے آؤ۔"

میں دوڑ کر کوٹھڑی کے عقب میں آ گیا۔ یہاں کوڑا کرکٹ بکھرا ہوا تھا۔ اچانک کوٹھڑی میں سے لڑکی کے چیخنے اور کشمیری زبان میں فریاد کرنے کی آواز آئی۔ وہ بار بار اللہ خدایا کہہ رہی تھی۔ میں گھوم کر کوٹھڑی کے دروازے کی طرف آیا تو میں نے کمانڈو شیروان کو دیکھا۔ وہ ایک دیوار کے ساتھ لگا آہستہ آہستہ کوٹھڑی کے بند دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

میں وہیں رک گیا۔ میرے ہاتھوں میں سٹین گن ضرور تھی مگر وہ خالی تھی۔ اندر سے لڑکی کے چیخنے چلانے کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے آپ کو کسی کی گرفت سے آزاد کرانے کی کوشش کر رہی ہے۔ اتنے میں ایک مرد نے ڈوگری زبان میں لڑکی کو گالی دی۔

یہ کوئی ڈوگرہ سپاہی تھا۔ کمانڈو شیروان نے زور سے بند دروازے کو لات ماری اور فوجیوں کے لہجے میں ڈوگری زبان میں کہا۔

"دروازہ کھولو جانگلی! نہیں تو ہم گرنیڈ مارے گا"

"کون ہو تم؟"

اندر سے دوسرے ڈوگرہ سپاہی نے چلا کر پوچھا۔ شیروان نے اسی کرخت لہجے میں چلا کر کہا۔

"ہم تمہارا آفیسر کمانڈنگ بول رہا ہے جانگلی تم اپنے اوسی کو بھی نہیں پہچانتا۔ دروازہ کھولو نہیں تو ہم گرنیڈ چلا دے گا"

جلدی سے کسی نے کنڈی اتاری اور دروازہ کھول دیا۔ سامنے ایک ڈوگرہ فوجی سپاہی کھڑا تھا۔ شیروان نے چیتے کی طرح لپک کر اس کو گردن سے پکڑ کر باہر کھینچ لیا۔ میں تو آگے بالکل تیار تھا۔ ڈوگرہ سپاہی مجھ سے ٹکرا گیا۔ میں نے اس کی گردن اپنے بازو میں لے کر زور سے اوپر کی طرف جھٹکا دیا۔ وہ بے جان ہو کر نیچے گرا۔ اس دوران کمانڈو شیروان نے کوٹھڑی میں گھس کر دوسرے بھارتی ڈوگرہ سپاہی کے بدن میں سٹین گن کا

برسٹ فائر کر کے میگزین کی آخری چھ سات گولیاں پار کر دی تھیں۔ ہم نے اس روشنی میں ایک کشمیری لڑکی کو دیکھا جو کونے میں دبکی خوف کے مارے کانپتے ہوئے رو رہی تھی۔ شیروان نے اسے بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور کشمیری زبان میں کچھ کہا۔ لڑکی نے رونا بند کر دیا۔ ہم نے دوسرے ڈوگرے کی لاش کو بھی گھسیٹ کر کوٹھڑی میں ڈال دیا۔ ان دونوں کی رائفلیں ایک طرف دیوار کے ساتھ لگی ہوئی تھیں۔ شیروان مجھ سے کہنے لگا۔

"تم یہاں ٹھہرو۔ میں اس لڑکی کو اس کے بھائی کے حوالے کر کے آتا ہوں"

لڑکی حیران ہو کر ہم دونوں کو بار بار دیکھ رہی تھی۔ کمانڈو شیروان لڑکی کو ساتھ لے کر ناشپاتی کے باغ کی طرف چل دیا۔ میں نے دونوں ڈوگرہ فوجیوں کے چہروں کو جھک کر دیکھا۔ دونوں مر چکے تھے۔ جس سپاہی کی گردن کا منکا میں نے جھٹکے سے توڑ دیا تھا اس کا منہ کھلا ہوا تھا۔ جس پر شیروان نے سٹین گن کا برسٹ مارا تھا۔ اس کی چھاتی ایک طرف سے کھل گئی تھی اور خون ابل ابل کر باہر آ رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد کمانڈو شیروان واپس آ گیا۔ کہنے لگا۔

"لڑکا اپنی بہن کو لے کر گاؤں کی طرف چلا گیا ہے۔ ہمیں بھی اپنے ہائیڈ آؤٹ پہنچنا چاہئے۔"

ہم نے ڈوگرہ فوجیوں کی لاشوں کو وہیں رہنے دیا اور کوٹھڑی کا دروازہ بند کر کے اپنے ہائیڈ آؤٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔ اسی شام کو وہ آدمی بھی آ گیا جس کو کمانڈو شیروان نے نہر انٹیروگیشن سنٹر کی تفصیلات معلوم کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ اس نے جو تفصیلات بتائیں ان کے مطابق یہ انٹیروگیشن سنٹر جموں شہر میں ایک نہر کے کنارے پر واقع تھا۔ اس کی چار دیواری پتھروں کو جوڑ کر بنائی گئی تھی۔ دیوار کے اوپر لوہے کی خاردار تار لگی ہوئی تھی۔ رات کے وقت دیوار کے اوپر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر لگی ہوئی بجلی کی بتیاں جلتی تھیں۔ اس کا ایک ہی بڑا گیٹ تھا جو دن کے وقت کھلتا تھا۔ رات کو بند رہتا تھا۔ شہر کے جس علاقے میں یہ سنٹر قائم تھا وہ جموں کے ہندوؤں کا علاقہ تھا۔ چونکہ اس انٹیروگیشن سنٹر میں صرف مسلمان کشمیری مجاہدین کو پوچھ گچھ اور تشدد کے

لئے پکڑ کر لایا جاتا تھا اس لئے حکومت اس علاقے کو اپنے لئے محفوظ سمجھتی تھی۔ کیونکہ اگر انٹیروگیشن سنٹر سے کوئی مسلمان کشمیری مجاہد فرار بھی ہو جائے تو اسے اردگرد کے ہندو پکڑ کر پولیس یا فوج کے حوالے کر دیں گے۔ کیونکہ جموں کے ہندو کشمیری مسلمانوں کے دشمن تھے اور کوئی ہندو کسی مسلمان مجاہد کو اپنے ہاں پناہ نہیں دے سکتا تھا۔ اپنے آدمی نے بتایا۔

"اس انٹیروگیشن سنٹر میں اس وقت گیارہ کشمیری مسلمان اذیتیں برداشت کر رہے ہیں ان میں دلی سے پکڑ کر لایا گیا گل خان نام کا آدمی بھی ہے جس کو وہاں کے لوگ پاکستان کا جاسوس سمجھتے ہیں۔"

میرے لئے یہ معلومات بہت کافی تھیں۔ اپنا سراغ رساں مجاہد جب چلا گیا تو میں نے شیروان سے پوچھا۔

"جموں شہر میں مجھے کوئی ایسا خفیہ ٹھکانہ چاہئے جس کو میں وہاں اپنا ہائیڈ آؤٹ بناؤں۔ کسی طریقے سے خود انٹیروگیشن سنٹر کے آس پاس گھوم پھر کر اس کا جائزہ لوں اور کوئی منصوبہ بنا سکوں۔ کیا ہمارا وہاں کوئی ایسا آدمی ہے جس پر ہم اعتماد کر سکیں اور جو مجھے اپنے ہاں ٹھہرا بھی سکے؟"

کمانڈو شیروان کہنے لگا۔

"جموں تو کیا یوں تو ہر مسلمان ہمارا اپنا آدمی ہے۔ وہ ہماری تحریک آزادی کشمیر کا زبردست حامی ہے اور ہماری خاطر ہر قسم کی قربانی دے سکتا ہے۔ لیکن جس طرح کا تمہیں آدمی چاہئے اس کے بارے میں مجھے غور کرنے کا موقع دو۔ میں تمہیں کل بتاؤں گا۔ اپنے آدمی وہاں موجود ہیں جو ہماری تحریک آزادی کے لئے کام کر رہے ہیں لیکن مجھے ان میں سے کسی ایک آدمی کا انتخاب کرنا ہے۔ میں تمہیں کل بتاؤں گا"

رات کو ہم عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد نئے ہائیڈ آؤٹ کے چھوٹے سے غار میں موم بتی روشن کر کے بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ اپنے ایک مجاہد نے آ کر بتایا کہ ملٹری پولیس نے ٹل والے جیا لعل اور اس کی بیوی پدماوتی کو بریگیڈیئر رام او تار کے قتل کے سلسلے میں

گرفتار کر کے لے گئی ہے۔ کمانڈو شیروان نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا۔

"پدماوتی بڑی چالاک عورت ہے۔ وہ مردوں کے جذبات سے کھیلنا جانتی ہے وہ بچ جائے گی بلکہ بہت ممکن ہے کہ تفتیش کرنے والے فوجی افسر کو بھی اپنی زلف گرہ گیر کا اسیر بنا لے"

اس مجاہد نے یہ بھی بتایا کہ رام بن والی بستی پر سکون ہے۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں ہم نے کیپٹن چوپڑہ سمیت سات بھارتی فوجیوں کو ہلاک کر دیا تھا اور محلے کے مسلمانوں نے ان کی لاشوں پر پٹرول چھڑک کر آگ لگا دی تھی۔ مجاہد کہنے لگا۔

"فوج کیپٹن چوپڑہ اور اس کے ساتھی فوجیوں کو شہر میں اور شہر سے باہر تلاش کرتی پھر رہی ہے۔ مگر ابھی تک وہ سری نگر کے کسی بھی علاقے کا نشان نہیں لگا سکے کہ کیپٹن چوپڑہ اپنی پارٹی کے ساتھ اس علاقے میں گیا تھا۔"

اب میرا ٹارگٹ جموں شہر کا بدنام ترین انٹیروگیشن سنٹر تھا جہاں گل خان دوسرے کشمیری مجاہدین کے ساتھ بھارتی درندوں کے جبرو تشدد کا نشانہ بنا ہوا تھا۔ مجھے جموں شہر میں اپنے کسی بااعتماد ساتھی کی ضرورت تھی جہاں سے میں ٹیک آف کر کے نہرانٹیروگیشن سنٹر پر اٹیک کر سکوں۔ شیروان نے کسی ایسے بااعتماد ساتھی کی نشان دہی کے لئے مجھے صبح بتانے کا کہا تھا جو اس آپریشن میں میری مدد کر سکتا تھا۔ اگلے دن صبح کی نماز کے بعد کمانڈو شیروان نے مجھے کہا۔

"میرے ساتھ آؤ"

ہم غار میں جا کر بیٹھ گئے۔ کہنے لگا۔

"میں نے ایک آدمی کا سوچا ہے جو جموں میں تمہاری مدد کر سکے گا۔ ہمارے سارے ساتھی بااعتماد ہیں لیکن اس خاص آدمی کے وسائل زیادہ ہیں۔ میں نے رات اسے خفیہ ٹرانسمیٹر کے ذریعے تمہارے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔"

میں نے پوچھا۔

"اس کا نام کیا ہے اور وہ مجھے جموں میں کہاں ملے گا؟"

کمانڈو شیروان نے مجھے اس آدمی کا نام اور ایڈریس بتایا۔ میں اس مجاہد کا نام اور ایڈریس آپ کو نہیں بتاؤں گا کیونکہ کشمیر ابھی آزاد نہیں ہوا۔ مجاہدین کی جدوجہد جاری ہے۔ میں اس کا ایک فرضی نام رکھ لیتا ہوں۔ جس طرح میں نے گل خان اور پروفیسر جمشید کے فرضی نام رکھے ہوئے ہیں۔ میں اس آدمی کا نام غلام رسول رکھ لیتا ہوں۔ غلام رسول جموں میں کیا کام کرتا تھا؟ میں یہ بھی آپ کو نہیں بتاؤں گا۔ بس آپ یوں سمجھ لیں کہ اس کی فرنیچر کی چھوٹی سی دکان تھی۔ میں اس دکان کا محل وقوع بھی غلط لکھوں گا۔ کمانڈو شیروان نے مجھ سے کہا۔

"تم سادھوؤں والے حلیے میں وہاں نہیں جاؤ گے"

میں نے کہا۔

"اگر میں اپنے اصلی حلیے میں گیا تو امرتسر جیل سے بھاگے ہوئے پاکستانی جاسوس کی حیثیت سے پکڑ لیا جاؤں گا۔"

شیروان نے کہا۔

"تمہاری اپنی ڈاڑھی مونچھیں تھوڑی تھوڑی بڑھی ہوئی ہیں۔ تم انہیں ایسے ہی رکھو گے۔ کشمیری مزدوروں والے بھیس میں تم اس لئے نہیں جاؤ گے کہ تم کشمیری زبان میں بات چیت نہیں کر سکتے۔ فوراً پکڑ لئے جاؤ گے۔ کیونکہ جموں میں بھارت کی کئی خفیہ ایجنسیاں کام کر رہی ہیں اور انٹیلی جینس کے آدمی سفید کپڑوں میں جگہ جگہ موجود ہیں"

"تو پھر کیا میں عورت بن کر جاؤں گا؟"

میں نے مسکراتے ہوئے شیروان سے سوال کیا۔ وہ کہنے لگا۔

"میں چاہتا ہوں کہ تم عام پتلون قمیض میں جاؤ۔ تمہیں وہاں بازاروں میں آوارہ گردی کرنی نہیں۔ سیدھا اپنے مجاہد کے پاس پہنچنا ہے اور اس کے بعد وہ تمہیں چھپا لے گا۔ لوگوں کی نظروں سے بچنے کے لئے تم وہ رنگدار ٹکڑیوں والی ٹوپی پہن لینا جو جموں کے لوگ پہنتے ہیں۔ یہ ٹوپی جموں کے ڈوگرے بھی پہنتے ہیں۔"

میں نے ایسا ہی کیا۔ میرا پروگرام رات کے وقت سری نگر سے جموں کی طرف روانہ ہونے کا طے ہوا۔ میرا لباس یہ تھا۔ معمولی سی گیبرڈین کی پرانی پتلون۔ پرانے بوٹ۔ نائیلون کی میل خورے رنگ کی جیکٹ اور سر پر ڈوگروں والی ٹوپی۔ جسے میں نے اچھی طرح سے کانوں تک کھینچ کر سر پر جما لیا تھا۔ میں نے آئینہ دیکھا تو مجھے اپنی شکل بالکل احمقوں والی لگی۔ مجھے ایسی ہی شکل کی ضرورت تھی۔ کچھ روپے میرے پاس موجود تھے۔ دھماکہ خیز محلول والی شیشی میں نے کاغذ میں لپیٹ کر اپنے پاس رکھ لی تھی۔ اس کی کہیں بھی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ شیشی آدھی سے زیادہ ختم ہو چکی تھی لیکن اس میں ابھی اتنا محلول باقی تھا جو بھارتی فوج کی پوری پلاٹون کو دھماکے سے اڑا سکتا تھا۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ اگر راستے میں چیکنگ ہوئی اور مجھ سے شیشی کے بارے میں پوچھا گیا کہ اس میں کیا ہے تو میں کہہ دوں گا کہ میرے سر میں سکری ہے یہ سکری کی دوائی ہے جو میں رات کو سونے سے پہلے سر پر لگا لیتا ہوں۔

کمانڈو شیروان نے مجھے جموں والے اپنے مجاہد جس کا فرضی نام میں نے غلام رسول رکھا ہے اس کا پتہ ایک بار پھر سمجھایا اور کہنے لگا۔

"تم کل دن کے وقت جموں پہنچو گے۔ لاری سے اترتے ہی غلام رسول کی دکان کی طرف چل پڑنا۔ لاری اڈے پر زیادہ دیر بالکل نہ ٹھہرنا۔ وہاں سی آئی ڈی کے آدمی چل پھر رہے ہوتے ہیں اور وہ سری نگر جانے والی اور سری نگر سے آنے والی سواریوں کا پورا جائزہ لیتے ہیں۔ ذرا شک پڑ جائے تو اس کو حراست میں لے کر پوچھ گچھ شروع کر دیتے ہیں۔ ان سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ لاری سے اترتے ہی رکشا لے کر چل پڑو۔"

شروع رات کے اندھیرے میں کمانڈو شیروان نے اپنا ایک مجاہد میرے ساتھ کر دیا اور ہم پہاڑی راستوں پر چل پڑے۔ کوئی ایک ڈیڑھ گھنٹہ چلنے کے بعد سری نگر سے جموں جانے والی سڑک پر نکل آئے۔ مجاہد نے کہا۔

"یہاں سے آپ جموں جانے والی لاری میں سوار ہو جائیں گے۔ لاریاں سری نگر سے آتی ہیں۔ ہاتھ دینے سے کوئی نہ کوئی لاری ضرور ٹھہر جائے گی۔"

میں نے کہا۔

"تم فکر نہ کرو دوست! بے شک واپس چلے جاؤ۔"

وہ بولا۔

"میں ان درختوں کے پیچھے بیٹھنے لگا ہوں جب تم لاری میں سوار ہو جاؤ گے تو واپس چلا جاؤں گا۔ خدا حافظ!"

اور وہ سڑک سے اتر کر درختوں کے نیچے اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ سڑک پر کوئی روشنی نہیں تھی۔ میں نے ایک سفری تھیلا اٹھا رکھا تھا جس میں یونہی اپنے فالتو پرانے کپڑے ڈال رکھے تھے۔ ایک لاری کی ہیڈ لائیٹس نظر آئیں۔ میں نے ہاتھ دیا۔ لاری رکے بغیر نکل گئی۔ اس طرح دوسری لاری بھی نکل گئی۔ کوئی پون گھنٹے بعد ایک لاری کی روشنیاں قریب آئیں تو میں نے دونوں ہاتھ اٹھا کر اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ لاری ذرا آگے جا کر سڑک کی ایک جانب رک گئی۔ میں بھاگ کر اس میں سوار ہو گیا۔ لاری مسافروں سے بھری ہوئی تھی۔ کنڈیکٹر جموں کا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کہاں جاؤں گا۔ میں نے کہا۔

"جموں شہر"

اس نے پیسے لے کر مجھے ٹکٹ کاٹ کر دے دیا۔ میں وہیں لاری کے فرش پر بیٹھ گیا کیونکہ ساری نشستیں بھری ہوئی تھیں۔ میں سری نگر سے جموں تک اپنے سفر کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ کیونکہ راستے میں کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ جموں کے میدانوں میں جس وقت لاری پہنچی تو دوپہر ہو رہی تھی۔ شہر کے مکانوں اور مضافاتی بستیوں کا سلسلہ شروع ہوا تو میں لاری اڈے پر اترنے کی بجائے راستے میں ہی سڑک پر اتر گیا۔ کچھ دور سڑک پر چلنے کے بعد مجھے ایک خالی موٹر رکشا مل گیا۔ میں اس میں بیٹھ گیا اور شیروان نے مجاہد غلام رسول کا جو ایڈریس مجھے بتایا تھا ڈرائیور سے وہاں چلنے کو کہا۔ رکشا چل پڑا۔ شہر میں داخل ہونے کے بعد رکشا دریائے توی کے پل پر سے گزرنے کے بعد ایک بازار میں داخل ہو گیا۔ بازار میں آگے جا کر چھوٹا سا چوک آ گیا۔ رکشا والے نے

رکشا بجلی کے کھمبے کے پاس روک کر کہا کہ یہی وہ چوک ہے۔ میں اتر گیا۔ میں اس چوک کا نام نہیں لکھنا چاہتا۔ اگرچہ یہ چوک حقیقت میں وہ نہیں تھا جہاں ہمارے حریت پرست مجاہد کی فرنیچر کی دکان تھی۔ وہ کوئی اور علاقہ تھا۔ اور بازار تھا۔ اور اس کی فرنیچر کی دکان بھی نہیں تھی۔ وہ کوئی اور ہی کام کرتا تھا۔

قصہ مختصر کرتا ہوں۔ یوں سمجھ لیں کہ میں اپنے مجاہد غلام رسول کی دکان پر پہنچ گیا۔ اسے میرے آنے کی اطلاع خفیہ ریڈیو ٹرانسمیٹر پر کمانڈو شیروان نے پہلے سے دے دی ہوئی تھی اور اسے میرا حلیہ بھی بتا دیا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے ایک کوڈ جملہ بھی بتا دیا تھا جو مجھے غلام رسول کے آگے بولنا تھا۔ غلام رسول ایک پختہ عمر کا آدمی تھا۔ اس کی مختصر سی دکان تھی۔ جس وقت میں دکان میں داخل ہوا تو وہ ایک مزدور سے کرسی پر پالش کروا رہا تھا۔ دکان میں سپرٹ کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ غلام رسول نے گہری نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور مزدور سے کہا۔

"بس ٹھیک ہے۔ اب اسے سوکھنے کے لئے رہنے دو اور تم جاؤ۔"

مزدور ٹین کا ڈبہ اٹھا کر دکان سے باہر چلا گیا۔ جب وہاں صرف میں اور غلام رسول ہی رہ گئے تو غلام رسول نے پوچھا۔

"جی فرمائیے مہاشہ جی! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ ہمارے پاس زیادہ قیمتی فرنیچر تو نہیں ہے لیکن ہم اپنی نگرانی میں تیار کراتے ہیں اور یہ زیادہ دیر تک چلتا ہے۔"

اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔ وہ میرے کوڈ جملے کا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"جموں توی میں آج موسم خوشگوار رہے گا"

غلام رسول نے یہ سنتے ہی مجھے دکان کے پیچھے جانے کا اشارہ کیا۔ دکان کے پیچھے ایک چھوٹی سی کوٹھڑی تھی۔ کوٹھڑی میں ایک صف بچھی ہوئی تھی۔ چھت کے پاس پچھلی دیوار میں ایک روشندان تھا جس میں سے روشنی اندر آ رہی تھی۔ میں صف پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر گزری ہو گی کہ غلام رسول اندر آیا۔ وہ میرے سامنے بیٹھ گیا اور بولا۔

"تم پہلے کبھی جموں آئے ہو؟"

میں نے کہا۔

"دو ایک بار آیا ہوں مگر شہر کے گلی محلوں سے زیادہ واقفیت نہیں ہے"

اس نے اپنے سر کو کھجاتے ہوئے کہا۔

"پھر تمہیں شام کا اندھیرا ہونے تک اسی جگہ بیٹھنا پڑے گا۔ کیا تم انتظار کر لو گے؟"

میں نے کہا۔

"غلام رسول صاحب میں ساری رات یہاں بیٹھ کر آپ کا انتظار کر سکتا ہوں"

غلام رسول کے چہرے کی متانت میں کوئی فرق نہ آیا۔ کہنے لگا۔

"اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ تمہیں بھوک پیاس تو نہیں لگی؟"

میں نے کہا۔

"میں نے راستے میں کھا پی لیا تھا۔ کسی قسم کی کوئی حاجت نہیں ہے۔"

غلام رسول بولا۔

"ٹھیک ہے۔ تم آرام کرو"

وہ کوٹھڑی سے نکل گیا۔ باہر جا کر اس نے کوٹھڑی بند کر دی اور چٹخنی لگا دی۔ میں لیلا کچھ دیر بیٹھا رہا۔ پھر صف پر لیٹ گیا۔ عجیب بات ہے کہ مجھے نیند آ گئی۔ آنکھ اس تت کھلی جب غلام رسول میرے کندھے کو ہلا کر مجھے جگا رہا تھا۔

"اٹھو بھائی۔ رات ہو گئی ہے۔ تمہیں میرے ساتھ چلنا ہو گا۔ تم دکان سے پہلے نکل کر بائیں جانب جاؤ گے۔ بازار آگے جا کر دائیں جانب مڑ جاتا ہے۔ وہاں ایک کوڑے کرکٹ کا ڈپو ہے۔ تم اس کی دیوار کے پیچھے کھڑے ہو کر میرا انتظار کرو گے۔ ٹھیک ہے؟"

"بالکل ٹھیک ہے"

"تو پھر نکل جاؤ"

میں دکان سے نکل کر بازار میں آیا تو رات ہو چکی تھی۔ کئی دکانیں بند ہو چکی

تھیں۔ جو کھلی تھیں ان میں بجلی کے بلب جل رہے تھے۔ میں بازار میں ایک طرف ہو کر چلنے لگا۔ کچھ دور چلنے کے بعد بازار بائیں جانب گھوم گیا۔ وہاں کونے میں ایک فلتھ ڈپو کی دیوار بنی ہوئی تھی۔ میں دیوار کے پیچھے جا کر کھڑا ہو گیا۔ دو تین منٹ کے بعد دکان بند کر کے غلام رسول بھی آ گیا۔ وہ میری طرف دیکھے بغیر آگے نکل گیا۔ اس نے قریب سے گزرتے ہوئے صرف اتنا کہا۔

"سات قدم کا فاصلہ ڈال کر میرے پیچھے چلے آؤ"

میں نے ایسا ہی کیا۔ میری نظریں غلام رسول پر تھیں۔ یہ جموں شہر کا بڑا گنجان علاقہ تھا۔ تنگ بازار تھے۔ وہ ایک گلی میں داخل ہو گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے گلی میں داخل ہو گیا۔ کئی گلیوں میں سے ہو کر ایک کھلی جگہ آ گئی سامنے کچھ فاصلے پر سڑک پر بجلی کے کھمبوں پر بلب روشن تھے۔ غلام رسول ایک طرف اندھیرے میں کھڑا تھا۔ میں اس کے قریب آیا تو اس نے مجھے رکنے کو کہا۔

"وہ سامنے والی سڑک دیکھ رہے ہو؟"

"دیکھ رہا ہوں"

میں نے جواب دیا۔

غلام رسول کہنے لگا۔

"میں یہیں پر کھڑا ہوں۔ تم سڑک کی دوسری طرف چلے جاؤ۔ وہاں تمہیں آموں کا باغ ملے گا۔ اس باغ میں ایک پرانی بارہ دری کا کھنڈر ہے۔ اس کھنڈر میں میرا انتظار کرو۔ جاؤ"

ہم شاید شہر کی فصیل کے باہر آ گئے تھے۔ آگے ڈھلان تھی۔ میں ڈھلان اتر کر سڑک پر آ گیا۔ سڑک کو کراس کیا تو سامنے آموں کا ایک باغ تھا۔ بڑے گھنے درخت تھے۔ درختوں میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ میں درختوں میں بالکل سیدھ میں چلنے لگا۔ باغ جہاں ختم ہو جاتا تھا وہاں مجھے ایک چبوترہ دکھائی دیا جس کے اوپر بارہ دری سی بنی ہوئی تھی۔ میں بار دری کی دوسری جانب گرے ہوئے پتھروں پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر گزرنے کے بعد غلام رسول

بھی آ گیا وہ بھی میرے قریب بیٹھ گیا۔

کہنے لگا۔

"اس شہر میں ہمیں ایک ایک قدم بہت سوچ سمجھ کر اٹھانا پڑتا ہے۔ جموں میں بھارت کی ساری خفیہ ایجنسیوں کے آدمی موجود ہیں۔ مجھے شیروان نے تمہارے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔ اپنا جو آدمی یہاں سے نہرا انٹیروگیشن سنٹر کی معلومات لے کر تمہارے پاس گیا تھا اسے میں نے ہی سب کچھ بتایا تھا۔"

میں نے اس سے پوچھا۔

"کیا تمہیں یقین ہے کہ ہمارا ماسٹر سپائی گل خان اسی انٹیروگیشن سنٹر میں ہے؟"

ہم اندھیرے میں بیٹھے تھے۔ مگر ہمیں ایک دوسرے کے چہرے نظر آ رہے تھے۔ وہ کہنے لگا۔

"ہماری کوئی معلومات غلط نہیں معلوماتی۔ ہم سانپ کے منہ کے اندر جا کر اس کے پیٹ کا سارا حال معلوم کر آتے ہیں۔ گل خان اسی انٹیروگیشن سنٹر میں ہے۔ مگر اس کا وہاں سے فرار ہونا میرے حساب سے ایک ناممکن بات ہے بہرحال تم اپنی کوشش کر کے دیکھ لو۔"

میں نے نہرا انٹیروگیشن سنٹر کے بارے میں مزید پوچھا تو غلام رسول نے کہا۔

"شہر کے جنوب کی جانب ہندو آبادی والے علاقے کے اندر ہی ایک نہر بہتی ہے۔ یہ نہر توی دریا سے نکالی گئی ہے اور شہر کے باغوں اور کھیتوں کو سیراب کرتی ہے۔ اس نہر کے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر سات برج ہیں۔ پتھر کے یہ چھوٹے چھوٹے برج نہر کے پل کے اوپر بنائے گئے ہیں۔ یہ انٹیروگیشن سنٹر پانچویں برج کی ایک جانب پتھروں کی بنی ہوئی اونچی چار دیواری کے اندر ہے۔ باہر سے یہ کسی پرائمری سکول کی پرانی عمارت لگتی ہے لیکن اس کے نیچے زمین کے اندر تہہ خانے ہیں۔ ان تہہ خانوں میں سارا دن دلدوز انسانی چیخیں بلند ہوتی رہتی ہیں۔ یہ چیخیں ان کشمیری حریت پرستوں کی ہوتی ہیں جن پر ان تہہ خانوں میں تشدد کیا جا رہا ہوتا ہے۔ مگر ان چیخوں کی آوازیں تہہ خانوں سے باہر نہیں

آتیں۔ ان کی پہاڑ ایسی بھاری بھرکم دیواروں سے ٹکرا کر رہ جاتی ہیں گل خان کو بھی انہی تہہ خانوں میں سے ایک تہہ خانے میں رکھا گیا ہے۔"

"تمہارے خیال میں کیا کوئی ایسا ذریعہ ہے کہ میں ان تہہ خانوں میں جا سکوں؟"

غلام رسول خاموش نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔

"اس بارے میں بعد میں بات کریں گے۔ ابھی تم میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہیں اس جگہ لے چلتا ہوں جہاں تم روپوشی کی حالت میں رہو گے۔ آؤ۔"

وہ اٹھ کر سامنے کی طرف چلا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ اندھیرے میں مجھے دور ایک ٹیلہ سا دکھائی دیا۔ ہم بنجر میدان میں سے گزر رہے تھے۔ میرے جوتوں کے نیچے کنکر اور روڑے کچلے جا رہے تھے۔ چھوٹے چھوٹے جھاڑیوں کی طرح قد آدم درخت تھے جن کی ٹہنیاں پھیلی ہوئی تھیں اور چلتے وقت ہمیں منہ کے آگے سے ہاتھوں سے ہٹانی پڑتی تھیں۔ غلام رسول ٹیلے کے پاس آ کر اس کی دوسری طرف گھوم گیا۔ یہاں شروع رات کے اندھیرے میں کھلی جگہ نظر آئی جس کی ایک [illegible] ٹوٹے پھوٹے فرنیچر اور لکڑی کے کٹے ہوئے شہتیروں کا انبار لگا تھا۔ کھلی جگہ ہونے کی وجہ سے یہاں اندھیرا اتنا گہرا نہیں تھا۔ سامنے ایک کمرہ یا کیبن یا کوٹھڑی تھی جس کی چھت پر سے سرکنڈے نیچے لٹک رہے تھے۔

غلام رسول نے آگے بڑھ کر کوٹھڑی کے دروازے کا تالا کھولا۔ مجھے باہر رکنے کا اشارہ کر کے اندر گیا۔ اندر روشنی ہو گئی۔ اس نے لالٹین جلا دی تھی۔

"اندر آ جاؤ"

غلام رسول کی آواز پر میں بھی اندر چلا آیا۔

غلام رسول نے دروازہ بند کر دیا۔

کوٹھڑی میں لکڑی کا ایک بوسیدہ سا تخت پوش دیوار کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ لکڑی کا ایک سٹول اور لکڑی کی ایک کرسی بھی تھی جس پہ میں بیٹھا تو اس کی چولیں چرچرائیں۔ غلام رسول تخت پوش پر بیٹھ گیا۔ یہاں میں ایک وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ وضاحت تخت پوش کے لفظ کی ہے۔ اصل میں یہ لفظ صرف تخت ہے یعنی مجھے یہ لکھنا چاہیے تھا کہ دیوار کے ساتھ تخت لگا ہوا تھا۔ میں نے جان بوجھ کر تخت پوش لکھا ہے۔ لغوی معنوں میں تخت پوش اس چادر کو کہتے ہیں جو تخت کے اوپر بچھی ہوئی ہو۔ بات یہ ہے کہ میں الفاظ کے ذریعے ماحول کی نقشہ کشی کر رہا ہوں۔ الفاظ میرا ایک وسیلہ ہیں جن کی مدد سے میں آپ کی آنکھوں کے سامنے وہ چیزیں لا کر دکھا رہا ہوں جن چیزوں نے وہاں کا ماحول بنایا ہوا تھا۔ جب میں تخت لکھوں گا تو لامحالہ آپ کا خیال بادشاہ کے تخت کی طرف چلا جائے گا اور آپ کی آنکھوں کے سامنے فوراً بادشاہ کا تخت آ جائے گا۔ لیکن جب میں تخت پوش لکھوں گا تو آپ کے تصور میں چار پاؤں والا وہ تختہ آ جائے گا جو ہمارے پنجاب میں گھروں کی ڈیوڑھیوں یا مکان کے باہر گلی میں بچھا ہوا دیکھا جا سکتا ہے۔ اس لئے میں نے تخت پوش لکھا ہے اور آگے بھی تخت پوش ہی لکھوں گا تا کہ حقیقت نگاری میں کوئی فرق نہ آئے۔

غلام رسول کہنے لگا۔

"تم یہاں رہو گے۔ جتنے دن بھی رہنا ہو گا اس کوٹھڑی میں رہو گے۔ صرف کمانڈو

آپریشن کے لئے باہر نکلو گے۔ تم نے اگرچہ اپنا حلیہ بدلنے کی کوشش کی ہوئی ہے مگر میں تمہیں دیکھتے ہی پہچان گیا تھا کہ تم وہی کمانڈو ہو جو امرتسر کی جیل توڑ کر مفرور ہوا ہے۔ کیونکہ میں نے جموں کے اخباروں میں چھپی ہوئی تمہاری تصویر دیکھ لی تھی۔ تم بڑے خوش قسمت ہو کہ سری نگر سے جموں تک خیریت سے آگئے ہو اور تمہیں خفیہ ایجنسی کے کسی آدمی نے نہیں پکڑا۔"

میں نے اپنی ٹھوڑی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"میں نے ڈاڑھی رکھنے کا فیصلہ کرلیا ہے پھر میں آسانی سے نہیں پہچانا جاسکوں گا"

"اس لئے تو میں نے تمہیں کہا ہے کہ یہاں سے کم از کم دن کے وقت باہر مت نکلنا۔ تمہیں تمہاری ضرورت کی ہر شے یہاں پہنچ جائے گی۔ اب تم بیٹھو میں تمہارے لئے کھانے پینے کی چیزیں اور کچھ دوسرا سامان لاتا ہوں۔ یہاں کوئی غسل خانہ وغیرہ نہیں ہے۔ لیکن چند قدموں کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا نالہ بہتا ہے۔ اس کا پانی پاک صاف ہے اور جموں والی نہر میں سے نکل کر آتا ہے۔ تم اندھیرے میں وہاں جا کر منہ ہاتھ دھو سکتے ہو اور اس کا پانی بھی پی سکتے ہو۔ اگر تمہیں سگریٹ پینے کی عادت ہے تو جتنے دن اس کوٹھڑی میں قیام کرو گے تمہیں سگریٹ کو ہاتھ بھی نہیں لگانا ہوگا۔ کیونکہ تمباکو کی بو چاروں طرف پھیل جاتی ہے اور بھارتی خفیہ ایجنسیوں کے جاسوس کسان اور مزدوروں کے حلیے میں ان علاقوں سے اکثر گزرتے رہتے ہیں۔ میرے ساتھ آؤ۔ پہلے میں تمہیں پہاڑی نالہ دکھا لاؤں"

یہ نالہ کوٹھڑی والے ٹیلے سے بمشکل پچیس تیس قدموں کے فاصلے پر درختوں کے درمیان ذرا نشیب میں بہہ رہا تھا۔ رات کے اندھیرے میں مجھے اس کا پانی ایک دھندلی چوڑی لکیر کی طرح نظر آیا۔ غلام رسول بولا۔

"یہاں آتے وقت بھی اور جاتے وقت بھی تمہیں بے حد ہوشیار اور چوکس رہنا ہو گا۔ تم یہی سمجھنا کہ سی آئی ڈی والا کوئی نہ کوئی آدمی تمہاری تلاش میں اردگرد موجود ہے۔ واپس آجاؤ اب۔"

وہ مجھے کوٹھڑی میں لے آیا۔ اس نے لالٹین کی بتی نیچی کر دی اور دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔

"میں باہر سے تالا لگا کر نہیں جاؤں گا۔ تالا کنجی سمیت میں نے تمہارے تخت پوش پر رکھ دیا ہے۔ اگر تمہیں پانی پینے کے لئے نالے پر جانا ہو تو کوٹھڑی کو تالا لگا کر جانا۔ بلکہ لالٹین بھی بجھا کر جانا۔ یہ لو ماچس۔ یہ اپنے پاس رکھو۔ اب میں جاتا ہوں۔ میں زیادہ دیر نہیں لگاؤں گا۔"

اس نے ماچس صدری کی جیب میں سے نکال کر مجھے دی اور چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں دروازہ بند کر کے تخت پوش پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ واقعی مجھے یہاں کافی مشکل مرحلوں سے واسطہ پڑنے والا ہے۔ مگر میں گھبرانے والے دن پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ بلکہ جتنا مشکل کمانڈو آپریشن ہوتا تھا مجھے اتنی ہی لذت ملتی تھی۔ اس کی وجہ ایک تو یہ تھی کہ میرا ہر کمانڈو آپریشن اللہ اور اس کے رسول پاک ﷺ کی خوشنودی کے لئے ہوتا تھا۔ اور مجھے اپنے اللہ پر بھروسہ تھا اور میرا ایمان تب بھی تھا اور اب بھی ہے کہ زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اگر میری موت اللہ نے نہیں لکھی تو دنیا کی بڑی سے بڑی توپ مجھ پر فائر کر دو۔ میرے اوپر دستی بموں کا پورا بکس پھینک دو میں نہیں مروں گا۔ لیکن اگر اللہ کے حکم سے میری موت کا وقت آن پہنچا ہے تو مجھے امریکہ کے بڑے سے بڑے ہسپتال میں لے جاؤ۔ وہاں دس دس ہزار روپے کا انجکشن لگا لو۔ مجھے ہر وقت آکسیجن دیتے رہو مگر میں زندہ نہیں بچوں گا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ کمانڈو ٹریننگ سے پہلے بھی میری طبیعت خطرات پسند ہوا کرتی تھی۔ اور جس ایڈونچر میں زیادہ رکاوٹیں ہوتی تھیں میں اس ایڈونچر میں بڑا خوش رہتا تھا۔

میری کلائی پر گھڑی بندھی ہوئی تھی جس کی چمکدار سوئیاں رات کے اندھیرے میں بھی وقت بتا دیتی تھیں۔ میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ غلام رسول کو گئے آدھا گھنٹہ گزر گیا تھا۔ وہ کوئی ایک گھنٹے بعد واپس آیا۔ کوٹھڑی میں چھت کے پاس ایک چوکور سوراخ بنا ہوا تھا جو روشندان تھا۔ لالٹین میں جو مٹی کا تیل جل رہا تھا اس کی بو یا نظر نہ آنے والا

دھواں اس میں سے باہر چلا جاتا تھا جس کی وجہ سے بند کوٹھڑی میں بھی بیٹھے رہنے سے مجھے کوئی پریشانی نہ ہو رہی تھی۔

غلام رسول اپنے ساتھ میرے لئے کھانا۔ چائے سے بھرا ہوا تھرمس اور ایک سرہانہ ایک چادر لایا تھا۔ اس نے میرے ساتھ ہی تخت پوش پر بیٹھ کر کھانا کھایا۔ لالٹین لی بتی ہم نے اونچی نہیں کی تھی۔ کوٹھڑی میں بڑی نرم روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے بعد ہم تھرمس سے چائے گلاسوں میں ڈال کر پینے لگے۔ غلام رسول نے اپنا گلاس تخت پوش پر رکھ دیا اور ایک تھیلے میں ہاتھ ڈالتے ہوئے بولا۔

"میں تمہارے لئے ایک اور چیز بھی لایا ہوں۔"

اس نے تھیلے میں سے مجھے ایک ریوالور نکال کر دکھایا۔ کہنے لگا۔

"یہ ریوالور کشمیر میں ایک کمانڈو ایکشن کے دوران میں نے ایک بھارتی کرنل کو ٹھکانے لگانے کے بعد اپنے پاس رکھ لیا تھا۔"

ریوالور بہت اعلیٰ قسم کا تھا۔ اب مجھے یاد نہیں رہا کہ وہ کتنے اعشاریہ کتنے نمبر کا تھا۔ اس کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ اس کی نالی پر سائی لینسر لگا ہوا تھا۔ اس سائی لینسر کی وجہ سے فائر کرتے وقت ریوالور میں سے دھماکے کی آواز نہیں آتی۔ صرف کھٹک کی آواز آتی ہے۔ آپ نے ٹی وی پر انگریزی فلموں میں ہیرو کو اکثر اس قسم کے ریوالور فائر کرتے دیکھا ہو گا۔ یہ ریوالور اس وقت فائر کیا جاتا ہے جہاں پستول کے دھماکے سے دشمن کے خبردار ہو جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔

میں نے اس کے چیمبر کو کھول کر دیکھا۔ اس میں بارہ سوراخ تھے۔ یعنی اس میں بارہ گولیاں ڈال کر فائر کی جا سکتی تھیں۔ غلام رسول کہہ رہا تھا۔

"مجھے معلوم ہے تمہیں اس کی ضرورت پڑ سکتی ہے تم اسے اپنے پاس رکھو۔"

ہم خاموشی سے چائے پینے لگے۔ غلام رسول کہنے لگا۔

"کمانڈو شیروان نے مجھے بتایا ہے کہ تم بڑے اعلیٰ کوالٹی کے بہادر کمانڈو ہو اور تم نے دوار کا فورٹ کا فوجی گولہ بارود کا ذخیرہ بھی اڑایا تھا اور اس گاڑی کو بھی اڑا دیا تھا جو

کشمیری مجاہدین کے خلاف استعمال کیا جانے والا اسلحہ اور گولہ بارود لے کر دیولالی سے جموں توی آ رہی تھی۔ یہ سن کر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔"

میں نے کہا۔

"یہ میرا فرض تھا جو میں نے پورا کیا اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور کشمیر کی آزادی کی خاطر میں اپنے فرائض کو جان پر کھیل کر بھی ادا کرتا رہوں گا۔"

غلام رسول کہنے لگا۔

"اپنے ساتھی گل خان کو ٹارچر سنٹر سے نکالنے کی راہ میں تمہیں کافی مشکلات پیش آ سکتی ہیں۔ جان چلے جانے سے کچھ نہیں ہو گا اگر اپنا ٹارگٹ نہ مارا گیا۔ مقصد یہ ہے کہ ٹارگٹ مار لیا جائے۔"

میں نے اس سے پوچھا۔

"اس ٹارچر سنٹر میں جس کا نام نہرا نٹیرو گیشن سنٹر ہے پولیس ہوتی ہے یا ملٹری پولیس یا صرف خفیہ ایجنسیوں کے آدمی ہی ہوتے ہیں؟"

غلام رسول بولا۔

"اس ٹارچر سنٹر میں جموں پولیس کے بدنام ترین قصائی افسر بھی ہیں اور بھارت کی پاکستان دشمن خفیہ ایجنسی را کے آدمی بھی ہیں۔ اس انٹیرو گیشن سنٹر کا انچارج ایک ہندو کیپٹن بھٹناگر ہے جو پاکستان اور مسلمانوں کا جانی دشمن ہے۔ اس نے باہر کے ملکوں سے بھی اذیتیں دینے کے اوزار منگوا رکھے ہوئے ہیں۔ یہاں سے کوئی زیر حراست مسلمان زندہ نہیں بچ کر گیا اس کی لاش بھی کبھی کسی نے باہر نکلتی نہیں دیکھی۔"

میں نے کہا۔

"اس خونی بھیڑیئے کو ابھی تک آپ لوگوں نے ہلاک کیوں نہیں کیا؟"

غلام رسول نے کہا۔

"ہلاک کر دینے سے کیا ہو گا۔ ایک خونی بھیڑیا ہلاک ہو گا تو اس کی جگہ دوسرا خونی بھیڑیا آ جائے گا۔ انڈیا کی ساری پولیس ساری فوج مسلمانوں کے دشمن خونی بھیڑیوں سے

بھری ہوئی ہے۔ ہاں کبھی کبھی ایسا ضرور ہو جاتا ہے کہ اس انٹیروگیشن سنٹر سے اپنے طور پر کوئی حریت پرست مجاہد فرار ہونے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد جموں کے مسلمانوں کی کم بختی آجاتی ہے۔"

میں نے بات کا رخ اپنے کمانڈو مشن کی طرف موڑتے ہوئے غلام رسول سے پوچھا۔

"آپ مجھے اس سلسلے میں کیا مشورہ دیتے ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ مجھے گل خان کو تو ہر صورت میں یہاں سے فرار کروانا ہے۔ مجھے یہ بتائیں کہ آپ کے خیال میں مجھے کس قسم کی حکمت عملی اختیار کرنی ہوگی"

وہ کچھ دیر تک میری بات پر غور کرتا رہا۔ پھر بولا۔

"یہ میں تمہیں کل اچھی طرح غور کرنے اور اپنے محدود وسائل کا جائزہ لینے کے بعد ہی بتا سکوں گا۔ اب میں جاتا ہوں۔ میں تمہارے واسطے صبح کا ناشتہ لے کر نہیں آسکتا رومال میں جو ایک روٹی بچی ہوئی ہے اور تھرمس میں جو چائے پڑی ہے اس سے صبح ناشتہ کر لینا۔ میں دوپہر کے وقت آؤں گا۔ تم میرے بعد میری ہدایات پر پوری طرح عمل کرنا۔ دن کی روشنی میں کوٹھڑی سے باہر نکلنا بھی پڑے تو درختوں میں یا جھاڑیوں میں تازہ ہوا لینے کے لئے چھپ کر بیٹھ جانا۔ مگر زیادہ دیر کے لئے نہ بیٹھنا۔ رات کے وقت کوٹھڑی کے اندر لالٹین کو بجھا کر سونا۔ میں کوٹھڑی کو باہر سے تالا لگا کر نہیں جا رہا۔ رات کے وقت تم اندر سے کنڈی لگا لیا کرنا۔ اول تو اس طرف کوئی نہیں آتا۔ دن کے وقت کبھی کبھی کوئی پہاڑیا لکڑیاں اٹھائے ادھر سے گزرتا ہے وہ بھی نالے کی دوسری طرف سے ہو کر جاتا ہے۔ قریب جو لوگ رہتے ہیں ان سب کو معلوم ہے کہ میں نے اپنی دکان کا کاٹھ کباڑ اور فالتو لکڑیاں رکھنے کے لئے یہ کوٹھڑی بنوا رکھی ہے۔ اب میں جاتا ہوں۔ کل دوپہر کے وقت آؤں گا۔"

غلام رسول کے جانے کے بعد میں نے پستول کو پتلون کی جیب میں چھپا کر رکھ لیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میرا ارادہ باہر تھوڑی دیر کے لئے کھلی فضا میں ٹہلنے کا تھا۔ میں نے

لالٹین بجھا دی۔ دروازہ کھول کر باہر آیا۔ اس وقت آسمان پر مشرق کی طرف چاند جھکا ہوا تھا۔ بڑی رومانٹک ہلکی ہلکی چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ یہ چاند اس وقت آسمان پر آگیا تھا جب ہم کوٹھڑی کے اندر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

میں نے دروازے کو بند کیا اور خشک جھاڑیوں میں سے گزر کر اس جگہ آگیا جہاں نیچے نشیب میں پہاڑی نالہ بہہ رہا تھا۔ چاندنی میں نالے کا پانی شیشے کی طرح چمک رہا تھا۔ ایک طرف سے نیچے اترنے کے لئے جگہ بنی ہوئی تھی۔ میں پتھروں پر پاؤں رکھتا نیچے اتر گیا اور نالے کے پاس بیٹھ گیا۔ میری آنکھیں دھندلی دھندلی چاندنی میں چاروں طرف کا جائزہ لے رہی تھیں۔ رات کے گیارہ سوا گیارہ بجے ہوں گے۔ یہ علاقہ جموں شہر سے کافی باہر نکل کر تھا۔ اس لئے گہری خاموشی تھی۔ نالے میں کہیں کہیں پتھر بھی تھے جن سے پانی ٹکرا کر ہلکی ہلکی سرسراہٹ کی آواز پیدا کر رہا تھا۔ میں نے پانی میں جھک کر ہاتھ ڈالا۔ پانی ٹھنڈا تھا۔ نیم پہاڑی علاقوں کی نہروں کا پانی میدانی علاقے کی نہروں کے مقابلے میں بہت سرد ہوتا ہے۔ میں نے پانی پیا۔ واقعی پانی میٹھا تھا۔ اس وقت میرا سگریٹ پینے کو بہت جی چاہ رہا تھا۔ مگر غلام رسول نے بجا طور پر مجھے وہاں سگریٹ پینے سے منع کیا تھا۔ کیونکہ اس کھلی اور صاف فضا میں سگریٹ کے دھوئیں کی بو دور تک جا سکتی تھی۔ ہر قسم کی عادت کو ضبط کرنے بلکہ اس کو فتح کرنے کی مجھے عملی ٹریننگ دی گئی تھی۔ سگریٹ پینے کی خواہش پیدا ہوئی تو دوسرے لمحے میری قوت ارادی نے اسے بھگا دیا۔ میں ایک بار اپنی داستان پڑھنے والے پاکستانی نوجوانوں سے خاص طور پر کہوں گا کہ وہ اپنے اندر ایسی قوت پیدا کریں کہ ہر قسم کی بری عادت کو شکست دے سکیں۔ کوئی ایسی عادت نہیں ہے جس کو آدمی اپنی قوت ارادی سے کام لے کر ترک نہ کر سکے۔ بری عادتیں ہم پر سوار نہیں ہوتیں بلکہ ہم نے اپنی کمزوری کی وجہ سے انہیں سر پر سوار کر رکھا ہوتا ہے۔ یاد رکھیں۔ اس وقت پاکستان چاروں طرف سے دشمنوں میں گھرا ہوا ہے۔ ہمیں اس وقت ایک مضبوط اور طاقتور قوم بننے کی ضرورت ہے۔ یہ ملک ہم نے اسلام کے نام پر اتنی قربانیاں دے کر بنایا ہے کہ تاریخ انسانی میں اس کی مثال شاید ہی کہیں ملے۔

میں انہی سوچوں میں گم پہاڑی نالے کے پاس بیٹھا تھا کہ مجھے ایک ناگوار سی بو محسوس ہوئی۔ میرے حواس ایک دم بیدار ہو گئے۔ یہ ہندوؤں کے مندروں سے آنے والی لوبان کی بو تھی۔ یہ بو میری دشمن چندریکا کی بدروح کے ساتھ آئی تھی۔ میں نے دھندلی چاندنی میں گھور گھور کر چاروں طرف دیکھا۔ بو برابر آرہی تھی مگر چندریکا کی بدروح ظاہر نہیں ہوئی تھی۔ مجھے تشویش ہوئی کہ یہ بدروح میری دشمن ہو گئی ہے۔ ممکن ہے یہ جموں پولیس یا ملٹری انٹیلی جنیس کے کسی ہندو افسر پر ظاہر ہو کر میرے بارے میں مخبری کر دے۔ لوبان کی بو آہستہ آہستہ دور ہو گئی۔ اب اس کی جگہ چنبیلی کی میٹھی خوشبو آنے لگی۔ میرا دل بھر آیا۔ یہ میری چھوٹی بہن کلثوم کی روح کی خوشبو تھی۔ بہت دیر کے بعد مجھے میری شہید بہن کی روح کی خوشبو آئی تھی۔ میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"کلثوم! کیا تم ہو؟"

مجھے یقین تھا کہ میری چھوٹی بہن کی روح اس وقت میرے آس پاس موجود تھی۔ مگر روح نے کوئی جواب نہ دیا۔ پھر چنبیلی کی خوشبو بھی آہستہ آہستہ مجھ سے دور ہوتے ہوتے بالکل غائب ہو گئی۔ مجھے خیال آیا کہ چندریکا کی بد روح مجھے نقصان پہنچانے ضرور آئی تھی مگر وہ میری بہن کی روح کی نورانی طاقت کے آگے ٹھہر نہ سکی اور بھاگ گئی۔ اس کا مطلب تھا کہ میری شہید بہن کلثوم کی روح کو میرا خیال لگا ہوا ہے۔ وہ مجھ کو دیکھنے آگئی تھی۔ کاش! وہ مجھے اپنی صورت بھی دکھا دیتی۔

آہ! میری پیاری بہن! تجھے ایک سکھ نے کرپان مار کر شہید کر دیا۔ تیری لاش ہم کھیتوں میں ہی چھوڑ کر پاکستان ہجرت کر گئے۔ میری شہید بہن! تجھے پاکستان میں قدم رکھنا نصیب نہ ہوا مگر تیرا خون دوسرے شہیدوں کے خون کی طرح پاکستان کی مقدس امانت ہے۔ ہم اپنے پاکستان کو اپنے شہیدوں کے خون کی امانت کو اپنا خون دے کر محفوظ رکھیں گے۔ میری شہید بہن! یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔ اے پاکستان پر قربان ہو جانے والے شہیدو! یہ ساری قوم کا تم سے وعدہ ہے۔

میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ یہ غم کے آنسو نہیں تھے۔ یہ کردار کی طاقت اور ارادے کی عظمت کے آنسو تھے۔ میں اٹھ کر واپس کوٹھڑی میں آکر لیٹ گیا۔ دروازہ میں نے اندر سے بند کر لیا تھا۔ ریوالور جیب سے نکال کر میں نے اپنے سرہانے کے نیچے رکھ لیا تھا۔ لالٹین میں بجھا کر ہی گیا تھا۔ چھت کے ساتھ جو چھوٹا سا روشندان تھا اس میں سے چاند کی پھیکی روشنی دھندلے غبار کی طرح اندر آرہی تھی۔ اس غبار کو دیکھتے دیکھتے اور اپنے نئے کمانڈو مشن کے بارے میں سوچتے سوچتے مجھے نیند آگئی۔

اگلے روز دوپہر کے وقت غلام رسول آگیا۔ وہ ایک تھیلے میں دوپہر اور رات کے واسطے میرے لئے جوار کی روٹیاں اور اچار لایا تھا۔ ہم نے تھوڑا بہت کھانا کھایا۔ میں نے غلام رسول سے اپنے مشن کی پیش رفت کے بارے میں پوچھا تو وہ کہنے لگا۔

"میں سورج ڈوبنے سے ذرا پہلے آؤں گا۔ اس وقت تم میرے ساتھ چلو گے۔ تم یار رہنا۔"

میں نے پوچھا۔

"ہمیں کہاں جانا ہو گا؟"

وہ بولا۔

"تمہیں اپنے آپ پتہ چل جائے گا۔ رات کو کوئی خاص بات تو نہیں ہوئی؟"

میں نے کہا۔

"بالکل نہیں۔ میں آدھی رات کو پہاڑی نالے تک گیا تھا۔ پھر واپس آگیا تھا"

"تمہیں بڑی احتیاط کرنے کی ضرورت ہے۔ اچھا اب میں جاتا ہوں۔ سہ پہر کے ت آؤں گا۔"

وہ چلا گیا۔ یہ شخص بھی دوسرے کشمیری حریت پرست مجاہدوں کی طرح مختصر بات رتا تھا اور وقت پر اٹھ کر چلا جاتا تھا۔ میں کوٹھڑی کے اندر ہی رہا۔ کبھی کبھی اٹھ کر دازے کی درز میں سے باہر دیکھ لیتا تھا۔ باہر دھوپ تھی اور خوب روشنی پھیلی ہوئی ا۔ دور سے کسی وقت کسی ٹرک کے ہارن کی آواز آجاتی تھی۔ یا درختوں کی طرف

سے کسی طوطے کسی کوے کے بولنے کی آواز آجاتی تھی۔ سہ پہر کے بعد غلام رسول آگیا۔ اس نے گلے میں کھدر کا ایک تھیلا لٹکایا ہوا تھا۔ ہندوستان میں سیاسی ورکر وغیرہ اسی طرح کا تھیلا گلے میں یا کاندھے سے لٹکائے رکھتے ہیں۔ غلام رسول کا لباس بھی جموں کے ہندوؤں ایسا ہی تھا۔ یعنی تنگ موری کا کھدر کا پاجامہ، بغیر کالر کے کرتہ اور پرانی صدری۔ سر پر ڈوگرہ کیپ۔ میں نے بھی سر پر ڈوگرہ کیپ پہن رکھی تھی۔ تاکہ اگر میں کسی وقت کوٹھڑی سے باہر نکلوں اور دور سے کوئی دیکھے تو یہی سمجھے کہ کوئی ڈوگرہ مزدور کام کر رہا ہے۔ غلام رسول میرے پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔

"میں تمہیں دور سے نہر انٹیروگیشن سنٹر دکھاؤں گا۔ میری اطلاع کے مطابق گل خان کونے والے تہہ خانے میں بند ہے۔ پہلے اسے بیڑیاں ڈالی ہوئی تھیں مگر اب بیڑیاں کھول دی گئی ہیں۔ میرے آدمی نے بتایا ہے کہ گل خان نے سارے ٹارچر ساری اذیتیں برداشت کی ہیں مگر اپنی زبان نہیں کھولی۔ انٹیروگیشن سنٹر کے فوجی انچارج کیپٹن بٹھناگر نے دلی سے ٹارچر کے جدید ترین ماہر ڈاکٹر کو بلا بھیجا ہے۔ اب گل خان کو کوئی خاص انجکشن لگا کر نیم بے ہوشی کی حالت میں اس سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ کیونکہ تشدد کے ان کے سارے حربے ناکام ہو چکے ہیں۔"

میں نے پوچھا۔

"آپ مجھے کہاں اور کسی جگہ سے انٹیروگیشن سنٹر دکھائیں گے؟ اور اس کو محض دیکھ لینے سے تو کچھ نہیں ہو گا۔ مجھے تو اس کے اندر جانا ہو گا۔"

غلام رسول نے جواب دیا۔

"ہر کام اپنے وقت پر کیا جائے گا۔ پہلے اس سنٹر کی عمارت کو اچھی طرح سے دیکھ بہت ضروری ہے۔ میرے ساتھ آؤ۔ میں آگے جاؤں گا۔ تم میرے پیچھے پیچھے چھ سات قدموں کا فاصلہ ڈال کر چلو گے۔"

غلام رسول نے باہر آکر کوٹھڑی پر تالا ڈالا اور ایک طرف چل پڑا۔ میں چھ سات قدموں کا فاصلہ ڈال کر اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ ہم پہلے تو نالے کے ساتھ ساتھ چ

رہے۔ نالہ آگے جا کر جب شہر کے گنجان آباد علاقے کی طرف مڑا تو ہم بھی اس طرف مڑ گئے۔ ایک جگہ کسی مندر کی سیڑھیاں نالے میں اترتی تھیں۔ غلام رسول سیڑھیاں چڑھ کر مندر کے پہلو سے ہو کر جاتی چھوٹی سڑک پر چل پڑا۔ میں پیچھے پیچھے تھا۔ ہمارے حلیے ایسے تھے کہ ہم شکل صورت اور لباس سے ڈوگرے معلوم ہو رہے تھے۔ ہمارے سروں پر ٹوپیاں تھیں جو چمبہ کانگڑا اور جموں کے ڈوگرے عام طور پر پہنتے ہیں۔ غلام رسول آبادی سے بچ کر جا رہا تھا۔ وہ مجھے بازاروں گلیوں میں نہیں لے جانا چاہتا تھا۔ جموں شہر میں دکانیں کھلی تھیں۔ بازاروں میں ٹریفک جاری تھی۔ چلتے چلتے میں نے دیکھا کہ ہماری داہنی جانب ایک بھورے رنگ کا چھوٹا ٹیلہ ہے۔ غلام رسول اس ٹیلے کے قریب سے ہو کر آگے نکل گیا۔ ٹیلے کے پیچھے ایک اونچے ٹبے پر مجھے مسجد کا گنبد اور پرانے مینار دکھائی دیئے۔ غلام رسول مسجد کے قریب جا کر رک گیا۔ اس نے پیچھے مڑ کر مجھے دیکھا اور پھر مسجد کے دروازے میں داخل ہو گیا۔ ایک منٹ بعد میں بھی مسجد کے دروازے میں سے گزر گیا۔ سامنے مسجد کا چھوٹا سا صحن تھا جہاں ایک مولوی صاحب بچوں کو قرآن مجید پڑھا رہے تھے۔ میں نے غلام رسول کو دیکھا کہ وہ جوتیاں ہاتھ میں لئے مسجد کے صحن میں سے ہو کر ایک حجرے میں داخل ہو گیا۔ مولوی صاحب نے نہ غلام رسول کی طرف کوئی توجہ کی نہ میری طرف غور سے دیکھا۔ میں بھی حجرے میں چلا گیا۔

غلام رسول حجرے میں بچھی ہوئی چارپائی پر بیٹھا تھا۔ میں بھی اس کے پاس پائنتی کی طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ میں نے اس سے بالکل نہ پوچھا کہ ہم یہاں کیوں آئے ہیں۔ اتنے میں باہر سے بچوں کے مولوی صاحب کو سلام کرنے اور بھاگنے کی آوازیں آئیں۔ مولوی صاحب نے بچوں کو چھٹی دے دی تھی۔ پھر مولوی صاحب بھی حجرے میں آگئے۔ آتے ہی غلام رسول سے کہنے لگے۔

"تم لوگ یہاں بیٹھو۔ میں اوپر جا کر دیکھتا ہوں۔ اگر حالات ٹھیک ہوئے تو تم اوپر چلے جانا۔ اگر آس پاس کوئی شک شبہ ہوا تو میں تمہیں اوپر جا کر اپنا کام کرنے کی اجازت نہیں دوں گا۔"

غلام رسول نے کہا۔

"مولوی فیض الحسن صاحب! ہم آپ کے مشورے کے مطابق کام کریں گے۔"

مولوی صاحب چلے گئے۔ غلام رسول بھی خاموش تھا۔ میں بھی خاموش تھا۔ ہمیں اوپر چھت پر مولوی صاحب کے چلنے پھرنے کی آہٹ سنائی دی۔ کوئی دو تین منٹ کے بعد مولوی صاحب نیچے آگئے۔ حجرے میں داخل ہو کر انہوں نے غلام رسول سے کہا۔

"پچھلی طرف سے چھت پہ چڑھ جاؤ۔ لیکن گنبد کی اوٹ میں رہنا۔ سامنے بالکل نہ آنا"

غلام رسول نے کہا۔

"آپ بے فکر رہیں"

اس دوران غلام رسول نے تھیلا اتار کر چارپائی پر رکھ دیا تھا۔ پھر اس نے تھیلے میں ہاتھ ڈال کر خاکستری رنگ کی ایک دوربین باہر نکالی۔ یہ فوجی دوربین تھی اور صاف لگ رہا تھا کہ بڑی طاقتور دوربین ہے۔ غلام رسول نے مجھ سے کہا۔

"آجاؤ"

ہم حجرے کے پچھلے دروازے سے نکلے۔ پیچھے ایک زینہ مسجد کی چھت کو جاتا تھا۔ ہم زینہ چڑھ کر مسجد کی چھت پر آگئے۔ ہم جھک کر چلتے مسجد کے گنبد کی اوٹ میں ہو کر ایک جگہ بیٹھ گئے۔ یہ مسجد آبادی کے مکانوں سے اونچائی پر بنی ہوئی تھی اور یہاں سے دوسرے مکانوں کی چھتیں کافی نیچی تھیں۔

غلام رسول آنکھوں کے آگے دوربین لگا کر ایک طرف دیکھنے لگا۔ پھر اس نے دوربین مجھے دیتے ہوئے کہا۔

"یہاں سے آگے جو ٹیلہ ہے اس پر پولیس کے سپاہی پہرے پر موجود ہیں وہ تمہیں صاف نظر آجائیں گے۔ ٹیلے کی دوسری جانب دو منزلہ عمارت تمہیں نظر آئے گی۔ یہ عمارت نہر انیرو گیشن سنٹر ہے۔ اب دوربین لگا کر دیکھو"

میں نے دوربین آنکھوں سے لگائی۔ ٹیلہ ویسے مسجد سے کافی فاصلے پر تھا۔ یہ ٹیلہ نہر

انیرو گیشن سنٹر کے عقب میں واقع تھا اور جیسا کہ کمانڈو شیروان نے بتایا تھا اس ٹیلے پر پولیس کے آدمی دن رات پہرے پر موجو رہتے ہیں۔ تاکہ اس طرف سے کوئی حریت پرست کشمیر کمانڈو اپنے ساتھیوں کو چھڑانے کے لئے سنٹر کی دیوار کود کا اندر نہ چلا جائے۔ انہیں آرڈر تھا کہ اگر کوئی شخص دیوار پھاندتا نظر آئے تو اسے وہیں شوٹ کر دیا جائے۔ دوربین اتنی طاقت ور تھی کہ مجھے وہ ٹیلہ جو مسجد سے کافی دور تھا بالکل قریب دکھائی دینے لگا۔ مجھے تین سپاہی نظر آئے جو ٹیلے کے اوپر چل پھر کر پہرہ دے رہے تھے۔ ان میں سے دو سکھ تھے۔ مجھے ایک سکھ کی ڈاڑھی کے بال تک نظر آرہے تھے۔ غلام رسول بالکل میرے ساتھ لگ کر بیٹھا تھا۔ وہ کہنے لگا۔

"اب انیرو گیشن سنٹر کی عمارت کی پہلی منزل پر نظریں جماؤ۔"

میں نے دوربین کو ذرا نیچے کیا تو مجھے انیرو گیشن سنٹر کی پہلی منزل کے کمروں کی کھڑکیاں بڑی واضح ہو کر نظر آنے لگیں غلام رسول آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔

"اس وقت تم کیا دیکھ رہے ہو؟"

میں نے کہا۔

"میں پہلی منزل کے کمروں کی عقبی کھڑکیاں دیکھ رہا ہوں"

غلام رسول نے آہستہ سے کہا۔

"دوربین کو پہلی منزل کے آخری کمرے کے کونے کی طرف لے جا کر دیکھو۔ تمہیں یہاں ایک چھوٹا دروازہ نظر آئے گا۔"

میں دوربین کو اسی طرف لے گیا۔ وہاں دیوار میں ایک دروازہ تھا جو عام دروازے سے تنگ اور محراب دار تھا۔ دروازہ بند تھا۔ غلام رسول نے پوچھا۔

"کیا تم دروازہ دیکھ رہے ہو؟"

میں نے کہا۔

"دیکھ رہا ہوں"

غلام رسول بولا۔

"یہ دروازہ نیچے ان تہہ خانوں میں جاتا ہے جہاں گل خان دوسرے حریت پرست مجاہدوں کے ساتھ قید وبند اور ٹارچر کی اذیتیں برداشت کر رہا ہے۔ یہ دروازہ صرف اس وقت کھلتا ہے جب کسی کو اندر سے جانا یا اندر باہر آنا ہوتا ہے۔ تمہیں اس دروازے کے باہر ایک ڈوگرہ سپاہی گشت کر کے پہرہ دیتا نظر آئے گا۔"

میں ابھی دوربین میں سے تہہ خانے کے دروازے کو دیکھ رہا تھا کہ ایک ڈوگرہ سپاہی رائفل کاندھے پر رکھے دروازے کے آگے سے گزر گیا۔ وہ پہرہ دینے کے انداز میں قدم قدم چل رہا تھا۔ پانچ چھ قدم چلنے کے بعد وہ واپس پلٹ آیا۔ اور ایک بار پھر دروازے کے سامنے سے گزر گیا۔ میں نے غلام رسول سے کہا۔

"میں پہرے پر موجود ڈوگرہ سپاہی کو دیکھ رہا ہوں"

غلام رسول نے کہا۔

"اب دوربین کا رخ اس منزل کے کونے کی طرف ذرا نیچے لے جاؤ اور فرش کو دیکھو۔"

میں نے ایسا ہی کیا۔ فرش اینٹیں جوڑ کر بنایا گیا تھا اور دوربین میں مجھے اکھڑی ہوئی اینٹیں صاف نظر آرہی تھیں۔ غلام رسول نے کہا۔

"کیا تم فرش کو دیکھ رہے ہو؟"

میں نے کہا۔

"ہاں"

غلام رسول بولا۔

"کیا تمہیں فرش پر کوئی اور چیز بھی نظر آئی ہے؟"

میں نے غور سے دیکھا تو عمارت کی پہلی منزل والی دیوار سے دو قدم ہٹ کر زمین پر گول لوہے کا ڈھکن پڑا تھا۔ میں نے کہا۔

"میں لوہے کا ایک گول ڈھکنا دیکھ رہا ہوں"

غلام رسول نے کہا۔

"اس ڈھکن کو اور تہہ خانے کو جانے والے دروازے کو اپنے ذہن میں اچھی طرح بٹھالو۔ کیونکہ یہاں تمہیں رات کے وقت آنا ہوگا۔ جب دن کی روشنی نہیں ہوگی۔ جس ڈھکن کو تم دیکھ رہے ہو یہ انٹیروگیشن سنٹر کے سیوریج کا ڈھکن ہے۔ یہ گٹر زمین کے اندر ساری عمارت کا پانی لے کر زمین کے نیچے سے ہوتا ہوا ایک جگہ اس نہر میں جا کر شامل ہو جاتا ہے جو اس عمارت کی دوسری جانب بہتی ہے اور جس کے نام سے اس عمارت کا نام نہرانٹیروگیشن سنٹر رکھا گیا ہے۔ ایک بار پھران تمام مقام کو غور سے دیکھ کر اپنے ذہن میں اس کا نقشہ بٹھالو۔"

میں نے سب جگہوں کو پوری توجہ سے دیکھا اور کہا۔

"میں نے ایک ایک جگہ دیکھ کر نوٹ کرلی ہے۔"

غلام رسول بولا۔

"اب دوربین کو بائیں جانب گھما کر اوپر لے جاؤ۔ تمہیں عمارت کے عقبی ٹیلے کی ڈھلان نظر آئے گی۔ اس ڈھلان پر خاردار تاروں کی دیوار نہیں بنائی گی۔ خاردار تاروں کا جنگلہ اوپر ٹیلے پر مغرب سے مشرق کی طرف لگایا گیا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اگر کوئی ایمرجنسی پیدا ہو جاتی ہے اور حالات الٹا رخ اختیار کر لیتے ہیں تو تمہیں اس ڈھلان پر چڑھ کر خاردار تاروں کے جنگلے کو کاٹ کر اور ڈوگرہ سپاہیوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر ٹیلے کی دوسری طرف نکلنا ہوگا۔ یہ بڑا مشکل کام ہوگا۔ کیا تم ایسا کر سکو گے؟"

غلام رسول نے ہاتھ بڑھا کر میری آنکھوں کے آگے سے دوربین ہٹا دی۔ میں نے آنکھیں جھپکتے ہوئے کاہ۔

"کوشش ضرور کروں گا۔ آگے اللہ مالک ہے۔"

غلام رسول نے دوربین کا فیتہ اس کے گرد لپیٹتے ہوئے کہا۔

"اللہ نے تمہیں بھی کچھ چیزوں کا مالک بنایا ہے۔ نیچے آجاؤ۔"

ہم حجرے میں واپس آئے تو مولوی صاحب نہیں تھے۔ غلام رسول نے دوربین تھیلے میں ڈالی۔ تھیلا اپنے گلے میں لٹکایا کہنے لگا۔

"اسی طرح میرے پیچھے پیچھے چلے آنا۔ میں تمہیں وہ جگہ دکھانے چلا ہوں جہاں اس عمارت کے سیوریج کا پانی نہر میں گرتا ہے۔"

وہ پہلے نکل گیا۔ میں اس کے بعد جوتے ہاتھ میں پکڑے مسجد کے صحن میں سے گزرا تو مولوی صاحب مسجد کے دروازے کے باہر ایک طرف کھڑے تھے۔ وہ اس بات کی نگرانی کر رہے تھے کہ اگر کوئی خطرہ ہو تو ہمیں فوراً آ کر بتا دیں۔ میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں احتراماً مولوی صاحب کو سلام کیا اور غلام رسول جس طرف گیا تھا اس طرف چل دیا۔

غلام رسول بازار کے آخر میں جا کر اس طرف گھوم گیا جدھر جموں شہر کی یہ نہر انٹیروگیشن سنٹر کے پیچھے سے گزرتی تھی۔ یہ جگہ آبادی سے باہر تھی۔ نہر کی ایک جانب سڑک کے کنارے کنارے لکڑی کے کھوکھے بنے ہوئے تھے۔ ان میں دکانیں تھیں۔ غلام رسول ان کھوکھوں کے پیچھے ہو گیا۔ یہ نہر کا آبادی کی طرف والا کنارا تھا۔ اور مکانوں کی عقبی دیواریں اور کھڑکیاں نظر آتی تھیں۔ مگر یہاں درخت اگے ہوئے تھے جن کی شاخوں کی وجہ سے نہر کے کنارے پر نظر نہیں پڑتی تھی۔

نہر کے کنارے جگہ جگہ گیلی مٹی کے ڈھیر پڑے ہوئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ نہر کی صفائی ہوئی تھی اور نہر کی مٹی نکال کر باہر ڈال دی گئی تھی۔ غلام رسول ایک جگہ بھل مٹی کی ڈھیری کے پاس اس طرح بیٹھ گیا جیسے تھک گیا ہو اور آرام کرنا چاہتا ہو۔ اس نے پاؤں سے جوتا اتار دیا تھا اور ہاتھ سے پاؤں دبا رہا تھا۔ میں اس کے قریب آیا تو اس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔

"بیٹھ جاؤ۔ جو میں کرتا ہوں تم بھی کرو"

میں نے بھی بیٹھتے ہی جوتے اتار دیئے اور ہاتھوں سے اپنے پیر دبانے لگا۔ ہمارا رخ نہر کی طرف تھا۔ یہ نہر چھوٹی تھی۔ اس کا گدلہ پانی خاموشی سے بہہ رہا تھا۔ پانی میں گلے سڑے پتے اور کاغذ وغیرہ تیرتے چلے آ رہے تھے۔ غلام رسول نے اپنے والے کنارے کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ذرا آگے ہو کر دیکھو۔ ایسا ہونا نہیں چاہئے تھا کہ کسی عمارت کے گٹر کا پائپ نہر میں گرے مگر اس شہر میں یہ واحد مثال ہے کہ ایسا ہوا ہے۔ تمہیں نیچے سرنگ نظر آئے گی۔ یہ وہ سرنگ ہے جس میں سے انٹیروگیشن سنٹر کے سیوریج کا پانی بڑے پائپ کے ذریعے نہر میں سے گزر کر سامنے والے کنارے کے نیچے سے ہو کر گندے نالے کی طرف نکل جاتا ہے۔"

میں نے پاؤں دباتے دباتے آگے کو جھک کر دیکھا۔ کافی بڑا سیمنٹ کا پائپ سرنگ کے اندر سے نکل کر نہر میں اتر گیا تھا۔ سرنگ میں پائپ کے اوپر کافی کھلی جگہ تھی۔ گٹر کا پانی کھلی صورت میں لانے کی بجائے بڑے پائپ زمین کے نیچے کیوں نہ بچھایا گیا۔ پائپ ایک سرنگ میں کیوں بچھائی گئی ہے۔

غلام رسول نے کہا۔

"تمہیں اس سرنگ میں سے گٹر کے ساتھ ساتھ انٹیروگیشن سنٹر میں داخل ہونا ہو گا۔ میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتا۔ یہ کام تمہیں خود ہی کرنا ہو گا۔ ایک بار پھر اس جگہ کو اچھی طرح سے دیکھ لو اور جو نشانی لگانی ہے لگا لو۔"

میں نے کہا۔

"میں نے جو کچھ دیکھنا تھا دیکھ لیا ہے۔"

وہ بولا۔

"اچھی بات ہے۔ اب ایسا کرو کہ جس طرف سے میں تمہیں لے کر آیا ہوں اسی طرف سے چل کر واپس کوٹھڑی میں پہنچ جاؤ۔ کیا تم ایسا کر سکو گے؟ تمہیں راستہ یاد رہا ہے؟"

میں نے کہا۔

"بالکل یاد رہا ہے۔"

اس نے کہا۔

"تو پھر فوراً واپس چل پڑو میں رات کو کسی وقت آؤں گا۔ باقی باتیں اس وقت ہوں

گی۔"

میں نہر کے کنارے کنارے واپس روانہ ہو گیا۔ میں نے پیچھے مڑ کر بالکل نہ دیکھا کہ غلام رسول بھی وہاں سے گیا ہے یا نہیں۔ میں جن راستوں سے ہو کر وہاں آیا تھا وہ راستے مجھے پوری طرح یاد تھے۔ ویسے بھی ابھی شام نہیں ہوئی تھی۔ دن کی روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ میں چلتے چلتے واپس اس ویران جگہ پر آ گیا جہاں کوٹھڑی بنی ہوئی تھی۔ اب مجھے رات کا انتظار تھا۔ مگر مجھے جو کچھ کرنا تھا وہ معلوم ہو گیا تھا۔ مجھے رات کے وقت نہر میں جا کر سیوریج کے پائپ والی سرنگ میں اتر کر زمین کے اندر ہی اندر پائپ کے ساتھ چلتے چلتے اس مین ہول تک پہنچنا تھا جہاں پر سیوریج کا پانی عمارت کی مختلف نالیوں میں سے گزرتا ہوا بڑے پائپ میں آ کر گرتا تھا۔ یہ مین ہول اس جگہ گٹر اور پائپ کی صفائی کے لئے بنایا گیا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق یہ سرنگ نہر سے لے کر انٹیرو گیشن سنٹر کے اندر تک پانچ چھ سو فٹ لمبی ہو گی۔ مگر کچھ معلوم نہیں تھا کہ سرنگ اندر جا کر کہاں سے تنگ ہو جاتی ہے اور کہیں بند ہی نہ ہو جاتی ہو اور صرف پائپ دیوار میں گھس جاتا ہے۔ میں رات پڑنے تک اس اہم ترین اور خطرناک مشن کے تمام پہلوؤں پر غور کرتا رہا۔ مجھے غلام رسول کا بے تابی سے انتظار تھا۔ کیونکہ وہی آ کر مجھے اس سرنگ کے بارے میں کچھ بتا سکتا تھا۔

عشاء کا وقت گزر گیا تھا کہ غلام رسول آ گیا۔ وہ ساتھ کچھ بھنا ہوا گوشت اور دوسرے تھرمس میں چائے بھر کر لایا تھا۔ ہم نے صبح کی بچی ہوئی روٹیوں کے ساتھ بھنا ہوا گوشت کھایا۔ چائے پی۔ اس دوران غلام رسول نے مجھے سرنگ کے بارے میں کچھ نہ بتایا۔ میں نے بھی نہ پوچھا۔ جب ہم چائے پینے لگے تو میں نے اس سے پوچھا کہ کہیں یہ سرنگ زمین کے اندر جا کر بند تو نہیں ہو جاتی؟

غلام رسول بولا۔

"نہیں۔ میں نے اس کے بارے میں ایک سینٹری انسپکٹر سے ساری باتیں معلوم کی ہیں۔ یہ سرنگ اتنی اونچی اور چوڑی ہے کہ آدمی پائپ کے اوپر بیٹھ کر آہستہ آہستہ رینگ

کر آگے جا سکتا ہے۔ اصل میں یہ سرنگ جموں کے کسی راجہ نے اپنی حویلی کے باغ میں نہر کا پانی لانے کے لئے بنائی تھی۔ مگر وقت کے ساتھ ساتھ یہ سرنگ مٹی سے بھرتی گئی اور نہر کی سطح سے اونچی ہوتی گئی۔ اب اس حویلی میں بھارتی حکومت نے انٹیرو گیشن سنٹر بنا لیا ہے اور یہاں کا گندہ پانی سرنگ میں پائپ بچھا کر نہر کے اندر سے گزار کر شہر کے بڑے بدرو میں ڈالا جاتا ہے۔ پائپ کی صفائی سال میں ایک ہوا کے پریشر کے ساتھ کی جاتی ہے لیکن سال میں ایک بار سرنگ کو بھی صاف کیا جاتا ہے سرنگ میں تازہ ہوا ان ہوا دانوں سے داخل ہوتی ہے جو عمارت کے اندر اور عمارت اور نہر کے درمیان آبادی میں تین جگہوں پر اونچے گول پائپوں کی شکل میں لگائے گئے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"اب آپ مجھے یہ بتائیں کہ مجھے کس رات اس مشن پر جانا چاہئے"

غلام رسول بولا۔

"تم کسی بھی رات کو جا سکتے ہو۔ ابھی تو گل خان اسی انٹیرو گیشن سنٹر میں ہے۔ کوئی پتہ نہیں دو تین دن کے بعد اسے امرتسر یا جالندھر کے انٹیرو گیشن سنٹر میں بھیج دیا جائے۔ پھر تم کیا کرو گے؟"

میں نے کہا۔

"تو پھر ٹھیک ہے۔ میں کل رات اپنے مشن پر روانہ ہو جاؤں گا۔ لیکن آپ نے یہ نہیں بتایا کہ اگر میں گل خان کو اس جہنم سے نکال لانے میں کامیاب ہو گیا تو ہمیں کہاں جانا ہو گا؟

غلام رسول بولا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں تمہیں اکیلا چھوڑوں؟ میں نہر کے کنارے لکڑی کے کھوکھوں کے پاس جہاں گٹر کی سرنگ کا منہ کھلتا ہے تمہارا انتظار کر رہا ہوں گا۔ ایک بند جیپ میں ساتھ لایا ہوں گا۔ تم دونوں کو جیپ میں بٹھاؤں گا اور تمہیں ایک ایسی خفیہ جگہ پر لے جاؤں گا جہاں جموں کی پولیس تو کیا مقبوضہ کشمیر پر قابض ساری ڈوگرہ ملٹری بھی

نہیں پہنچ سکے گی۔"

یہ میرے لئے تسلی اور اطمینان کی بات تھی۔ میں نے پوچھا۔

"آپ کے خیال میں مجھے کل رات کس وقت جانا چاہئے؟"

غلام رسول تھوڑی دیر سوچتا رہا۔ پھر کہنے لگا۔

"رات ایک بجے کے بعد کا وقت ٹھیک رہے گا۔ اس وقت تک نہر والے بازار کے سارے کھوکھوں کی دکانیں بھی بند ہو چکی ہوتی ہیں۔"

"آپ مجھے کل رات کہاں ملیں گے؟"

وہ بولا۔

"میں ٹھیک پونے ایک بجے کل رات یہاں تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔ ہم دونوں یہاں سے اکٹھے نکلیں گے کیونکہ رات کے وقت تم راستہ بھول سکتے ہو۔"

وہ دوسری رات آنے کا کہہ کر چلا گیا۔

وہ رات میں اپنے مشن کے پلان پر کافی دیر غور کرتا رہا۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ یہ مشن زیادہ خطرناک تھا۔ کمانڈو کا کوئی مشن آسان نہیں ہوتا۔ خاص طور پر اگر وہ دشمن کے علاقے میں ہے تو ہر مشن کے لئے جان کی بازی لگانی پڑتی ہے۔ کمانڈو کی ہر ممکن کوشش یہی ہوتی ہے کہ وہ جان کی بازی بھی لگائے اور مرنے سے پہلے اپنا ٹارگٹ ضرور مار لے۔ ٹارگٹ مارے بغیر مرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ میرا مسئلہ بھی یہی تھا کہ میں ہر حالت میں ٹارگٹ مار لینا چاہتا تھا اور گل خان کو ہر صورت وہاں سے نکال لانا چاہتا تھا۔ یہی میرے مشن کا مقصد تھا۔

دوسرا دن بھی اسی ادھیڑ بن میں گزر گیا۔ دوپہر کو رات کی جو روٹی بچی ہوئی پڑی تھی وہی کھائی۔ تھرمس میں سے چائے نکال کر پی لی۔ پیاس لگی تو کوٹھڑی میں سے نکل کر بڑا محتاط ہو کر چلتا پہاڑی نالے پر گیا اور پانی پی کر واپس آ گیا۔ دن کسی طرح گزرنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ آخر خدا خدا کر کے سورج غروب ہوا اور فضا میں شام کا اندھیرا آہستہ آہستہ گہرا ہونے لگا۔ رات ہو گئی۔ میں نے رومال کھول کر دیکھا۔ صرف ایک روٹی بچی ہوئی

تھی۔ میں نے وہی چائے کے ساتھ کھا کر خدا کا شکر ادا کیا۔ میں نے تیمم کر کے کوٹھڑی کے اندر ہی عشاء کی نماز پڑھی۔ نماز کے بعد خدا کے حضور اپنے مشن کی کامیابی کے لئے خضوع وخشوع سے دعا مانگی اور چارپائی پر بیٹھ گیا۔ لالٹین کی بتی میں نے نیچی کی ہوئی تھی۔ میری پتلون کی جیب میں دھماکہ خیز محلول کی شیشی بھی موجود تھی۔ اسے میں نے اس لئے رکھا ہوا تھا کہ شاید کسی جگہ اس کی ضرورت پڑ جائے۔ اگرچہ اس کا امکان نہیں تھا۔ کیونکہ میرا یہ مشن خالص ایکشن کا مشن تھا۔ یہاں مجھے بہادری اور دلیری سے کام لیتے ہوئے اپنے حواس کو کنٹرول میں رکھتے ہوئے اپنے ساتھی کو دشمن کے گھیرے سے نکال کر لانا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہاں بڑا کڑا پہرہ ہو گا۔ سیکورٹی سخت ہو گی۔ ذرا سے شک پڑنے پر مجھ پر چاروں طرف سے فائرنگ شروع ہو جائے گی۔ لیکن مجھے اسی قسم کے کمانڈو آپریشنز کی ٹریننگ دی گئی تھی اور بڑی سخت ٹریننگ دی گئی تھی۔ ٹریننگ کے علاوہ میرا جذبہ بھی کام کر رہا تھا۔ جہاں بہترین تربیت کے ساتھ جذبہ بھی شامل ہو جائے وہاں کمانڈو ضرور ٹارگٹ مار لیتا ہے۔ مجھے بھی یقین تھا کہ اگر گل خان انٹیروگیشن سنٹر کے تہہ خانے میں موجود ہے تو میں ناکام واپس نہیں آؤں گا۔

میں نے دوسری جیب میں سے اپنا بارہ بور کا ریوالور نکال لیا اور اس کا چیمبر کھول کر ساری گولیاں نکالیں اور رومال سے اسے صاف کرنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں گھڑی پر وقت دیکھ لیتا تھا۔ جب رات کے بارہ بجے تو مجھے باہر کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے جلدی سے گولیاں ریوالور میں ڈالیں۔ چیمبر کو بند کیا۔ لالٹین کی بتی اور نیچی کی اور اٹھ کر دروازے کو ذرا سا کھول کر باہر دیکھنے لگا۔ ایک سایہ کوٹھڑی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس وقت میں پستول کی نالی پر سائی لینسر چڑھا رہا تھا۔ ریوالور پر میرے ہاتھ کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ کیونکہ میں ابھی تک سائے کو پہچان نہیں سکا تھا۔ جب سایہ ذرا قریب آیا تو میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ میرا ساتھی کشمیری مجاہد غلام رسول تھا۔ میں نے دروازہ کھول دیا۔

غلام رسول نے اندر آتے ہی سخت لہجے میں کہا۔

"تمہیں اس طرح دروازہ نہیں کھولنا چاہئے تھا"

میں نے کہا۔

"میں نے دور سے آپ کو پہچان لیا تھا"

"کچھ بھی ہو"

وہ بولا۔

"یہ بات کسی بھی کمانڈو کو خطرے میں ڈال سکتی ہے"

اس نے جھک کر لالٹین کی بتی ذرا سی اونچی کردی۔ کوٹھڑی میں ہلکی ہلکی روشنی پھیل گئی۔ غلام رسول نے پوچھا۔

"کیا تم کمانڈو آپریشن کے لئے تیار ہو؟"

میں نے کہا۔

"بالکل تیار ہوں"

"ماشاء اللہ"

غلام رسول نے میرے کندھے کو دباتے ہوئے کہا۔

"آدھی رات کے بعد انٹیروگیشن سنٹر کے پیچھے ٹیلے پر گارڈ کی ڈیوٹیاں بدلتی ہیں۔ پہلے تین سپاہی چلے جاتے ہیں۔ دوسرے تین سپاہی آجاتے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"اس وقت بارہ بج چکے ہیں۔ میرا خیال ہے گارڈ ڈیوٹی بدل گئی ہوگی۔ ہمیں نکل چلنا چاہئے۔ کیا آپ جیپ ساتھ لائے ہیں؟"

غلام رسول بولا۔

"ہمارا آدمی جیپ لے کر نہر کنارے والے کھوکھوں کے پاس موجود ہو گا۔ تم اس کی فکر کرو۔ میں بھی تمہیں ٹارگٹ پر پہنچا کر جیپ میں جا کر بیٹھ جاؤں گا۔ تمہیں سب کچھ تیزی سے کرنا ہو گا۔ جتنی دیر کرو گے خطرہ بڑھتا جائے گا۔"

میں نے کہا۔

"میں ایک سیکنڈ بھی ضائع نہیں کروں گا"

"تو پھر چلو۔"

اس نے لالٹین بجھا دی۔ ہم کوٹھڑی سے باہر آئے۔ غلام رسول نے اسے تالا لگایا اور ہم رات کے اندھیرے میں شہر کی طرف چل پڑے۔ اب ہم ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ سائی لینسر والا ریوالور میری جیب میں تھا۔ دھماکہ خیز مواد والی شیشی بھی میری جیب میں تھی۔ ہم شہر کی بیرونی دیوار کے ساتھ بہنے والی نہر کے پاس پہنچ گئے۔ اب ہم آہستہ آہستہ چلنے لگے تھے۔ ایک جگہ دو آدمی آپس میں باتیں کرتے چلے آرہے تھے۔ ہم جلدی سے ایک طرف اندھیرے میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ جب وہ گزر گئے تو اٹھ کر آگے چل پڑے۔ غلام رسول نے نہر کے کنارے پر چڑھتے ہوئے کہا۔

"وہ سامنے سیوریج پائپ کی سرنگ ہے۔ کیا تمہیں نظر آرہی ہے؟"

میں نے غور سے نہر کے کنارے کو تکتے ہوئے کہا۔

"ہاں"

"اب سرنگ کے بالکل سامنے جو دو لکڑی کے کھوکھے ہیں ان کے درمیان دیکھو۔ وہاں میرا آدمی جیپ میں بیٹھا ہے۔"

میں نے ادھر دیکھا تو وہاں اندھیرے میں مجھے ایک جیپ کھڑی نظر آئی۔

"میں اسے بھی دیکھ رہا ہوں"

"گل خان کو لے کر تم سیدھا اس جیپ میں آجاؤ گے۔ آگے ہمارا کام شروع ہو جائے گا اب اللہ کا نام لے کر آگے بڑھو۔ ٹارگٹ تمہارے سامنے ہے"

میں نے دل میں کلمہ شریف پڑھا اور چند قدم چلنے کے بعد رات کے اندھیرے میں نہر میں اتر گیا۔ سرنگ کا پائپ والا دہانہ میرے سامنے تھا۔ میں سرنگ میں داخل ہو گیا۔

سرنگ میں داخل ہوتے ہی میں سیمنٹ کے بڑے پائپ پر اس طرح بیٹھ گیا جس طرح آدمی گھوڑے پر بیٹھتا ہے۔ میں نے آہستہ آہستہ آگے کھسکنا شروع کر دیا۔ جیسے جیسے میں سرنگ میں آگے بڑھ رہا تھا اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ سرنگ کے اندر ہوا مرطوب اور بوجھل تھی۔ آکسیجن اتنی نہیں تھی جتنی سرنگ کے باہر تھی۔ چنانچہ میرا سانس اپنے آپ تھوڑا سا تیز ہو گیا تھا۔ اس وقت میں جموں شہر کی گنجان ہندو آبادی کی زمین کے نیچے تھا۔ مجھے صرف ایک ہی ڈر تھا کہ کہیں آگے جا کر سرنگ بند نہ ہو جائے۔ یعنی سیوریج کا پائپ دیوار میں گھس کر آگے چلا گیا ہو اور کسی آدمی کے آگے جانے کا راستہ بند ہو گیا ہو۔ میں دونوں ہاتھ پائپ پر رکھ کر اپنے جسم کو آگے گھسیٹ لیتا تھا۔ ایک مقام پر پہنچ کر پائپ بائیں جانب مڑ گیا۔ یہاں میرے چہرے کے ساتھ مکڑیوں کے کتنے ہی جالے چمٹ گئے۔ میں نے ایک مکڑی کو اپنے گال پر تیزی سے اوپر کو جاتے محسوس کیا۔ میں نے جلدی سے ہاتھ مار کر اسے مسل ڈالا۔ آگے بہت جالے تھے۔ بلکہ جالوں کا جال تنا ہوا تھا۔ مجھے پہلے ان جالوں کو ہاتھوں سے ہٹانا پڑتا تھا۔

فضا میں آکسیجن مزید کم ہو گئی تھی۔ میں منہ کھول کر سانس لینے لگا۔ سرنگ کچھ دور جا کر مزید تنگ ہو گئی۔ مٹی گیلی تھی اور پائپ اس میں آدھا ڈوبا ہوا تھا۔ میں پائپ پر بیٹھ کر آگے چلنے لگا۔ ایک جگہ مجھے تازہ ہوا کا احساس ہوا۔ یہاں اوپر کسی جگہ ہوا دان لگا ہوا تھا جو اندھیرے میں مجھے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اندھیرا اتنا گہرا ہو گیا تھا کہ مجھے اپنے ہاتھ نظر نہیں آ رہے تھے۔ دو تین کاک روچ پتلون کے اندر میری پنڈلیوں پر چڑھ گئے۔

یں نے انہیں وہیں کچل دیا۔ میں کافی دور سرنگ کے اندر آ گیا تھا۔ مگر ابھی تک وہ جگہ نہیں آئی تھی جہاں اوپر سیوریج کا ڈھکنا تھا۔ اور جہاں سے مجھے باہر نکلنا تھا۔ میں آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ ایک دفعہ پائپ پھر گھوم گیا۔ اس کے بعد پائپ سیدھا ہو گیا۔ مجھے کھائی تو کچھ نہیں دے رہا تھا۔ سیمنٹ کے پائپ سے ہی میں سمت کا اندازہ لگا لیتا تھا۔ لٹکتے وئے جالے اسی طرح میرے چہرے پر آتے اور میں انہیں ہاتھوں سے ہٹاتا جاتا۔ مجھے ں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں کسی اندھیری قبر میں چلا جا رہا ہوں۔ اگر مجھے اس قسم کی شقتوں کی تربیت نہ ملی ہوتی اور میں سخت جان نہ ہو گیا ہوتا تو یقین کریں یا تو میں بے ش ہو جاتا یا خوف کے مارے چیخنا چلانا شروع کر دیتا۔ مگر میں اپنے حواس کو اپنے قابو ں رکھ کر پورے حوصلے اور ضبط کے ساتھ پائپ پر آگے کھسک رہا تھا۔

اب پائپ بالکل سیدھ میں جا رہا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ سرنگ تھوڑی کشادہ ہو گئی ہے۔ میں نے اندھیرے میں اپنے دائیں بائیں ہاتھ چلائے۔ پہلے میرے ہاتھ سرنگ کی واروں سے ٹکرا جاتے تھے۔ اب ایسا نہ ہوا۔ میں نے ایک بازو لمبا کر کے ہاتھ آگے ھایا تو میرا ہاتھ دیوار کی گیلی مٹی سے ٹکرایا۔ گرمی کی وجہ سے میرا جسم پسینے میں شرابور گیا تھا۔ میں پائپ پر بیٹھا کھسک رہا تھا کہ اچانک میں ایک دوسرے پائپ سے ٹکرایا۔ ں وہیں رک گیا۔ ہاتھ سے ٹٹول کو دیکھا۔ یہ پائپ اوپر کی طرف چلا گیا تھا۔ ضرور یہ کوئی ہوادان تھا جس میں سے پائپ کے اندر کی گیس باہر نکل رہی تھی۔ میں پائپ کے پہلو سے رینگ کر آگے نکل گیا۔ آگے دوبارہ پائپ پر بیٹھ گیا۔ پانچ چھ منٹ چلا ہوں گا کہ آگے یوار آ گئی۔ میں سمجھ گیا کہ میں ٹارگٹ پر پہنچ گیا ہوں۔ میں نے سامنے والی دیوار کو ہاتھ ے ٹٹولا۔ میرے دل میں اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ دیوار کے بالکل ساتھ لگی لوہے کی یڑھی اوپر جا رہی تھی۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں اوپر مین ہول کا ڈھکن تھا۔ اس کا مطلب تھا ہ میں زمین کے اندر ہی اندر رینگتا ہوا انیروگیشن سنٹر کی عمارت کے نیچے پہنچ گیا تھا۔ ں نے اوپر منہ اٹھا کر دیکھنے کی کوشش کی۔ اوپر کچھ دکھائی نہ دیا۔ میں نے اللہ کا نام لیا ر لوہے کے زینے کو پکڑ کر آہستہ آہستہ اوپر چڑھنے لگا۔ چھ سات زینے چڑھنے کے بعد

میرا سر چھت سے ٹکرایا۔ میں نے ایک ہاتھ چھت پر پھیرا۔ یہ لوہے کا ڈھکن تھا۔ مجھے اس ڈھکن کو اٹھا کر مین ہول سے باہر نکلنا تھا۔

یہ کام خطرناک تھا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ اوپر کیا صورت حال ہے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اوپر کوئی سپاہی نہ ہو۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ جس سپاہی کو میں نے دوربین سے یہاں گشت لگاتے دیکھا تھا وہ مین ہول کے پاس آکر کھڑا ہو گیا ہو۔ اگر میں نے ڈھکن کو اوپر کی جانب اٹھایا اور اس کی آواز پیدا ہوئی تو ڈوگرہ سپاہی ہوشیار ہو جائے گا اور رائفل کا رخ مین ہول کی طرف کر دے گا۔

میں اندر زیادہ دیر انتظار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وقت اس وقت بڑا قیمتی تھا۔ ابھی میرے سامنے پورا آپریشن پڑا تھا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے ڈھکن کو ذرا سا اوپر اٹھایا تو مجھے کسی کے قدموں کی آواز قریب آتی سنائی دی میں نے ہاتھ نیچے کر لئے۔ اتنا مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ ڈھکن سختی سے نہیں جما ہوا۔ کیونکہ میرے ذرا سے زور لگانے سے وہ اپنی جگہ سے ہل گیا تھا۔ یہ بھاری بوٹوں کی آواز تھی یقیناً ڈوگرہ سپاہی گشت کی ڈیوٹی پر تھا۔ بھاری بوٹوں کی چاپ میرے اوپر سے ہوتی ہوئی آگے نکل گئی۔ اس ڈوگرے کو واپس بھی آنا تھا۔ میں لوہے کے زینے کے ساتھ لگا رہا۔ بوجھل فضا کی وجہ سے مجھے سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔ میں سانس روک نہیں سکتا تھا۔ سپاہی کے بوٹوں کی آواز ایک بار پھر قریب آئی اور میرے اوپر سے ہو کر دوسری طرف چلی گئی۔ میں نے کان لگا رکھے تھے۔ بوٹوں کی آواز دور جا کر غائب ہو گئی۔ میرے لئے یہی ایک موقع تھا۔

میں نے دونوں ہاتھوں کی مدد سے مین ہول کے ڈھکن کو اوپر اٹھایا اور بڑے آرام سے آواز پیدا کئے بغیر ایک طرف رکھ دیا۔ فوراً گردن باہر نکالی اور ماحول کا جائزہ لیا۔ میں عمارت کی پہلی منزل کے باہر اس جگہ پر تھا جو مجھے غلام رسول نے دوربین کے ذریعے دکھائی تھی۔ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر میں مین ہول سے باہر نکلا اور ڈھکنا دوبارہ سوراخ کے اوپر رکھا اور رینگتا ہوا دیوار کی دوسری طرف اندھیرے میں چلا گیا۔ یہاں پودے اگے ہوئے تھے۔ میں اس طرف دیکھ رہا تھا جس طرف گشت لگانے والا سپاہی گیا تھا۔ وہ خدا

جانے کہاں چلا گیا تھا۔ واپس نہیں آرہا تھا۔ میں نے سامنے اس دروازے پر نظریں جما دیں جس کی سیڑھیاں نیچے ٹارچر چیمبرز کے تہہ خانوں میں اترتی تھیں۔ یہ دروازہ چھوٹا تھا اور محراب دار تھا۔ اسے میں نے مسجد کی چھت پر بیٹھ کر دوربین سے بھی دیکھا تھا۔ دروازہ بند تھا۔ گشت لگانے والا ڈوگرہ سپاہی شاید ادھر کہیں جا کر بیٹھ گیا تھا یا ہو سکتا ہے سو گیا ہو۔ لیکن مجھے یہی خیال کرنا تھا کہ وہ جاگ رہا ہے اور تھوڑی دیر بعد گشت لگاتا یہاں پہنچ جائے گا۔ میں نے جیب میں سے ریوالور نکال کر ہاتھ میں لے لیا تھا۔ میرے پیچھے انٹیروگیشن سنٹر کی دیوار تھی اور اس کے پیچھے اس ٹیلے کی ڈھلان تھی جس کے اوپر خاردار تاروں کی دیوار کے ساتھ تین ڈوگرہ سپاہی پہرے کی ڈیوٹی پر تھے۔ ان کی طرف میری پشت تھی۔ ایک بلب کچھ فاصلے پر دیوار کے ساتھ لگا جل رہا تھا۔ اس کی روشنی تہہ خانے کے دروازے پر پڑ رہی تھی۔ یہ روشنی کسی بڑے خطرے کا باعث بن سکتی تھی۔ اگر میں دروازے کی طرف جاتا ہوں اور ٹیلے کے اوپر جو ڈوگرے ڈیوٹی پر ہیں وہ مجھے دیکھ لیتے ہیں تو میرا مشن فیل ہو سکتا تھا۔ لیکن میں وہاں زیادہ دیر بیٹھا بھی نہیں رہ سکتا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ تہہ خانے کو جانے والے دروازے پر اندر سے تالا لگا ہوا ہے یا کھلا ہے۔ یہ میں دروازے کے پاس جا کر اسے دھکیل کر ہی معلوم کر سکتا تھا۔ میں نے آخری بار اس سمت نگاہ ڈالی جدھر ڈوگرہ سپاہی گیا تھا۔ ادھر اندھیرا تھا۔ کچھ دکھائی نہ دیا۔ سپاہی کہیں نہیں تھا۔ میں نے ریوالور ہاتھ میں لے لیا اور دوڑ کر تہہ خانے والے دروازے پر پہنچا اور اسے اندر کو دھکیلا۔ دروازہ کھلا تھا۔ میں جلدی سے اندر چلا گیا اور دروازے کو اسی طرح آہستہ سے بند کر دیا۔ یہ بات آج تک میری سمجھ میں نہیں آتی کہ یہ عمارت کا سب سے بڑا ٹارچر سنٹر تھا اور وہاں ایک ایک قدم پر سیکورٹی کا خیال رکھا گیا تھا مگر خدا جانے دروازہ ان لوگوں نے بند کیوں نہیں کیا تھا۔

میرے سامنے سیڑھیاں نیچے جا رہی تھیں۔ محراب دار چھت میرے سر سے کوئی دو فٹ اونچی تھی۔ اوپر ایک کمزور سی روشنی والا بلب روشن تھا۔ میں دیوار کے ساتھ لگ کر سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا سیڑھیاں اترنے لگا۔ پتھروں کو جوڑ کر یہ سیڑھیاں بنائی گئی

تھیں۔ جیسے جیسے میں نیچے اتر رہا تھا چھت بھی نیچی ہوتی جا رہی تھی اور میرے سر اور چھت کے درمیان دو فٹ کا فاصلہ برقرار تھا۔ نیچے ایک سرنگ نما راہ داری تھی۔ میں نے دیوار میں سے سر نکال کر دائیں بائیں دیکھا۔ نیچی چھت والی راہ داری میں چھت کے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کمزور روشنی والے بلب جل رہے تھے۔ راہ داری بالکل ویران پڑی تھی۔ میں آگے قدم اٹھانے ہی والا تھا کہ دور سے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں جلدی سے پیچھے ہو گیا۔ مگر میں وہاں سے گزرنے والے کو نظر آسکتا تھا۔ کیونکہ زینے میں روشنی ہو رہی تھی۔ پہلے سوچا کہ زینے کے اوپر بھاگ جاؤں۔ پھر سوچا کہ اوپر گیا تو بھی نظر آجاؤں گا۔ مجھے جو کچھ کرنا تھا وہیں رہ کر کرنا تھا۔ قدموں کی چاپ قریب آرہی تھی۔ یہ بھاری جوتوں کی آواز تھی۔ کوئی سنتری وہاں چل پھر کر پہرہ دے رہا تھا۔ میں دیوار کے بالکل ساتھ پشت لگا کر الرٹ ہو گیا۔ سائی لینسر والا ریوالور میرے سیدھے ہاتھ میں تھا۔

بوٹوں کی آواز تھپ تھپ کر کے قریب آرہی تھی۔ پھر بہت قریب آگئی اور اس کے بعد میں نے ایک وردی والے سنتری کو دیکھا جس کے کاندھے کے ساتھ رائفل لٹکی ہوئی تھی اور وہ اس طرح چل رہا تھا جیسے اس ڈیوٹی سے سخت بیزار ہو۔ اس نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ اتنا وقت نہیں تھا کہ میں اس کی گردن توڑ سکتا۔ وہ مجھ سے دو قدم دور ہو گیا تھا اور مزید دور ہو رہا تھا۔ میرا ریوالور والا ہاتھ اپنے آپ اوپر اٹھا۔ میں نے سنتری کے سر کے پچھلے حصے کا نشانہ لیا اور ٹریگر دبا دیا۔ ٹھک کی آواز پیدا ہوئی اور دوسرے لمحے ڈوگرا سنتری منہ کے بل گر پڑا۔ میرے ریوالور کی اتنی آواز نہیں آئی تھی مگر جب وہ فرش پر گرا تو اس کی رائفل بھی فرش سے ٹکرائی اور شور پیدا ہوا۔ میں اپنی جگہ پر اسی طرح ساکت کھڑا رہا۔ کہ ہو سکتا ہے آواز سن کر کوئی دوسرا سنتری وہاں آجائے۔ ایک منٹ گزر جانے پر بھی جب کوئی نہ آیا تو میں نے دوڑ کر سنتری کی لاش کو ایک طرف دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ اس کے بعد میں راہ داری کی دیوار کے ساتھ لگ کر آگے کھسکنے لگا۔ مجھے کسی کے کراہنے کی آواز آئی۔ میں تین چار قدم کھسک کر آگے گیا تھا کہ ایک جگہ دیوار سے پھیکی سی روشنی باہر آتی دکھائی دی۔ قریب جا کر دیکھا کہ یہ ایک کوٹھڑی تھی جس کے

آگے لوہے کا دروازہ لگا تھا۔ کراہنے کی آواز اس کوٹھڑی سے آرہی تھی۔ میں نے سلاخوں میں سے جھانک کر دیکھا۔

بڑا مدھم سا بلب دیوار کے ساتھ جل رہا تھا۔ اس کی دھندلی روشنی میں مجھے ایک انسانی ہیولا دیوار کے آگے صف پر لیٹا ہوا دکھائی دیا۔ یہی آدمی کراہ رہا تھا۔ میں نے آہستہ سے آواز دی۔

"گل خان؟"

کراہنے کی آواز ایک دم رک گئی۔ انسانی ہیولا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے پوچھا۔

"اب کیا بات ہے۔ تم لوگ ایک ہی بار مجھے ختم کیوں نہیں کر دیتے؟"

میں نے آہستہ سے کہا۔

"گل خان یہ میں ہوں"

جب میں نے اسے اپنا نام بتایا تو جیسے اس انسان کے بدن میں بجلی پیدا ہو گئی۔ میں نے گل خان کو اس کی آواز سے پہچان لیا تھا۔ وہ اٹھ کر ایک پاؤں دبا کر چلتا سلاخوں کے پاس آگیا۔ گل خان پہچانا نہیں جا رہا تھا۔ اس کی ڈاڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ گل خان کی جیسے ساری توانائیاں اور طاقتیں واپس آگئی تھیں۔ کہنے لگا۔

"چابی سنتری کے پاس ہو گی"

میں نے دیکھا کہ سلاخوں والے دروازے پر تالا پڑا تھا۔ میں تیزی سے سپاہی کی لاش کے پاس گیا۔ اس کی بیلٹ کو دیکھا۔ ایک جانب چابیوں کا گچھا لگا ہوا تھا۔ میں نے جلدی جلدی اسے کھینچ کر اتارا اور دروازے پر آکر چابیاں لگا لگا کر قفل کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ گل خان نے کہا۔

"اگر تم نے سنتری کو ہلاک کر دیا ہے تو اس کی جگہ لینے کے لئے دوسرا سنتری آنے ہی والا ہو گا۔ وہ چابی لگاؤ۔ وہ"

گل خان نے سلاخوں میں سے ہاتھ باہر نکال کر گچھے میں سے ایک چابی پر انگلی

رکھی۔ میں نے وہ چابی لگائی تو قفل کھل گیا۔ گل خان نے جو میلی کچیلی سی چادر اوڑھ رکھی تھی وہ وہیں پھینکی اور باہر آ گیا۔ میں نے اسے کچھ نہ کہا اور زینے کی طرف تیز تیز قدموں سے چلا۔ گل خان میرے پیچھے پیچھے تھا۔ ہم راہ داری کی دیوار کے ساتھ لگ کر چل رہے تھے۔ پھر زینہ آ گیا۔ ہم زینہ چڑھ کر اوپر والے دروازے پر آ گئے۔ گل خان کہنے لگا۔

"اوپر بھی سنتری گشت کرتا ہے"

میں نے کہا۔

"جب میں آیا تھا تو میں نے اسے دیکھا مگر وہ گشت لگاتے ہوئے اس طرف گیا اور پھر واپس نہیں آیا۔"

گل خان نے سرگوشی میں کہا۔

"ہو سکتا ہے وہ سگریٹ بیڑی پینے کی جگہ چھپ کر بیٹھ گیا ہو۔ ٹھہرو پہلے میں باہر نکلتا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "نہیں گل خان پہلے میں باہر جاؤں گا۔ تم اسی جگہ بیٹھ جاؤ۔"

گل خان دروازے کے پاس پتھر کے زینے پر بیٹھ گیا۔ میں نے آہستہ سے دروازہ کھول کر باہر جھانک کر دیکھا۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ ڈوگرہ سنتری چھ سے سات آٹھ قدموں کے فاصلے پر میری طرف چلا آ رہا تھا۔ میں دروازہ آہستہ سے بند کر کے وہیں اندر کی جانب زینے پر بیٹھ گیا۔ جب سنتری ذرا آگے چلا گیا تو گل خان کہنے لگا۔

"اس کے ہوتے ہوئے ہم یہاں سے فرار نہیں ہو سکیں گے۔ تمہارے پاس سائلینسر والا ریوالور موجود ہے۔ اس سنتری کو بھی فوراً ٹھکانے لگا دو یہ بہت ضروری ہے۔"

میں نے ریوالور پر اپنی گرفت مضبوط کی اور سنتری کے واپس آنے کا انتظار کرنے لگا۔ وہ تھوڑا آگے جا کر واپس پلٹ گیا تھا۔ اور بھاری قدم رکھتا چلا آ رہا تھا۔ میں نے دل میں اللہ پاک کو یاد کیا۔ اور باہر کی آواز پر کان لگا دیئے جیسے ہی سنتری کے قدموں کی آواز دروازے کے قریب آئی میں نے کراہنا شروع کر دیا۔ گل خان گھبرا کر ایک طرف ہٹ

گیا۔

"یہ تم کیا کرنے لگے ہو؟"

میں نے اسے ہاتھ کا اشارہ کیا کہ چپ رہو۔ میرے کراہنے کی آواز سنتے ہی سنتری دوڑ کر دروازے کی طرف آیا۔ اس نے دروازہ ایک دم کھول دیا۔

"کون ہو؟"

میں نے وہیں نیچے زینے پر بیٹھے بیٹھے ڈوگرہ سنتری کی گردن کا نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔ ٹھک کی آواز کے ساتھ ہی میرے ریوالور کی گولی سنتری کے حلق کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔ وہ منہ کے بل سیڑھیوں میں گر پڑا۔ مین نے گل خان سے کہا۔

"میرے پیچھے پیچھے آ جاؤ۔ مین ہول ہے۔ ہمیں مین ہول میں اترنا ہے۔"

ہم آگے پیچھے دروازے میں سے نکل آئے۔

مجھے سامنے والے ٹیلے پر جو سنتری پہرہ دے رہے تھے ان کی طرف سے خطرہ تھا۔ اگر ان کی نظر اس طرف پڑ گئی یا انہیں ادھر تھوڑا سا بھی شک پڑا کہ کچھ ہل چل ہو رہی ہے یا انہوں نے محسوس کیا کہ یہاں جو سنتری پہرہ دیتا تھا وہ نظر نہیں آ رہا تو وہ اسے ضرور آواز دیں گے اور جب سنتری کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا تو سارا معاملہ الٹ جائے گا۔ میں دروازے میں سے نکلتے ہی بیٹھ گیا۔ گل خان ابھی تک دروازے کے اندر زینے پر ہی تھا۔ میں نے اسے سرگوشی میں کہا۔

"مین ہول سامنے ہے۔ ہم رینگ کر وہاں تک جائیں گے۔ ٹیلے پر پہرہ لگا ہے"

میں زمین پر لیٹ گیا۔ اور آہستہ آہستہ مین ہول کی طرف رینگنا شروع کر دیا۔ گل خان میرے پیچھے رینگتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ مین ہول کے پاس پہنچ کر میں نے اس کا ڈھکن اٹھا کر ایک طرف رکھا اور ایک طرف ہٹ کر گل خان سے دھیمی آواز میں کہا۔

"نیچے اتر جاؤ۔ دیوار کے ساتھ لوہے کی سیڑھی لگی ہوئی ہے۔"

گل خان پر نقاہت طاری تھی۔ میں نے اسے ذرا ذرا لنگڑا کر چلتے بھی دیکھا تھا۔ لیکن وہ ہمارا ماسٹر سپائی تھا اور ایک زمانے میں اس نے بھی ہوشنگ آباد میں کمانڈو کی ٹریننگ

حاصل کی تھی۔ اس کا حوصلہ فرار کا راستہ نظر آنے پر بلند ہو گیا ہوا تھا۔ وہ مین ہول میں اتر گیا۔ میں نے اوپر سے کہا۔

"نیچے سیمنٹ کا بڑا پائپ ہے اس پر بیٹھ جاؤ"

اس کے ساتھ ہی میں بھی مین ہول میں اتر گیا۔ ابھی میں مین ہول کا آہنی ڈھکن کھینچ کر اوپر رکھ ہی رہا تھا کہ ٹیلے کی طرف سے کسی سپاہی نے اس سنتری کو آواز دی جو یہاں گارڈ ڈیوٹی پر متعین تھا۔ میں ڈھکن کو اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کر رہا تھا مگر آہنی ڈھکن شاید کسی جگہ اٹک گیا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے بالکل نہیں ہل رہا تھا۔ ٹیلے کی جانب سے دوسری آواز بلند ہوئی۔ جب کوئی جواب نہ ملا تو سٹین گن کا فائر ہوا۔ مجھے سامنے والی دیوار سے گولیوں کے ٹکرانے کی آواز آئی۔ نیچے سے گل خان نے پوچھا۔

"اوپر کیا ہو رہا ہے نیچے کیوں نہیں آتے؟"

کچھ آدمیوں کے دوڑنے بھاگنے کی آوازیں آنے لگیں۔ میں ڈھکن کو اپنی طرف کھینچ رہا تھا مگر ڈھکن جیسے زمین سے چمٹ گیا تھا۔ مین ہول کا بند ہونا بہت ضروری تھا۔ اس کے کھلے رہنے کا مطلب تھا کہ سپاہی ہمیں سرنگ کے اندر اتر کر بھون سکتے تھے۔ میں نے کہا۔

"ڈھکن کہیں پھنس گیا ہے"

ٹیلے کی طرف سے سٹین گنیں فائر ہونے لگیں۔ سپاہیوں کے سیٹیاں بجانے کی بھی آوازیں آنے لگیں۔ میں نے دل میں اپنے اللہ کو یاد کیا اور کہا اے میرے مولا! میری مدد فرما۔ اس کے بعد میں نے زور لگا کر جھٹکے سے ڈھکن کو کھینچا تو وہ میری طرف آ گیا۔ میں نے اسے مین ہول کے گول سوراخ کے اوپر اچھی طرح جمایا اور لوہے کا زینہ اتر گیا۔ نیچے گھپ اندھیرا تھا۔ اوپر گولیاں چل رہی تھیں۔ سپاہی ایک دوسرے کو آوازیں دے کر ہوشیار کر رہے تھے۔ گل خان کے فرار کا پتہ چل گیا تھا۔

میں نے گل خان سے کہا۔

"ان لوگوں کو تمہارے بھاگنے کا علم ہو گیا ہے۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ اس پائپ

کے اوپر بیٹھ جاؤ۔ میں تمہارے آگے آگے چلتا ہوں۔"

نہ میں گل خان کو دیکھ سکتا تھا نہ اسے میری صورت نظر آ رہی تھی۔ میں اس کے اوپر سے ہو کر سیمنٹ کے پائپ پر بیٹھ گیا اور رینگتے ہوئے ہماری واپسی کا سفر شروع ہو گیا۔ گل خان نے پوچھا۔

"یہ پائپ کس طرف نکلتا ہے؟"

میں نے کہا۔

"میرے پیچھے پیچھے آ جاؤ گل خان سب ٹھیک ہو جائے گا"

ہم سرنگ میں نہر والے دہانے کی طرف آہستہ آہستہ روانہ ہو گئے۔ ہم گھسٹ گھسٹ کر چل رہے تھے۔ جہاں سرنگ تنگ ہو گئی اور زمین پائپ کے تقریباً برابر ہو گئی تھی وہاں ہم اوندھے ہو کر رینگنے لگے۔ میں گل خان کو اندھیرے میں گائیڈ کرتا جا رہا تھا۔ مجھے یہ بھی اندیشہ تھا کہ فائرنگ کی آواز غلام رسول بھی سن رہا ہوگا۔ کہیں وہ کسی دوسری طرف نہ چلا جائے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ ہمیں مین ہول میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ لیا گیا ہو اور جب ہم نہر میں سرنگ سے باہر نکلنے لگیں تو سامنے ڈوگرہ سپاہی ہمارے استقبال کو موجود ہوں اور ہم پر فائر کھول دیں۔ باہر کی مجھے کچھ خبر نہیں تھی۔

گل خان کا دم پھول گیا تھا۔ کہنے لگا۔

"یہ سرنگ کتنی لمبی ہے؟"

میں نے کہا۔

"زیادہ لمبی نہیں ہے۔ تھک گئے ہو تو رک کر سانس لے لیتے ہیں۔"

وہ سانس درست کرتے ہوئے بولا۔

"سرنگ کے باہر ضرور ڈوگرہ پولیس یا فوجی سپاہی موجود ہوں گے۔ انہوں نے ہمیں مین ہول میں اترتے دیکھ لیا ہوگا۔"

میں نے کہا۔

"اب جو بھی ہوگا دیکھا جائے گا۔ ہمیں یہاں سے جتنی جلدی ہو نکل جانا چاہیے۔"

ہم سرنگ میں جتنی تیز رینگ سکتے تھے۔ رینگنے لگے آخر ہمیں ایک جگہ تازہ ہوا آتی محسوس ہوئی۔ گل خان میرے پیچھے آرہا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ یہ تازہ ہوا سرنگ کے نہر والے دہانے سے آرہی ہے۔

"ہم باہر نکلنے والے ہیں"

گل خان نے کہا۔

"خدا کا شکر ہے"

انٹیروگیشن کی اذیتیں برداشت کر کر کے گل خان کی جسمانی حالت پوری طرح صحت مند نہیں تھی۔ وہ جذبے کے زور پر چلا آرہا تھا۔ اس کی آواز میں نقاہت تھی۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"تم لنگڑا کر کیوں چل رہے تھے؟"

اس نے کہا۔

"ایک ٹانگ پر انہوں نے گرم راڈ لگائے تھے۔"

میں نے پوچھا۔

"وہاں اور کتنے مجاہد ہیں۔"

گل خان نے کہا۔

"مجھے کچھ معلوم نہیں۔ رات کو کسی وقت دوسری کوٹھڑیوں سے انسانی چیخوں کی آواز سنائی دیا کرتی تھی۔"

اس کا سانس باتیں کرنے سے پھول گیا۔ میں نے کہا۔

"گل خان! اب کوئی بات نہ کرنا۔"

تازہ ہوا زیادہ آنے لگی تھی۔ آخر ہم سرنگ کے دہانے پر پہنچ گئے۔ پہلے میں نہر میں نکلا۔ میں نے سر اوپر کر کے دائیں دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ فائرنگ کی آواز وہاں نہیں آرہی تھی۔ فائرنگ رک گئی تھی۔ گل خان بھی سرنگ سے نکل آیا۔ ہم نہر کے پانی میں کھڑے تھے۔ پانی ہمارے گھٹنوں تک تھا۔ میری نظر سامنے والے کھوکھوں کے درمیان جو

جگہ تھی وہاں جمی ہوئی تھی۔ میں پریشان ہو گیا تھا کیونکہ مجھے اندھیرے میں وہاں غلام رسول کی جیپ کا ہیولا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ گل خان کہنے لگا۔

"یہاں سے نکلو۔ ہم یہاں کیوں کھڑے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"سامنے والے کنارے کی طرف نکل آؤ۔"

ہم نہر میں جھک کر چلتے سامنے والے کنارے پر آگئے۔ کنارے پر آتے ہی میں نے گل خان سے کہا۔

"وہاں اندھیرے میں آجاؤ۔"

نہر کے کنارے کی ڈھلان سے اتر کر ہم لکڑی کے کھوکھوں کی جو دکانیں تھیں ان کے پیچھے اندھیرے میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ میں بے چینی سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ گل خان بولا۔

"وہ آدمی نہیں آیا کیا؟"

میں نے کہا۔

"میں اسی کو تلاش کر رہا ہوں۔"

اتنے میں ایک کھوکے کے عقب سے انسانی سایہ نکل کر تیزی سے ہماری طرف بڑھا۔ یہ غلام رسول تھا۔ آتے ہی بولا۔

"جلدی سے میرے ساتھ آؤ۔ جلدی کرو۔"

ہم اٹھ کر اس کے پیچھے چلنے لگے۔ جہاں کھوکھوں کی دکانیں ختم ہو جاتی تھیں وہاں درختوں کے نیچے ایک جیپ کھڑی تھی۔ جیپ چاروں طرف سے بند تھی۔ غلام رسول نے ترپال اٹھا کر کہا۔

"اندر بیٹھ جاؤ۔"

ہم دونوں جیپ میں گھس کر بیٹھ گئے۔ غلام رسول نے ترپال گرا دی۔ دوسرے لمحے جیپ کا انجن سٹارٹ ہوا اور جیپ ایک طرف تیزی سے چل پڑی۔ جیپ پہلے ہموار

راستوں پر چلتی رہی پھر وہ بار بار اچھلنے لگی۔ جیسے پتھروں پر چل رہی ہو۔ اس کے بعد پھر کوئی ہموار سڑک آگئی۔ جیپ میں اندھیرا تھا۔ میں نے گل خان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"گل خان! تم ٹھیک تو ہو ناں؟"

"ہاں" گل خان نے کمزور آواز میں کہا۔

غلام رسول اپنے ڈرائیور کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ ہمارے درمیان میں لکڑی کی دیوار تھی۔ جیپ کی رفتار تیز ہو گئی تھی۔ کتنی دیر تک جیپ سیدھی سڑک پر چلتی رہی پھر اس نے تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد موڑ مڑنے شروع کر دیئے پھر چڑھائیاں اترائیاں شروع ہو گئیں۔ جیپ نیم پہاڑی علاقے سے گزر رہی تھی۔ ایک جگہ جیپ دیر تک نشیب میں چلتی گئی۔ پھر ایک جانب مڑ گئی۔ جیپ کے ساتھ جھاڑیوں کے ٹکرانے کی آوازیں آنے لگیں۔ جیپ کی رفتار بھی ہلکی ہو گئی تھی۔ جیپ ایک طرف گھومی اور پھر رک گئی۔ غلام رسول نے پیچھے آکر ترپال کی رسیاں کھول کر اسے ایک طرف ہٹا دیا۔ باہر اندھیرا تھا مگر اندھیرے میں ہمیں غلام رسول نظر آرہا تھا۔ وہ بولا۔

"آجاؤ"

میں جیپ سے نیچے کود گیا۔ پھر گل خان کو سہارا دے کر نیچے اتارا۔ غلام رسول نے گل خان سے کہا۔

"تم ہمارے بہادر مجاہد ہو گل خان۔ فکر نہ کرو اب تم اپنے آدمیوں میں ہو۔ ہم تمہیں بہت جلد صحت مند کر دیں گے۔"

میں نے اوپر دیکھا درختوں کے درمیان سے آسمان پر چمکتے ہوئے ستارے نظر آرہے تھے۔ غلام رسول ہمیں لے کر درختوں میں ایک طرف چلنے لگا۔ میں نے اسے بتایا کہ جب میں مین ہول میں داخل ہونے لگا تھا تو وہاں زبردست فائرنگ شروع ہو گئی تھی۔ غلام رسول بولا۔

"فائرنگ کی آواز میں نے بھی سنی تھی۔ اسی لئے میں جیپ وہاں سے نکال کر دوسری

جگہ لے گیا تھا۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ تمہیں مین ہول میں داخل ہوتے کسی نے نہیں دیکھا۔

"میں نے کہا۔"

"میرا خیال بھی یہی ہے کہ مجھے کسی نے نہیں دیکھا تھا۔"

غلام رسول کہنے لگا۔

"خیال کیا ہے۔ تمہیں اگر انہوں نے مین ہول میں داخل ہوتے دیکھ لیا ہوتا تو تم دونوں میں سے کوئی بھی زندہ نہ ہوتا۔"

غلام رسول کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہنے لگا۔

"یہ تو طے ہے کہ گل خان کے فرار ہونے کا سب کو پتہ چل گیا ہے اور اسی وقت جموں شہر کی سپیشل پولیس اور ملٹری انٹیلی جنیس نے سارے علاقے کو گھیرے میں لے لیا ہو گا اور گل خان کی تلاش شروع ہو گئی ہو گی۔ مگر یہاں تم لوگ محفوظ ہو گے۔"

میں نے کہا۔

"کیا ہم کسی خاص خفیہ ٹھکانے پر جا رہے ہیں؟"

غلام رسول بولا۔

"یہی سمجھ لو۔"

گل خان میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر آہستہ آہستہ ہمارے ساتھ ہی چل رہا تھا۔ اس نے مجھ سے دلی سے میرے نکلنے کے بعد کی باتیں شروع کر دیں۔ کہنے لگا۔

"جب تمہیں ان لوگوں نے اپنے جال میں پھنسا کر امرتسر جیل کی طرف روانہ کیا تو اس کے فوراً بعد کانگریس مسلمان خدا بخش کے گھر پر چھاپہ مارا کہ وہ ایک پاکستانی جاسوس کو کہاں سے لے کر ان کے تربیتی سنٹر میں بھرتی کرانے آگیا تھا؟ کانگریسی مسلمان نے اپنی جان بچانے کے لئے میرا نام لے دیا۔ کہ میرے پاس گل خان اس نوجوان کو لے کر آیا تھا۔ پولیس نے میرے ہاں چھاپہ مارا اور مجھے گرفتار کر کے لال قلعے میں لے گئی۔ بس کچھ نہ پوچھو اس کے بعد جو تشدد اور غیر انسانی اذیتوں کا دور شروع ہوا ہے۔ مگر میں نے بھی

زبان نہیں کھولی۔"

غلام رسول کہنے لگا۔

"ہمارے ہر حریت پسند مجاہد کی یہی شان ہے کہ اگر وہ پکڑا جائے تو موت کو ہنسی خوشی گلے لگا لیتا ہے مگر اپنے کسی ساتھی کا نام اور اپنے ہائیڈ آؤٹ کا پتہ نہیں بتائے گا۔"

گل خان نے کہا۔

"مجھے اس انٹیروگیشن سنٹر میں ہی پتہ لگ گیا تھا کہ ایک پاکستانی جاسوس امرتسر جیل سے فرار ہو گیا ہے۔ میں نے جب سنا کہ اس جاسوس کو دلی سے پکڑ کر لایا گیا تھا تو میں فوراً سمجھ گیا کہ یہ تم ہی ہو مجھے خوشی ہوئی تھی کہ کم از کم تمہیں بھارتی درندوں کے تشدد سے تو نجات ملی۔"

چاند نکل آیا تھا۔ یہ پورا چاند نہیں تھا۔ اس کی روشنی بھی چودھویں کے چاند ایسی نہیں تھی۔ پھر بھی اتنی چاندنی ضرور ہو گئی تھی کہ ہمیں آس پاس کی جھاڑیاں اور درخت اور ٹیلے نظر آنے لگے تھے۔ میں اور گل خان آہستہ آہستہ باتیں کرتے جا رہے تھے۔ اس نے میرے کندھے کا سہارا لیا ہوا تھا۔ مجاہد غلام رسول ذرا آگے چل رہا تھا۔ ایک ہم نشیب میں اترے۔ یہ ایک گھاٹی تھی۔ آگے تھوڑی سی کھلی زمین آ گئی۔ یہاں میں نے اونچی نیچی پتھروں کی ڈھیریاں دیکھیں تو سمجھ گیا کہ یہ کوئی ویران قبرستان ہے۔ آگے آئے تو قبروں پر جھکی ہوئی دو چار جھیلیں نظر آئیں۔ غلام رسول نے بتایا کہ یہ عیسائیوں کا بہت پرانا قبرستان ہے۔ پندرہ بیس قبریں ہی ادھر ادھر بنی ہوئی تھیں۔ کئی قبروں کے اوپر سے پتھر ہٹے ہوئے تھے اور گڑھے پڑ گئے ہوئے تھے۔ لگتا تھا کہ اس قبرستان میں اب کوئی اپنے مردے دفنانے نہیں آتا۔ غلام رسول ایک دیوار کے پیچھے ہو گیا۔ دیوار پر میں نے جنگلی بیل چڑھی ہوئی دیکھی۔ وہ دیوار کے پیچھے جا کر رک گیا۔ ہم بھی رک گئے۔ یہاں جھاڑیوں کے درمیان ایک قبر پر صلیب لگی ہوئی تھی۔ آدھی صلیب جنگلی سرکنڈوں میں چھپ گئی تھی۔ غلام رسول نے مجھ سے کہا۔

"میرے ساتھ اس پتھر کی سل کو اٹھاؤ"

قبر کے اوپر پتھر کی ایک چوڑی صلیب پڑی تھی۔ ہم نے مل کر سل کو ہٹا دیا۔ نیچے قبر کا گڑھا تھا۔ غلام رسول گڑھے میں اتر گیا۔ کہنے لگا۔

"تم بھی نیچے آ جاؤ"

پھیکی چاندنی میں غلام رسول قبر کے گڑھے میں جیسے غائب ہو گیا۔ پہلے میں قبر میں اترا۔ اس کے بعد میں نے گل خان کو سہارا دے کر گڑھے میں اتار لیا۔ ہم نے دیوار کے نیچے دیکھا۔ وہاں غلام رسول اندھیرے میں بیٹھا درخت کی کٹی ہوئی شاخوں کو ادھر ادھر ہٹا رہا تھا۔ یہاں قبر کے پہلو میں جھاڑیوں کی شاخیں ہٹانے سے ایک شگاف نظر پڑا۔ غلام رسول اس میں داخل ہو گیا۔ میں اور گل خان بھی جھک کر شگاف میں داخل ہو گئے۔ اندر جا کر میں حیران رہ گیا۔ قبر کے پہلو میں یہاں ایک دالان تھا جس میں باقاعدہ ستون لگے ہوئے تھے۔ دالان میں تازہ ہوا بھی آ رہی تھی۔ فرش پر خشک گھاس بچھی ہوئی تھی۔ غلام رسول نے موم بتی روشن کر دی۔ کونے میں ایک مٹکا رکھا تھا جس کے ڈھکن کے اوپر پلاسٹک کا ڈونگا پڑا تھا۔ ہم خشک گھاس پر بیٹھ گئے۔ غلام رسول کہنے لگا۔

"یہ جگہ کچھ عرصہ پہلے ہماری خفیہ کمیں گاہ ہوا کرتی تھی۔ کل میں نے اسے صاف وغیرہ کروا کر تازہ پانی کا مٹکا بھی رکھوا دیا تھا۔"

گل خان لیٹ گیا تھا۔ ہم نے اس کی ٹانگ کا زخم دیکھا۔ وہاں سلاخ سرخ کر کے لگائی تھی۔ زخم خراب ہو رہا تھا غلام رسول نے کہا۔

"میں زخم پر لگانے کے لئے دوائی اور پٹیاں لے کر آؤں گا۔ تم لوگ دن کے وقت یہاں چھپے رہو گے۔ باہر نکلنا ہو تو صرف رات کے وقت نکلنا اور وہ بھی بڑی احتیاط کے ساتھ۔ گل خان کے فرار کے بعد انٹیلی جنس کے آدمی سارے شہر میں پھیل جائیں گے۔ ہو سکتا ہے کوئی آدمی اس طرف بھی آ نکلے۔ اب میں چلتا ہوں۔ یہاں ہم نے ایک طرف تازہ ہوا کا بندوبست کر رکھا ہے۔ میں دن نکلنے کے بعد کسی وقت آؤں گا۔"

غلام رسول چلا گیا۔ جاتے ہوئے وہ قبر کے اوپر پتھر کی سل ڈال گیا۔ میں اور گل خان کچھ دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ گل خان کی ٹانگ کا زخم درد کر رہا تھا مگر وہ ایک

سرفروش کمانڈو کی طرح درد کو برداشت کئے ہوئے تھا۔ موم بتی آہستہ آہستہ جل رہی تھی۔ غلام ہمارے پاس دو چار فالتو موم بتیاں اور ایک ماچس بھی چھوڑ گیا تھا۔ ہم نے موم بتی جلتے رہنے دی اور سو گئے۔ جب میری آنکھ کھلی تو موم بتی بجھ چکی تھی۔ تہہ خانے میں قبر ایسا گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ میں نے آنکھیں جھپکاتے ہوئے ایک طرف چھت پر غور سے دیکھا۔ جس جگہ چھت میں تازہ ہوا کے لئے سوراخ رکھا ہوا تھا وہاں سے دن کی پھیکی روشنی آ رہی تھی۔ میں نے جھک کر موم بتی کو دیکھا۔ وہ پگھل کر بجھ چکی تھی۔ گل خان گہری نیند سو رہا تھا۔ میں نے اسے سویا رہنے دیا اور اٹھ کر قبر کے گڑھے میں آ گیا۔ دونوں ہاتھوں سے قبر کے اوپر رکھی ہوئی پتھر کی سل کو ایک طرف ہٹایا۔ اندر دن کی چکا چوند کر دینے والی روشنی آ گئی۔ میں نے سر باہر نکال کر دیکھا۔ ویران قبرستان میں ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ درختوں پر ایک چڑیا بول رہی تھی۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ میں قبر سے باہر نکل آیا۔ قبروں میں سے گزرتا ہوا پھلاہی کے درختوں میں آ گیا۔ غلام رسول نے بتایا تھا کہ یہاں نشیب میں پانی کا ایک چھوٹا سا نالہ بہتا ہے۔ میں نے نالے میں اتر کر منہ ہاتھ دھویا اور واپس قبر کے تہہ خانے میں آ گیا۔ گل خان جاگ گیا تھا۔ میں نے اسے کہا۔

"اگر تم باہر جا سکتے ہو تو باہر جا کر دائیں جانب پھلاہی کے درختوں میں ایک نالہ بہہ رہا ہے۔ وہاں منہ ہاتھ دھو آؤ"

وہ اٹھ کر تھوڑا لنگڑاتا ہوا قبر سے باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد واپس آ گیا۔ ہم نے قبر کے اوپر پتھر کی سل دوبارہ رکھ دی تھی۔ وہاں اتنی گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی کہ ہمیں ایک دوسرے کے سانس لینے کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ گل خان کہنے لگا۔

"یہاں ہم زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکیں گے۔ پولیس اور انٹیلی جینس کے آدمی یہاں آ سکتے ہیں"

میں نے کہا۔

"یہ تو غلام رسول ہی آ کر بتائے گا کہ شہر کی کیا صورت حال ہے اور پولیس ہمیں کہاں کہاں تلاش کر رہی ہے۔"

کچھ دیر گزری ہو گی کہ ہمیں قبر کا پتھر ہٹانے کی آواز آئی۔ میں نے ریوالور سنبھال لیا اور تہہ خانے میں سے نکل کر قبر کے گڑھے میں آ کر اوپر دیکھنے لگا۔ قبر کی سل ایک طرف ہٹ گئی۔ میں نے ریوالور کا رخ اوپر کر دیا۔ میں نے غلام رسول کو دیکھا۔ اس نے بڑا سا تھیلا نیچے پھینکا اور پھر خود بھی نیچے اتر آیا۔ ہم نے مل کر قبر کو سل سے ڈھک دیا۔ تہہ خانے کے دالان میں آ کر غلام رسول نے تھیلے میں سے ہمارے لئے چار روٹیاں نکال کر ہمیں دیں۔ ان کے اوپر اچار رکھا ہوا تھا۔ پھر سپرٹ کی چھوٹی بوتل نکال کر گل خان کے زخم کو صاف کر کے اس کے اوپر پٹی باندھ دی ہم اچار کے ساتھ روٹی کھانے لگے۔

میں نے غلام رسول سے شہر کی صورت حال پوچھی۔ وہ کہنے لگا۔

"گل خان کی تلاش میں ساری انٹیلی جینس ایجنسیوں کے آدمی کتوں کی طرح بو سونگھتے پھر رہے ہیں انٹیروگیشن سنٹر کے سارے علاقے کو جموں پولیس اور ملٹری پولیس نے اپنے محاصرے میں لے لیا ہے۔ جموں کے مسلمان محلوں میں پولیس گھر گھر تلاشی لے رہی ہے۔ اس انٹیروگیشن سنٹر سے کسی حریت پرست کا فرار کا یہ پہلا واقعہ ہے جس میں سنٹر کے سنتری بھی قتل ہو گئے ہیں۔"

گل خان کہنے لگا۔

"تمہارے خیال میں ہمیں کتنے دن یہاں چھپے رہنا ہو گا۔ مجھے خطرہ ہے کہ میرا زخم مزید خراب نہ ہو جائے اور ٹانگ کٹوانی پڑے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میں کوئی بھی خطرہ مول لے کر یہاں سے نکل جانے کو ترجیح دوں گا۔"

غلام رسول کچھ سوچنے کے بعد بولا۔

"اگر حالات کو دیکھا جائے تو تم لوگوں کا ابھی یہاں سے نکلنا ٹھیک نہیں ہو گا۔ لیکن تمہارا زخم واقعی کافی بگڑ چکا ہے یہ ہو سکتا ہے کہ میں تمہیں کسی طرح خطرہ مول لے کر یہاں سے نکال دوں"

غلام رسول نے میری طرف دیکھا۔

"ویسے بھی مجھے تم لوگوں کو ایک ایک کر کے یہاں سے نکالنا ہو گا۔ تمہارا کیا خیال

ہے؟"

میں نے کہا۔

"میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ گل خان کو یہاں سے نکال کر کسی ایسی جگہ لے جایا جائے جہاں اس کے زخم کا باقاعدہ علاج ہو سکے۔"

غلام رسول اٹھتے ہوئے بولا۔

"میں سورج غروب ہونے کے بعد آؤں گا۔ ویسے گل خان! میرے بھائی تم تیار رہنا۔ ایک جگہ میرے ذہن میں آتی ہے۔ وہاں ہمارا ایک مجاہد ڈاکٹر تمہارا علاج کر سکے گا تمہیں ویسے بھی طبی امداد کی ضرورت ہے۔"

گل خان کی آنکھ بھی ایک طرف سے سوجی ہوئی تھی۔ جسم پر بھی تشدد کے اثرات تھے۔ غلام رسول چلا گیا۔ ہم دونوں نے سارا دن قبر کے تہہ خانے میں گزار دیا۔ صرف ایک دفعہ باری باری کر کے قبر سے باہر نکلے اور تھوڑی دیر کے بعد پھر واپس قبر میں اتر گئے۔ ہم قبر کے تہہ خانے میں گھاس پر لیٹے رہے۔ ہماری آنکھیں چھت والے سوراخ پر لگی رہیں۔ جب اس سوراخ میں آتی دن کی روشنی ماند پڑنے لگی تو میں نے گل خان سے کہا۔

"گل خان! شام ہو رہی ہے"

کچھ وقفے کے بعد سوراخ کی روشنی غائب ہو گئی۔ باہر سورج غروب ہو گیا تھا۔ ہم غلام رسول کا انتظار کرنے لگے۔ میری گھڑی نے جب رات کے آٹھ بجائے تو قبر کے پتھر ہٹانے کی آواز آئی۔ میں نے کہا۔

"غلام رسول آ گیا ہے"

پھر بھی میں نے ریوالور ہاتھ میں لے لیا اور قبر کے گڑھے میں آ گیا۔ گل خان نے جلتی ہوئی موم بتی کے آگے ہاتھ اس طرح کر لیا کہ آدھے تہہ خانے میں اندھیرا ہو گیا۔ مگر یہ غلام رسول ہی تھا۔ وہ آتے ہی بولا۔

"میں نے گل خان کا بندوبست کر لیا ہے۔"

"کوئی محفوظ جگہ ہے ناں؟"

میرے اس سوال پر غلام رسول بولا۔

"بالکل محفوظ جگہ ہے۔ یہاں سے پندرہ بیس میل دور ہے۔ وہاں ہمارے ایک مجاہد کی گاؤں میں چھوٹی سی ڈسپنسری ہے وہ گل خان کو اپنے گھر میں چھپا کر اس کا علاج کرے گا۔ گل خان! میرے ساتھ آ جاؤ۔"

گل خان گرم جوشی کے ساتھ مجھ سے گلے ملا۔ کہنے لگا۔

"زندگی رہی تو جہاد کشمیر کے کسی محاذ پر پھر ملیں گے۔ اگر شہید ہو گئے تو اگلے جہاں میں ملاقات ہو گی۔"

غلام رسول نے گل خان کو سہارا دے کر قبر سے باہر نکال دیا۔ وہ میری طرف متوجہ ہو کر کہنے لگا۔

"ابھی کچھ وقت یہی رہنا ہو گا۔ تھیلے میں تمہارے لئے روٹیاں لے کر آیا ہوں۔ دن کے وقت یہاں سے باہر مت نکلنا۔"

گل خان کو لے کر غلام رسول چلا گیا۔ قبر بند ہو گئی۔ میں قبر کے تہہ خانے میں آ کر بیٹھ گیا۔ موم بتی روشن تھی۔ میں نے تھیلا کھولا۔ اس میں تین روٹیاں تھیں۔ میں نے ایک روٹی کا نوالہ کھایا۔ روٹیاں میٹھی تھیں۔ میں نے ایک روٹی کھا کر پانی پیا اور خدا کا شکر ادا کر کے خشک گھاس کے بستر پر لیٹ گیا۔ اچانک مجھے لوبان کی بو محسوس ہوئی۔ میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ چندریکا کی بدروح آ گئی تھی۔ یہ اس کی بو تھی۔ موم بتی کی روشنی ہو رہی تھی۔ میں نے تہہ خانے کے دالان میں چاروں طرف دیکھا۔ چندریکا کی بدروح نظر نہ آئی۔ میں نے اسے آواز دی۔

"چندریکا! یاد رکھو۔ اگر تم میری دشمن بن چکی ہو تو میں بھی تمہیں اپنا دشمن سمجھتا ہوں۔ تم بتوں کی پوجا کرنے والی کافر بدروح ہو۔ میں ایک خدا اور رسول ﷺ کو ماننے والا مسلمان ہوں۔ تم انڈیا کے اپنے سارے بتوں کو اپنے سارے دیوتاؤں کو لے کر آ جاؤ۔ تم میرا کچھ نہ بگاڑ سکو گی مجھے اپنے اللہ پر بھروسہ ہے۔ میرے اللہ کی طاقت کا تم

تصور بھی نہیں کر سکتی۔ میں تمہیں آخری بار کہہ رہا ہوں کہ میرا پیچھا چھوڑ دو۔ نہیں تو تمہیں جہنم میں بھی ٹھکانہ نہیں ملے گا۔"

لوبان کی بو تیز ہو گئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ چندریکا کی بدروح میرے بہت قریب تھی۔ حیرانی کی بات یہ تھی کہ اب اس نے مجھ سے بات کرنا بند کر دیا تھا۔ اچانک مجھے چنبیلی کی خوشبو محسوس ہونے لگی۔ یہ میری شہید بہن کی روح کی خوشبو تھی۔ میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"میری پیاری بہن کلثوم! کیا یہ تم ہو؟"

شہید کی روح نے بھی مجھے کوئی جواب نہ دیا۔ مگر اب ایسا ہوا کہ لوبان کی بو ایک دم غائب ہو گئی اور فضا چنبیلی کی پاکیزہ خوشبو سے لبریز ہو گئی۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے میں نے اپنی شہید بہن کی روح کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"پیاری بہن! مجھ سے بات کرو۔ میں تمہاری آواز سننے کو ترس گیا ہوں۔ کیا شہیدوں کی روحیں بات نہیں کرتیں؟"

چنبیلی کی پاکیزہ خوشبو جیسے میرے بالکل قریب آ گئی۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ یہ خوشبو دور ہونے لگی۔ میں اپنی شہید بہن کی روح کو پکارتا ہی رہ گیا اور وہ اپنی فردوس بریں کی خوشبو لے کر چلی گئی۔

اس کے بعد میں دیر تک اپنی بہن کو یاد کر کے آنسو بہاتا رہا۔ رات کو میں بالکل نہ سو سکا۔ ساری رات بیٹھا خدا کے حضور اپنی بخشش اور جہاد کشمیر میں مسلمانوں کی کامیابی کی دعائیں مانگتا رہا۔ اس کے بعد چھت والے سوراخ میں سے ہلکی ہلکی روشنی اندر آنے لگی۔ باہر دن کا اجالا پھیلنے لگا تھا۔ صبح ہو گئی تھی۔ میں تیمم کر کے وہیں نماز پڑھی۔ مجھے باہر جانا تھا۔ اٹھا اور قبر کے پتھر کے سل کو سرکا کر قبر سے باہر آ گیا۔ پہلے میں نے گردن ذرا سی باہر نکال کر قبرستان کا جائزہ لے لیا تھا۔ وہاں کوئی ذی روح نظر نہیں آیا تھا۔ میں قبروں کے درمیان سے گزر کر بڑی احتیاط سے نشیبی نالے پر آ گیا۔ یہاں بیٹھ کر منہ ہاتھ دھویا۔ پانی پیا اور اٹھ کر واپس قبر کے تہہ خانے کی طرف چل پڑا۔ میں پھلاہی کے درختوں سے

نکل کر چند قدم چلا ہوں گا کہ میں نے ایک آدمی کو ایک قبر کے پاس کھڑے دیکھا۔ اس کا لباس سیاہ تھا۔ گھٹنوں تک سیاہ کوٹ پہنا ہوا تھا۔ وہ حلیے سے کوئی پادری لگتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پھولوں کا گلدستہ تھا۔ میں اسے دیکھ کر وہیں ٹھٹک گیا۔ سوچا دوسری طرف سے ہو کر نکل جاؤں۔ مگر وہ ہماری کمیں گاہ والی قبر سے چند قدموں کے فاصلے پر تھا اور مجھے قبر میں داخل ہوتے دیکھ سکتا تھا۔ میں وہیں سرکنڈوں کے پیچھے بیٹھ گیا۔ پادری صاحب نے قبر پر گلدستہ رکھا اور ہاتھ پھیلا کر دعا مانگنے لگے۔ میں خاموش بیٹھا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دعا مانگنے کے بعد اس نے جھک کر قبر کی ٹیڑھی صلیب کو چوما۔ اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا اور واپس مڑا۔ وہ اسی طرف آ رہا تھا جہاں میں سرکنڈوں میں چھپا بیٹھا تھا۔ صورت حال ایسی ہو گئی کہ اگر میں سرکنڈوں میں سے نکل کر دوسری طرف جاتا تو وہ پادری مجھے دیکھ سکتا تھا۔ مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ مجھے پھلاہی کے درختوں میں سے آتا دیکھ چکا تھا۔

میں آپ کو آگے چل کر بتاؤں گا کہ یہ آدمی کون تھا اور میرے ساتھ کیا کچھ ہونے والا تھا۔ پادری سیدھا میری طرف چلا آ رہا تھا۔ میں نے یونہی سرکنڈوں کو توڑ توڑ کر جمع کرنا شروع کر دیا۔ پادری منہ ہی منہ میں بائبل کی کوئی مناجات پڑھتا میرے قریب سے گزر گیا۔ اس نے ایسے ظاہر کیا جیسے اس نے مجھے نہیں دیکھا۔ جب وہ میرے قریب سے گزر کر قبرستان سے باہر چلا گیا تو میں آہستہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ مگر میں ابھی اپنی خفیہ کمیں گاہ کی طرف نہیں جانا چاہتا تھا۔ میں وہاں سے ایک بار پھر پھلاہی کے درختوں کی طرف چل پڑا۔ درختوں میں پہنچ کر میں ایک درخت کی اوٹ میں ہو کر بیٹھ گیا پادری صاحب دور چلے گئے تھے۔ پھر وہ ٹیلے کے پیچھے جو سڑک جاتی تھی اس طرف مڑ گئے اور میری آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور اپنی قبر میرا مطلب ہے اپنی کمیں گاہ والی قبر کی طرف بہت محتاط ہو کر چلنے لگا۔ مجھ سے ایک بے وقوفی یہ بھی ہوئی تھی کہ جب میں قبر سے باہر گیا تھا تو سب سائیلینسر والا ریوالور اٹھا کر جیب میں رکھ لیا۔ غلام رسول کا کچھ پتہ نہیں تھا کہ وہ کب آتا ہے۔ وہ گل خان کو محفوظ جگہ چھوڑنے گیا ہوا تھا۔ دن کے

وقت ویسے بھی وہ نہیں آتا تھا۔ میں نے سوچ لیا کہ اس کے آگے پادری صاحب کا ذکر نہیں کروں گا۔ جب اسے پتہ چلے گا کہ میں قبر سے باہر نکلا تھا اور ایک پادری کو قبر پر مناجات پڑھتے اور پھول رکھتے دیکھا تھا وہ سخت ناراض ہو گا کہ میں دن کے وقت قبر سے باہر کیوں نکلا تھا۔ کیونکہ اس نے مجھے تاکید کر رکھی تھی کہ قبر سے رات کے بعد نکلنا ہو تو منہ اندھیرے نکلنا۔ سورج طلوع ہونے کے بعد بالکل باہر نہ آنا۔

میں قبر کے تہ خانے میں بیٹھا تھا۔ مگر جب سے میں نے اس پادری کو دیکھا تھا مجھے ایک بے چینی سی لگ گئی تھی۔ ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اب میں تہ خانے میں محفوظ نہیں ہوں۔ وہ پادری ضرور سی آئی ڈی کا آدمی ہو گا۔ اس نے مجھے دیکھ لیا ہو گا اور پولیس قبر پر چھاپہ مارنے کے لئے آ رہی ہو گی۔ میں نے اپنے آپ کو بہت سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ پادری واقعی ایک نیک دل پادری تھا اور اپنے کسی عزیز کی قبر پر مناجات کے لئے آیا تھا۔ اس نے مجھے دیکھ بھی لیا ہو گا تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اسے کیا معلوم کہ میں کون ہوں۔ میں تو سرکنڈے توڑ رہا تھا۔ وہ یہی سمجھا ہو گا کہ میں کوئی مزدور ٹائپ آدمی ہوں مگر میرا دل مجھے قبر کے اندر ٹھہرنے نہیں دے رہا تھا۔ میری چھٹی حس بے دار ہو چکی تھی اور وہ مجھے قبر سے باہر نکلنے پر مجبور کر رہی تھی۔ آخر میں نے ریوالور نکال کر چیک کیا۔ اسے دوبارہ پتلون کی جیب میں ڈالا اور تہ خانے سے نکل کر قبر کے گڑھے میں آگیا۔ میں نے بڑی احتیاط سے پتھر کی سل کو ایک طرف اس طرح کھسکایا کہ آواز پیدا نہ ہو۔ پھر میں نے آہستہ سے سر باہر نکال کر دیکھا۔ قبرستان بالکل خالی تھا۔ میں جلدی سے باہر آگیا۔ پتھر کی سل قبر پر دوبارہ رکھی اور جس طرف پہاڑی نالہ تھا اس طرف جانے کی بجائے قبرستان کی دوسری طرف جدھر خدا جانے شیشم کے یا نیم کے اونچے اونچے درخت تھے اس طرف چلا گیا۔ میں قبرستان سے باہر بھی نہیں جانا چاہتا تھا۔ آگے جموں شہر تھا جہاں میری تلاش میں پولیس نے جگہ جگہ ناکہ بندی کر رکھی تھی۔

اصل میں میں تہ خانے سے باہر آنا چاہتا تھا۔ تہ خانے میں مجھے سخت خطرہ محسوس ہونے لگا تھا۔ وہاں اگر چھاپہ پڑ جاتا تو میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ ریوالور کی گولیوں سے

پولیس یا ملٹری پولیس کی فائرنگ کا کب تک مقابلہ کر سکتا تھا۔ تہ خانے سے باہر آ کر میں نے سکون کا سانس ضرور لیا تھا۔ میں درختوں کے نیچے ایک جھاڑی کے پاس بیٹھ گیا۔ میرا پروگرام یہ تھا کہ اگر ممکن ہو تو میں سارا دن باہر اسی جگہ بیٹھ کر گزار دوں اور جب رات ہو جائے اور غلام رسول مجاہد کے آنے کا وقت ہو جائے تو تہ خانے میں چلا جاؤں۔ سورج آسمان پر مشرقی افق سے اوپر آگیا ہوا تھا۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ صبح کے سات بج رہے تھے۔ آس پاس نگاہ ڈالی۔ وہاں کوئی انسان نظر نہ آیا۔ کچھ فاصلے پر بھورے رنگ کی پہاڑی کے دامن میں ایک کسان ہل چلاتا نظر آیا۔ میں چپ چاپ بیٹھا رہا۔

آدھا گھنٹہ گزر گیا۔ جب پونے آٹھ کا وقت ہوا تو میں نے سوچا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہاں بیٹھا رہا تو کسی راہ گیر کی نگاہوں میں آ سکتا ہوں۔ بہتر یہی ہے کہ تہ خانے میں ہی چلا جاؤں۔ کم از کم وہاں مجھے کوئی دیکھے گا تو نہیں۔ یہ سوچ کر میں اٹھنے ہی والا تھا کہ مجھے گاڑی کے انجن کی آواز سنائی دی۔ میں نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ ایک کی بجائے دو گاڑیاں آ رہی تھیں۔ میں نے ان کا رنگ اور شکل پہچان لی۔ دونوں گاڑیاں پولیس کی تھیں۔ اتنا وقت نہیں تھا کہ میں اٹھ کر بھاگ سکتا۔ آگے آگے پولیس کی جیپ تھی۔ پیچھے موٹر کار تھی۔ دونوں گاڑیاں جہاں میں چھپ کر بیٹھا تھا وہاں سے سولہ سترہ قدموں کے فاصلے پر قبرستان کے شکستہ دروازے کے آگے آ کر رک گئیں۔ گاڑیوں کے رکتے ہی ان میں سے سات آٹھ سپاہی کود کر باہر نکلے۔ دو وہیں رائفلیں لے کر کھڑے ہو گئے اور باقی قبروں کو الانگتے پھلانگتے اس طرف دوڑے جس طرف تہ خانے والی قبر تھی۔ وہاں پہنچنے سے پہلے چار سپاہی پوزیشنیں سنبھال کر تین اطراف کو کھڑے ہو گئے۔ ایک ان میں ہیڈ کانسٹیبل یا تھانیدار تھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا وہ دو سپاہیوں کے ساتھ پتھر کی سل والی قبر کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے سپاہیوں کو قبر کی طرف اشارہ کیا۔ سپاہیوں نے فوراً پتھر کی سل اٹھا کر ایک طرف پھینک دی اور رائفلیں تانے قبر کے گڑھے میں کود گئے۔ میں نے ان سپاہیوں کی طرف دیکھا جو گاڑیوں کے پاس الرٹ ہو کر کھڑے تھے۔ میرے پاس بہت تھوڑا وقت تھا۔ زیادہ زیادہ

دو منٹ ہوں گے۔ ان دو ایک منٹ کے اندر قبر میں اترے ہوئے سپاہیوں کو معلوم ہو جاتا تھا کہ قبر کے اندر کوئی نہیں لیکن وہاں میری موجودگی کے تمام آثار موجود ہیں روٹیوں والا رومال' چائے کی تھرمس' پانی کا مٹکا اور جلی ہوئی موم بتیوں کی موم اور تین چار تازہ موم بتیاں دونوں سپاہی اس طرح کھڑے تھے کہ ان کا رخ قبرستان کی طرف تھا۔ یہ بات ایک طے شدہ امر تھا کہ ایک منٹ کے اندر خالی قبر کی طرف سے کانسٹیبل اور سپاہیوں نے سارے قبرستان کو گھیر کر علاقے کی تلاشی لینی شروع کروینی تھی۔ اور مجھے پکڑ لینا تھا۔

میرا دماغ تیزی سے سوچنے لگا۔ مگر شاید وہاں اب سوچنے کا وقت بھی نہیں رہا تھا۔ سائی لینسر والا پستول میرے ہاتھ میں تھا۔ ایک بات ضرور تھی کہ اتنی پریشان کر دینے والی صورت حال میں بھی میں نے اپنے حواس کو پوری طرح اپنے کنٹرول میں رکھا ہوا تھا۔ اس میں میری کمانڈو ٹریننگ کے علاوہ میرے مزاج کا بھی کافی دخل تھا۔ میں نے صرف یہ جائزہ لیا کہ مجھے کس جانب سے حملہ کرنا چاہیے۔ دوسرے لمحے میں جھاڑیوں کے پیچھے سانپ کی طرح رینگتا ہوا پولیس کی گاڑی کے آگے کھڑے ڈوگرہ سپاہیوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جھاڑیاں ختم ہو گئیں۔ آگے کچا راستہ تھا۔ سامنے چند قدموں پر پہلی گاڑی اور آگے جیپ تھی۔ ایک ڈوگرہ سپاہی کی میری جانب پشت تھی۔ اس نے رائفل ہاتھ میں لٹکائی ہوئی تھی۔ دوسرا سپاہی بھی رائفل اسی طرح پکڑے قبرستان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

ٹھیک اس وقت قبرستان کی طرف سے کانسٹیبل کی یا کسی سپاہی کی آواز آئی۔

"وہ۔ یہیں کہیں چھپا ہوا ہو گا۔ ناکہ بندی کرو"

سپاہی قبرستان میں ادھر ادھر دوڑے۔ دونوں سپاہی جو گاڑیوں کے پاس کھڑے تھے ادھر تکنے لگے۔ بس یہی لمحہ میرے لئے زندگی اور موت کے درمیان کا لمحہ تھا۔ میری زندگی اور موت کے درمیان اسی ایک لمحے کا پل صراط تھا۔ میں زمین پر سے اٹھا اور نشانہ بازی کی اپنی تمام تر مہارت اور تجربے سے کام لیتے ہوئے ریوالور کا رخ سپاہیوں کی طرف کیا اور یکے بعد دیگرے دو فائر کر دیئے۔ ریوالور میں سے دو گولیاں فائر ہوئیں اور مجھے دونوں سپاہی اپنی جگہ سے لڑکھڑا کر گرتے نظر آئے۔ تیسرا فائر میں نے اگلی جیپ کی طرف

دوڑتے ہوئے پچھلی موٹر کے ٹائر پر کیا۔ مگر نشانہ چوک گیا۔ میں نے اس لئے گاڑی کے ٹائر پر فائر کیا تھا کہ پولیس میرا تعاقب نہ کر سکے۔ قبرستان کی خاموش فضا میں سائی لینسر والے دو فائروں کی یکے بعد دیگرے کی ٹھک ٹھک کی آواز اور گرتے سپاہیوں میں سے ایک سپاہی کی چیخ نے قبرستان والے سپاہیوں کو میری طرف متوجہ کر دیا۔ اس وقت میں جیپ میں بیٹھ چکا تھا۔ اور سیلف لگا کر جیپ کو سٹارٹ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

کانسٹیبل یا تھانیدار کے علاوہ باقی سپاہیوں نے بھی مجھے دیکھ لیا۔ دن کی روشنی میں ایک سویلین کپڑوں والے آدمی کو پولیس کی جیپ سٹارٹ کرتے اور دو سپاہیوں کو زمین پر تڑپتے دیکھ کر وہ سمجھ گئے کہ میں ہی مفرور گل خان ہوں۔ انہوں نے وہیں سے فائرنگ شروع کر دی۔ اس وقت جیپ سٹارٹ ہو چکی تھی اور میں نے گاڑی کو فسٹ گیئر میں ڈال کر زور سے فل سپیڈ پر جیپ کو سڑک پر ایک طرف گھما دیا تھا۔ گولیاں جیپ کی باڈی سے ٹکرائیں۔ میں نے سر نیچے کر لیا۔ جیپ تیز رفتاری سے کچے راستے پر دوڑنے لگی۔

پیچھے پولیس والوں کی شور کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں نے جیپ کے سائیڈ پر لگے آئینے میں پیچھے دیکھا۔ پولیس کی گاڑی میرے پیچھے لگ گئی تھی۔ مجھ پر مسلسل فائرنگ ہو رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ پولیس کے پاس گولیوں کی کمی نہیں ہے۔ پولیس ایسی صورت میں مجھ پر گولیاں چلانے سے رک سکتی تھی کہ میں اپنی جیپ کو آبادی والے علاقے میں لے چلوں۔ دن کی روشنی میں سارا علاقہ صاف نظر آ رہا تھا۔ غلام رسول رات کے وقت ہمیں گاڑی میں بٹھا کر ویران علاقوں سے قبرستان میں لایا تھا۔ مجھے بائیں جانب پکی سڑک پر گاڑیاں اور دو تانگے چلتے نظر آئے۔ میں کچی سڑک پر سے جیپ کو نکال کر پکی سڑک پر لے آیا۔ ٹریفک والی سڑک پر آتے ہی پولیس نے مجھ پر اندھا دھند گولیاں چلانی بند کر دیں۔ اب وہ پیچھے سے میری جیپ کے ٹائروں کو نشانہ بنانے کی کوشش کر رہے تھے۔

ٹریفک والی سڑک پر آنے سے مجھے ایک فائدہ تو ضرور ہو گیا تھا کہ میری جان محفوظ ہو گئی تھی کیونکہ پولیس مجھ پر بالکل سیدھ میں گولی فائر نہیں کرتی تھی اس طرح مجھ سے آگے کسی تانگے میں بیٹھی ہوئی سواری یا سکوٹر سوار یا کسی دکان پر کھڑے آدمی کو نشانہ چوک

جانے سے گولی لگ سکتی تھی۔ لیکن سب سے بڑا خطرہ یہ پیدا ہوتا جا رہا تھا کہ میں جموں شہر کی آبادی میں داخل ہو گیا تھا اور یہاں چاروں طرف سے مجھے بڑی آسانی سے قابو میں کیا جا سکتا تھا۔

اور ایسا ہی ہوا۔ میں ایک چوک میں آیا تو ٹریفک پولیس کے سپاہی نے ہاتھ دے کر میری طرف والی ٹریفک روک رکھی تھی مگر میں پوری رفتار سے چوک میں سے گزر گیا اور دو گاڑیوں سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ سارجنٹ سیٹیاں بجانے لگا۔ وہاں سے بھی ٹریفک کا ایک سپاہی اپنے سکوٹر پر میرے پیچھے لگ گیا۔ جس سڑک پر میں جا رہا تھا وہ مجھے جس طرف لے جا رہی تھی میں اسی طرف جا رہا تھا۔ کیونکہ دائیں بائیں اور کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ دونوں جانب مکان اور دکانیں تھیں۔ سڑک پر ہڑبونگ سا مچ گیا تھا۔ ٹریفک درہم برہم ہو رہی تھی۔ دوسرا چوک آیا تو وہاں بھی میں نے ٹریفک کا اشارہ کاٹ دیا۔ اب میرے پیچھے پولیس کی ایک اور گاڑی لگ گئی۔ میں گاڑی زیادہ تیز بھی نہیں چلا سکتا تھا کیونکہ لوگ آگے آ رہے تھے اور آگے آتے ہی ادھر ادھر بھاگنے لگتے تھے۔

میں واقعی مصیبت میں پھنس گیا تھا۔ اپنے حواس کو میں نے منتشر نہیں ہونے دیا تھا مگر پریشان ضرور ہو رہا تھا کہ پولیس سے بچ کر کس طرف کو نکلوں؟ میں پولیس کے ہتھے نہیں چڑھنا چاہتا تھا۔ میری بدقسمتی کو آگے جا کر بازار تنگ ہو گیا۔ پھر اچانک ایک ٹرک بھی سامنے آ گیا۔ میں نے پوری طاقت سے اسٹیرنگ کو بائیں طرف گھمایا اور جیپ الٹتے الٹتے بچی مگر دوسری بار گھمانے سے وہ ٹرک کے پیچھے سے ہو کر آگے نکل آئی۔ لیکن مزید بدقسمتی وہاں میرا انتظار کر رہی تھی۔ آگے دو بیل سڑک کے عین درمیان میں کھڑے جگالی کر رہے تھے۔ کسی طرف سے بھی جیپ کے گزرنے کا راستہ نہیں تھا۔ پیچھے سے مجھے پولیس کی گاڑی کے زور سے بریک لگنے کی چیخ اور سپاہیوں کے شور کرنے کی آوازیں سنائی دیں۔ میں جیپ کو بریک لگا چکا تھا۔ میں نے جیپ میں سے چھلانگ لگائی۔ سامنے ایک گلی تھی۔ میں اس گلی کی طرف دوڑ پڑا۔ گلی تنگ تھی۔ پیچھے سپاہیوں کے دوڑتے قدموں کی آوازیں آئیں۔ میں تیزی سے بھاگنے لگا۔ گلی ایک طرف مڑ گئی۔ میں اس طرف مڑا